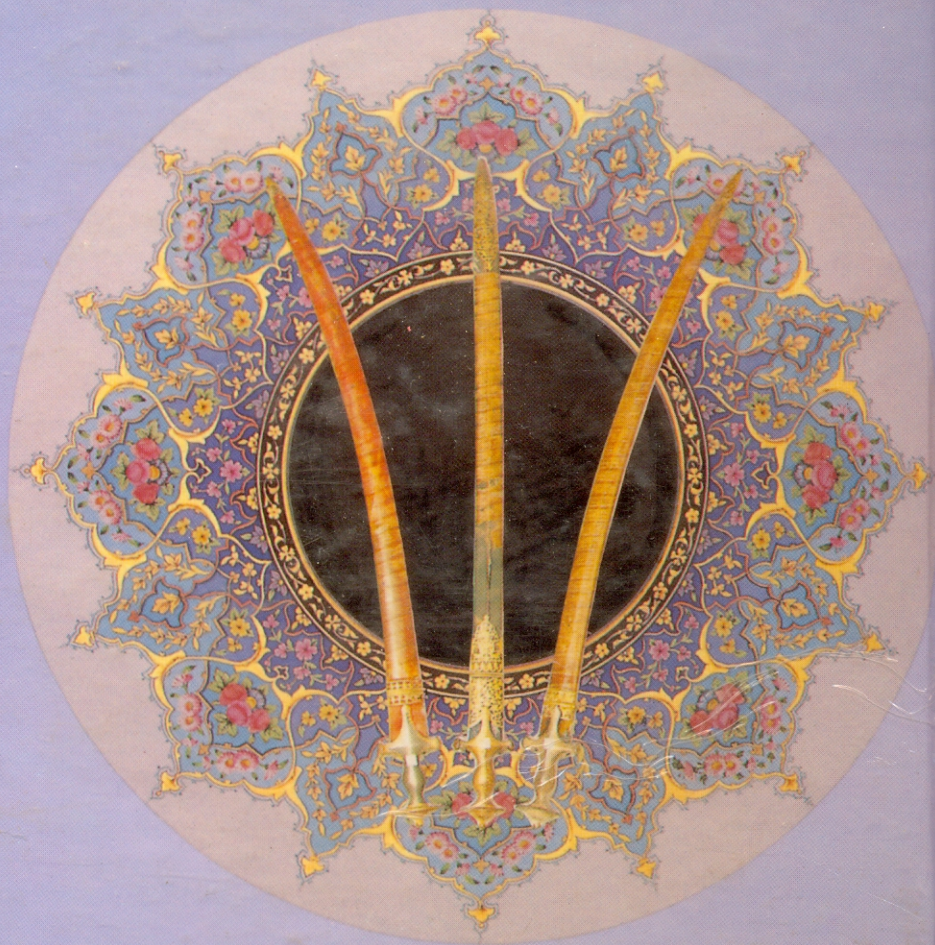


تین عظیم فاتح

ہیمنی بال۔ ظہیر الدین بابر۔ سلیمان عالیشان

ہیر لڈیم



ایر
گفت

میرالدیم

This is an Urdu Translation of
Tiger by Harold Lamb

فہرست

5		مقدمہ
13	وادی کی روداد	باب اول
46	سمرقند سے اخراج	باب دوم
94	کابل کی بادشاہی	باب سوم
122	شراب دل	باب چہارم
152	بابر کی جدال اپنی رعایا سے	باب پنجم
169	ہندوستان کا راستہ	باب ششم
196	پانی پت اور کنواہہ	باب ہفتم
243	مغل اعظم کی سلطنت	باب ہشتم
277		وقائع مابعد
283		اعتراف اور شکریہ
285		حوالہ جات

مقدمہ

وسط ایشیا کی ایک گنہام سی پہاڑی وادی میں باہر ۱۳۸۳ میلادی میں پیدا ہوا (۱) ان پہاڑیوں کے سوا، حکومت و اقتدار کی صرف دو طرفہ یاد اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ یوں کہ ماں کی طرف سے تو وہ چنگیز خان کی اولاد میں تھا، جو الوس مغول کا سردار اور کچھ عرصے تک دنیائے معلومہ کے بڑے حصے کا فرمان روا رہا۔ باپ کی طرف سے اس کا اور بھی قریبی براہ راست نسب تیمور لنگ (لفظی معنی لنگڑا فولاد) تک پہنچتا تھا، جسے یورپ والے تاتاری فاتح ”تمبرلین“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس طرح باہر کے خون میں منگول نسل کی موقع شناس بربریت کا چھینٹا اور اس سے بھی قوی تر ترک قوم کی تاتاری شامل تھی۔ پھر یہ دو گونہ ترک و مغل ترکہ اور آگے جا کے ایک بعید طرز زندگی یعنی خانہ بدوشی سے متواتر ہوا تھا۔

تا محدود زمانے سے شمال وسطی ایشیا کے بدوی قبائل اپنے مواشی کے گلوں پر زندگی بسر کرتے تھے جس میں ان کی مل کر شکار کھیلنے کی مہارت مدد ہوتی تھی۔ ندی نالوں کی پتلی گزر گاہیں ان کے راستے تھے۔ صحرا کی اچھی چراگاہیں ان کی مقبوضہ اراضی تھیں۔ بن والے پہاڑ ان کے امن تھے۔ انہیں پناہ گاہوں اور بہتر مرغزاروں کی تلاش میں وہ اپنی بھیڑ بکری، گھوڑے، کمل کے لپٹ جانے والے ڈیرے، غرض تمام املاک الیت کے ساتھ برف پوش پہاڑوں کے پار ہجرت کر آتے تھے۔ کبھی کبھی یہ متحرک قبیلے کسی صاحب عزم خدا داد سردار کے ماتحت ایک بڑا جنگی جتھا بن جاتے تھے۔ جس میں تمام تندرست مرد صحرا کے جان دار ٹھوڈوں پر سوار ہوتے اور ان کا خاص ہتھیار سینہ بند رہتا تھا۔ یہ لشکر اپنے گنہام گوشوں سے یا تو سخت قحط پڑ جانے کے باعث یا کسی زیادہ طاقت ور جتھے کے دباؤ سے نکلتے اور یا دور دست متمدن شہروں کی دولت لوٹنے کی طبع انہیں باہر لاتی تھی۔ ان غارت گروں کا یہ خروج قانون قدرت کی سی باقاعدگی کے ساتھ عمل میں آتا۔ مغربی یورپ کے بعید اقطاع میں موج در موج ہن، اوار، بلغار ترک و مغول کی ان نغیانوں کو قراہی اور یا

رکے ہوئے یا جوج ماجوج کا رسیاں تزا کے نکلنا سمجھ کر لوگ صبر کر لیتے تھے۔

بابر کے معاملے میں اسلاف قدیم کا یہ طریق زندگی محض بھولی ببری یاد نہیں تھا۔ ممکن ہے خود اس کی سرشت میں خانہ بدوشی کے دبے ہوئے اثرات موجود ہوں لیکن زندہ خانہ بدوش تو اس کے حق میں عمر بھر بلائے جان بنے رہے۔ کیوں کہ وسط ایشیا کے یہ نووارد خاص صفات کے مالک ہوتے تھے۔ بھیانک سرزمینوں میں موسم کے شدائد کا عظیم مقابلہ کرتے رہنے سے ان میں بڑی جفاکشی اور خطرات کے وقت فوری تدبیر کر گزرنے کی قابلیت آجاتی تھی۔ کمزور بال بچوں کی حفاظت، گلوں کے ٹھکانے اور خود اپنے ڈیرے ڈالنے کی ضرورتیں شروع سے ان کی تنظیم کا بڑا سلیقہ پیدا کر دیتی تھیں۔ جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے ان وسط ایشیا کے جفاکش تیر انداز سواروں کے مقابلے میں آرام سے رہنے والے شہری عموماً نہیں ٹھہر سکتے تھے لیکن ایک حقیقت جس کی طرف اکثر توجہ نہیں کی جاتی یہ تھی کہ ان بدویوں کی فوقیت کا سبب ان کے ذہن کی تیزی اور موقع کے مطابق بدل جانا بھی ہوتی تھی۔ رومہ کے قدیم ترین مسیحی دعاۃ میں سے ایک کا مشاہدہ یہ تھا کہ جنگ میں ”تاتاری“ اس درجہ وحشی اور خونخوار نہ تھے جتنا مسیحی یورپ کے عسکری۔ بابر سے ایک نسل سے کچھ ہی زیادہ مدت پہلے عثمان لی ترکوں نے جو اپنے اوطان سے کہاں کے کہاں ہتے ہوئے آتے تھے، شہر قسطنطنیہ کو تسخیر کیا کہ قریب قریب ناقابل تسخیر مقام تھا، تو یہ عظیم کامیابی محض جسمانی مشقت کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس میں آبنائے بوسفورس پر پل بنالینے اور اسے دونوں جانب مستحکم کر لینے، نیز اعلیٰ قسم کے آلات قلعه شکنی سے کام لینے کی حربی تدابیر کا بہت کچھ دخل تھا۔

علیٰ ہذا القیاس یہ بات بھی لوگوں کے ذہن میں کم آتی ہے کہ وسط ایشیا کے قدیم فاتح خوامین و سلاطین نے اپنی فتوحات کی کارگر تنظیم کرنے میں کیسی لیاقت کا ثبوت دیا۔ چنگیز خان کے تحت نہایت وسیع پیمانے پر مغول کی تاخت و تاراج کو دو ہتیشیں بھی نہ گزری تھیں کہ منہدم بعید شہروں کی نئی تعمیر ہونے لگی۔ ملک چھن کو مغل ”یورت کبیر“ یعنی بڑا پڑاؤ کہتے تھے۔ وہاں کے مغل فرماں روا قبلائی خاں نے عیش و نشاط کے قریب قریب ہر ”شاہانہ گنبد“ کی تعمیر کے ساتھ شکار گاہوں کے اندر مسکونہ محلات بنانے کا بھی حکم دیا اور تجارت کے راستوں کو دوبارہ بحال کیا جیسا کہ اطالوی سیاح مارکو پولو شہادت دے گیا ہے۔ تنظیمی مہارت کے علاوہ یہ مغل فرماں روا دنیا کے سامنے ذمہ داری کا احساس رکھتے تھے۔

چین میں ان کا خانوادہ یوآن ایک وسعت پذیر سلطنت کا سربراہ تھا۔ ایران میں ایل خانیوں نے ترقی پذیر شہر تبریز کو مرکز بنایا اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ ان ممالک پر حکمرانی کی جن میں سخت اہتری پھیلی ہوئی تھی۔ آگے چل کر عثمانیوں نے ایک مضبوط سلطنت ”دولت عثمانیہ“ اسی شہر کو مرکز بنا کر قائم کر دکھائی جو ان کی آمد سے قبل کامل جہود کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ کم بالو، تبریز، قسطنطنیہ جو دور گزشتہ میں ایک دوسرے سے منقطع پڑے تھے۔ اب تجارتی اور سفارتی دونوں قسم کے روابط سے مربوط ہو گئے اس طرح وہ امن عامہ جسے مغول سے منسوب کیا جاتا ہے ظہور میں آیا اور یہ محض جنگی قوت کی بیشی سے کہیں بڑھ کر ان کی عمدہ حکومت کا نتیجہ تھا۔ یہی صورت ”ہیکس رومانا“ (امن رومہ) کی مغلوں کی آمد سے ایک ہزار سال پہلے تھی۔ (۲)

رومیوں کی آہنی حکومت قوانین کے محکم نظام پر مبنی تھی۔ مغل فرماں رواؤں کے پاس اول اول خانہ بدوشوں کا قانون ”یسا“ تھا جسے چنگیز خان قید الفاظ میں لایا۔ اس کے ذہن میں اپنے صحرائی خیمہ نشین (کسل کے یورتوں میں رہنے والے) امیروں کی سیادت مفتوحہ زراعت پیش رعایا پر مسلم تھی۔ اس کا تصور کچھ ایسا تھا کہ ان مغول امیروں کی قوت اردوہائے مغل یعنی ان کے جنگ جو بہادر لشکروں پر مبنی ہو اور یہ سب خود اس کی اولاد کے بڑے لشکر ”التون اردو“ (طلائی لشکر گاہ) کے زیر اقتدار رہیں۔ ان فرماں رواؤں کو مشورہ دینے کا حق صرف آزمودہ کار سپہ سالاروں یا ”نونینوں“ کو حاصل ہو۔ مگر اس عظیم فاتح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے اخلاف تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دو ہی پیشین گزری تھیں کہ اکثر چنگیزی شہزادوں نے بیرونی دولت مند شہروں میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور خانہ بدوشوں کی نقل مکانی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے اور کچھ غلط نہیں ہے کہ چنگیز خان کے پوتے قبلائی نے جب ضعیف شدہ سوگ خاندان سے ملک پوری طرح چھین لیا تو چین کو فتح کرنے سے پیشتر ہی چین اس کو فتح کر چکا تھا۔ مغلوں کے التون اردو میں مذہب نے بھی رخنہ ڈالا۔ اپنی فتوحات کے وقت یہ تاتار و مغول جاہلی مذہب رکھتے تھے اور بیرونی دنیا کے مذاہب سے انہیں کوئی تعصب یا اعتنا نہ تھی۔ رفتہ رفتہ یوآن بادشاہوں نے بدھ مت اور ایران کے ایل خانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حقیقت میں بابر کا زمانہ آنے تک تبت کی برفانی سطح مرتفع سے بعید دریائے والگا تک یسا کی بجائے شریعت اسلامی کا کامل عمل دخل ہو چکا تھا۔ یہاں محمد صلعم کے احکام چنگیزی اقتدار پر غالب آگئے

تھے۔

غرض اس طرح فاتح اول کے ورثا بیرونی تہذیبوں کا جزو بن کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے اور مغل نوینیوں اور ترک ترخانوں کے صحرائی امیروں کا خاندان منتشر ہو کر جاگیرداروں، تاجروں، مذہبی علما، اور فلاسفہ کے تہذیب یافتہ معاشرے میں گھل مل گئے۔ اب پھر وہی زراعت پیشہ مستقل آبادیوں اور باقی ماندہ خانہ بدوشوں میں باہمی آویزش کا طبعی قانون عمل میں آیا۔ کیوں کہ چنگیز نے یورپیہ کے دو علاقے اپنے بیٹوں کو جاگیر میں دے دیئے تھے۔ وہ اسی طرح خانہ بدوشی اور کم و بیش یسا کے قانون پر عامل رہے۔

ترک و مغل سیلاب نے بیرونی ممالک میں جاگیر داری پولینڈ و لتوانیہ کی سرحدوں اور روس کے شہر کیوان سے لے کر ڈین بوب کی ندیوں تک بہت کچھ تغیر پیدا کیا۔ بایں ہمہ جہاں تک ترک و مغل آباد تھے ان علاقوں میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہاں والے بدستور خانہ بدوش رہے جو تجارتی شہروں کو چھوڑ کر دوسری بستیوں تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور یا قبائلی گروہ حصول سیادت کے لئے آپس میں دائمی کشت و خون کرتے تھے۔

باہر کی پہاڑی وادی سے دور شمال مغرب میں دریائے یورال سے آرتیش تک وہ نیم صحرائی علاقہ تھا جو چنگیز کے سب سے بڑے اور خود سر بیٹے جوگی کی ریاست میں دیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے باتو کے عہد میں اسی علاقے کے دور دست اردو کو یورپ والے التون اردو کے نام سے جانتے تھے، جس کا سبب شاید وہ پر شکوہ خیمہ و خرگاہ تھے جو والگا کے مشرقی کنارے رواں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں انگریز شاعر چوسر نے لکھا تھا کہ

ارض تاریہ کے شہر (سرا) میں ایک بادشاہ رہتا ہے

کہ روسیہ کا درد سر ہو گیا ہے

خانوادہ جوگی کے یہ خان دوسری خانی ریاستوں سے الگ تھلک رہے اور روس کی کچی فصیلوں کی بستیوں کے سوا کسی بیرونی تمدن سے بھی ان کا سابقہ نہیں پڑا۔ اس تاریک نیم صحرائی سرزمین میں اسلامیت کا قدم بھی ست رہا۔ پھر جب اس التون اردو کے مرکز گریز مجادلات نے کھڑے کھڑے کئے تو چند گروہ والگا کے مشرق میں ہٹ آئے اور ”تیمناق“ یعنی صحرائین کھلائے۔ جس زمانے میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو تسخیر کیا، اسی کے قریب ان تیمناقوں کی ایک نئی اور جان دار گروہ بندی وجود میں آئی جو اپنے آپ کو ”ازبک“ یعنی خود سردار موسوم کرتے تھے۔ اس لفظ کی اصلیت کسی قدر مشکوک ہے لیکن ازبک تیر انداز

سواروں کا فوج در فوج خانوادہ چغتائی کے علاقوں پر پل پڑنا تاریخی واقعہ ہے۔ چغتائی یا ”چغتے“ چنگیز خان کا دوسرا بیٹا تھا۔ وسط ایشیا کا قلب جو سطح مرتفع تبت کے اوپر واقع ہے اس کی وسیع جاگیر تھا۔ اس میں صحرا اور نیم صحرا شامل ہیں جو بلند ہوتے ہوئے ایشیا کی ریڑھ تک چلے گئے ہیں۔ جہاں تھیان شان کا سلسلہ ابر آلود پامیر پر کوہستان ہندوکش سے آتا ہے۔ مذکورہ بالا سرزمین بھی ازبکی اوطان کی طرح عملاً بدوی ہی رہی تاہم جہاں کاروانی راستے آکر ملتے تھے، خصوصاً نسٹوری نصاریٰ یا اسلامی زیارت گاہوں کے گرد، تہذیب کے جزیرے سے بنے اور برابر قائم رہے تھے۔ کاشغر، المانق، شبلیق (بخ شہر) جیسی بستیاں اگرچہ مغلوں کی پہلی یورش میں تاریخ ہوئیں، لیکن اب چغتائی کے اخلاف وہاں آئے تھے۔ ایسی مستقل سکونت ان کے قانون یسا کی خلاف ورزی تھی۔ چنانچہ اگرچہ وہ اپنے ذاتی خزانے فیصل بند شہروں میں محفوظ کر دیتے تھے، خود ابھی تک اپنے قبائل کے ساتھ جاڑے ندیوں کے کنارے مرغزاروں میں اور گرمیاں پہاڑیوں پر چراگاہوں میں گزارتے چلے جاتے تھے۔ ان چغتائی خوانین کی جماعت انگھڑ قسم کی شان امارت رکھتی تھی اور تخت حکومت کی بجائے زیادہ تر وہ گھوڑے کے زین پر بیٹھ کر فرماں روائی کرتے تھے۔ جہل کے اندھیرے میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ ان کی اپنی کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ بیرونی جنگ و جدال میں بھی الجھتے رہتے تھے۔ پہاڑوں کی پشت کے مشرق میں ان کا بڑا شہر کاشغر تھا جو اب چین کے دائرہ اثر میں ہے۔ وہاں اس علاقے کو مغولستان یعنی ارض مغول کہتے تھے اور چینوں کی نظر میں مغل اور راہزن میں کوئی فرق نہ تھا۔

کوہستانی حد فاصل کے مغرب کے خوانین دعویٰ دار تھے کہ چغتائی کے اصل وارث وہی ہیں۔ ان کا خاص گڑھ تاشقند یعنی پتھر کا شہر فیصل بند تھا۔ یہ ان وسیع گیارہ زاروں میں واقع تھا جن کے درمیان سے چین کی بڑی شمالی شاہراہ گزرتی تھی۔ تجارتی قافلے اسی راستے سے چین جاتے اور وہاں کا ریشم ادھر لاتے تھے۔ ان خوانین کو بت پرست کرغز اور جنگلی قرق قبائل سے اپنی چراگاہوں کی حفاظت کرنا ہی دشواری سے خالی نہ تھا کہ اب وہ خاصی طرح ازبکوں کے راستے میں آگے جو جنوب کی طرف ڈھل رہے تھے۔ بابر کا سخت کوشش تانا خاندان چغتائی کی اسی شاخ میں تھا اور ہر چند شہر تاشقند پر اسی کی حکومت تھی جب اسے بابر کا اصلی نام بتایا گیا تو وہ اسے بلا دقت ادا نہ کر سکا۔

واضح رہے کہ چغتائیوں کے خطے کا یہ جنوب مغربی قطعہ دوسرے اقطاع سے اتنا مختلف

تھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ سرسبز پہاڑی وادیاں اسی علاقے میں بنی ہوئے ہوتے وسیع میدان سے مل جاتی تھیں۔ جو بحر اراک تک جانے والے دو بڑے دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔ اسی میدان میں اور گویا خانہ بدوشی کے سمندر میں تہذیب اور ثقافت کے دو جزیرے آگئے تھے۔ ایک بخارا جو اسلامی درس گاہوں اور مزاروں کے باعث مشہور تھا اور دوسرا سمرقند جہاں عالیشان محلات اور تجارت کی گرم بازاری تھی۔ ان شہروں کے گرد زراعت پیشہ آبادی دریائی آب پاشی کے سہارے زندگی بسر کرتی تھی۔ آمو اور سیر (جیوں، سیوں) کے اس دو آبے میں وادیوں کے پورے سلسلے پر شریعت اسلام کا نفاذ ہو گیا تھا اور قانونِ یسا قریب قریب معدوم ہو چکا تھا۔ یہی سرزمین تھی جہاں مغلوں کے درمیان تناور خشندہ ترک تیمور لنگ کا چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ظہور ہوا۔ تیمور نے سمرقند ہی کو اپنا محکم حصار بنایا اور اپنی ترک تازیوں کے غنائم سے اسے مالا مال کیا۔ یہ ”لنگڑا فولاد“ اسلام کا جھنڈا لے کر اٹھا اور خانہ بدوشوں پر تابوتوں کی طرح ایسے جوابی حملے کئے کہ باتو کے التون اردو کا رہا سا جتھا پر آگندہ ہو گیا اور مغولستان کے چغتائی خوانین کا شیرازہ بکھر گیا۔ تیمور نے اپنے آخری سنہن میں سمرقند کو چار چاند لگائے۔ شمالی ہندوستان کو تاخت تاراج کیا۔ عثمانی سلاطین کی فتح مند فوجوں کو پامال کر ڈالا اور اقصائے یورپ تک میں ”تمرلین“ نام کی ہیبت پھیلا دی۔ ۱۴۰۵ء میں وہ چین پر لشکر لے کر چلا تھا جہاں منگ خاندان کے عروج کے سامنے یوان خاندان کا چراغ جھلملانے لگا تھا جب کہ قضائے الہی سے فوت ہو گیا۔

پائے تخت سمرقند ہونے کے باوجود تیمور کی چند روزہ سلطنت اپنے مغرب کی سطح مرتفع ایران کی تہذیب کے زیر اثر قائم ہوئی تھی۔ سمرقند کے باغوں کے محلات میں چوکے تک ایرانی معماروں نے لگائے تھے اور ایرانی اہل قلم ہی نے اس بزرگ فاتح کے نام کو بقائے دوام بخشی جو اپنے لئے صرف امیر یعنی صاحب امر کا لقب پسند کرتا تھا۔ تیمور، چنگیز کی اولاد میں نہ تھا، اگرچہ مقبرے کے کتبے پر چنگیز کا نام بھی تیمور کی ازدیاد شہرت کے لئے کندہ کر دیا گیا ہے۔

مخاربات تیموری کے بعد صنعت تیموریہ کی وہ ایک صدی آئی جو وسط ایشیا کی تاریخ فنون میں سب سے درخشاں دور ہے۔ ایک بیٹے کے ماتحت سمرقند میں اور ایک پوتے کے وقت ہرات ملک خراسان میں یہ چمک دمک قائم رہی۔ ارباب صنعت اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے جیسے یورپ کے شہر فلورنس میں۔ پھر چالیس برس مخدوش امن کے گزرے

جس میں آل تیمور نے اپنے مرکز اقتدار کو بچائے رکھا۔ ۱۳۶۵ء تک ہم تیموری فرماں روا ابو سعید (۳) کو دامن قاف سے مشرقی پہاڑوں کے پار کاشغر تک بادشاہی کا دعویٰ کرتے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اب ازبک خانوادہ جوہی کے وارث بن کر بختوں کی طرح کبجہ خمول سے دوبارہ سیا کا وہی قانون لئے ہوئے نمودار ہو گئے تھے جسے روشن خیال تیموریوں نے کب کا ترک کر دیا تھا۔

۱۳۶۵ء کے بعد دولت تیمورچہ دعویٰ داروں کی باہمی جنگ و جدال سے پارہ پارہ ہونے لگی۔ پائے تخت سرقرند کے وارث کو یہی غنیمت نظر آتا تھا کہ جس طرح بنے اپنے بھائیوں سے فی الوقت صلح صفائی رکھے۔ ان میں ایک بھائی تو جنوب مغرب میں ہرات پر قابض تھا جہاں صنعت و فن ترقی پر تھے۔ دوسرا جنوب مشرق کی بلند سرزمین پر جہاں سے جیحون سیحون نکلتے ہیں، ہندوکش تک فرمان روائی کرتا تھا۔ اور جنوب میں تیسرے بھائی نے ہندوکش کے پار افغانی علاقے میں کلل دبا لیا تھا۔ سب سے مجہول چوتھے بھائی کو سمجھئے جو انتہائے مشرق میں فرغانہ پر قابض رہا۔ یہ بابر کا باپ تھا۔

ان دور دست پہاڑیوں میں بابر کا پیدا ہونا تقدیر کی بے مہر تھی کہ ایک طرف تو برف پوش اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے اور دوسری طرف تاشقند سے جو چغتائی کے وارثوں کا مسکن تھا، فرغانہ پہنچ جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ وادی حقیقت میں آباد اور ابھی تک نہایت بارونق شہر سرقرند اور دوسری جانب صحرائورود خانہ بدوشوں کے درمیان حد فاصل تھی۔ اس کے ایک طرف کاشتکار، دوسری طرف شکاری، ادھر صاحبان علم و فن اور ادھر وحشیوں کا دور دورہ تھا۔ بعید فرغانہ کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی سرگزشت صفحہ تاریخ پر باقی نہیں رہے گی۔ بایں ہمہ بابر نے قلم سے کام لیا۔ اپنی گمنام سی مادری زبان چغتائی ترکی میں فرغانہ اور خود اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ اس عمدہ خوشی میں اس نے اپنی آواز لوگوں کے کان تک پہنچا دی۔ چنانچہ آج بھی کہ اس تحریر کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گزر چکے ہیں، وہ داستان کچھ اس طرح ہمیں سنائی دیتی ہے کہ گویا کہنے والا رات ہوتے پڑاؤ پر پہنچا ہے۔ دن بھر دشمن کے تعاقب میں اور یا زیادہ تر یہ کہ دشمن اسی کے تعاقب میں تھا۔ گھوڑے سے اتر کر ڈیرے میں آگ کے پاس بیٹھا اپنی روئیداد سنا رہا ہے۔ اسی روزینہ روداد میں ہم کو اس عمدہ کی تصویر نظر آنے لگتی ہے جو یورپ والوں کے ”زرنگار مشرق“ پر قبضہ جمانے سے پہلے یہاں کی کیفیت تھی۔

بابر کا زمانہ وہ تھا جب کہ یورپ میں ایک دھندلے جزیرے انگلستان میں، وہاں کا ایک امیر کسن وارث تاج ایڈورڈ کی بجائے رچرڈ ثالث کے لقب سے خود بادشاہ بن جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ ادھر طینانی رودبار کے پار وہ سالہ بیسارد (Bayard) شمشیر زنی سیکھ رہا تھا اگرچہ بہادر شہسوار بننے سے بڑھ کر اس کا مطمح نظر فرانس کے بادشاہی پرچم کو اونچا رکھنا تھا۔ آگے مشرق میں سو زولا راہب سامعین کے روز افزوں مجمع کو عقبی کے خطرات سے اور قہر الہی سے جسے وہ بھولے ہوئے تھے، ڈرا رہا تھا۔ براعظم یورپ کی مشرقی سرحد ان دنوں تیوتانی سرداروں کے قلعوں سے بہ مشکل آگے جاتی تھی اور یہ سردار ابھی اپنے جذبہ جماد کو بالکل تاریک ساحلوں کے بت پرستوں کو ہلاک کرنے تک ہی محدود رکھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ پرتگال کے بادبانی جہاز افریقہ کے مغربی سواحل پر ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ مشرق کے افسانوی ملک کا جہاں پر سترجون کی کبھی حکومت تھی، راستہ مل جائے۔ ایک ٹیلے ملاح نے جو اس بحری گشت میں ان کے ساتھ رہا، لڑین میں یہ حجت بھی کی کہ ادھر پھرنے کی بجائے سیدھے مغرب میں سمندر کو پار کریں تو ایشیا میں جا ٹکلیں گے لیکن اس ملاح کرسٹوفر کولمبس کی درخواست کو اسے ”اوشن سی“ کا ناخدا بننا کے چند چھوٹے جہاز دیئے جائیں، اس وقت منظور نہیں کی گئی تھی۔

باب اول

وادی کی روداد

بابر ۸۳۸ء کے وسط سرما میں پیدا ہوا جب کہ برف پہاڑوں سے پھسل پھسل کر شاہ دانہ کے باغوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ان دنوں وادی محصور تھی کیونکہ برف نے آمد و رفت کے درے بند کر دیے تھے سوائے اس راستے کے جو دریا کے کنارے سرقند جاتا تھا۔ بابر پہلا بیٹا تھا لہذا اس کی ولادت پر محل سرا میں بہت خوشی منائی گئی۔ شکستہ حال قلعے کے درپچوں سے عورتوں نے قالین باہر لٹکائے۔ بابر کی بہن پانچ برس کی تھی، یعنی اتنی بڑی کہ ننھے بھائی کی دیکھ بھال کرنے کا شوق رکھتی تھی۔

ملک کے گوشے گوشے سے قبائلی سردار اور ان بستیوں کے والی جو عمر شیخ مرزا کی مطیع تھیں گھوڑوں پر سوار جوق در جوق ولادت باسعادت پر باپ کو مبارک باد دینے اور خوب دعوتیں کھانے آئے۔ کیونکہ عمر شیخ عقل و تدبیر سے نہ سسی فیاضی کی صفت سے متصف تھا اور قریبی زمانے میں اس کے معاملات کچھ بے طور سے رہے تھے، لہذا اس موقع پر مہمانوں کے ساتھ جو بھی ہم پیالہ ہوئے، اس نے آب ممنوعہ پیا۔ نجوی کو بلوا کر بچے کے طالع سعد کا زائچہ کھنچوایا اور نشے میں سرشار ہوا تو مستون قرآن کی بجائے شاہ نامے کی پیش گوئیاں پڑھنے لگا۔ (۴) عمر شیخ کے بلند عزائم تو کبھی خیال کی منزل سے آگے نہیں بڑھے۔ البتہ اس کے شوق کا مشغلہ کبوتر پالنا تھا۔ وہ پیام بر کبوتروں کا عاشق تھا اور کبوتروں کو بڑی محنت اور صبر سے ہوا میں پلٹیاں کھانی سکھایا کرتا تھا۔ آس پاس باز وغیرہ اڑانے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم بابر کی ولادت نے اب اسے بچے کی طرف زیادہ متوجہ کر لیا۔

سن رشد کو پہنچنے کے بعد بابر سمجھ گیا تھا کہ ظاہری آؤ بھگت کی تہ میں اس کے باپ کا نکما پن مخفی تھا۔ (اپنی ترک میں لکھتا ہے)

”عمر شیخ میرزا کی فیاضیاں وسیع تھیں، اسی طرح اس کا دل وسیع

تھا بڑی بڑی امیدیں اور شاندار منصوبے باندھتا تھا اور ہمہ وقت کشور کشائی کی تجویزیں سوچا کرتا تھا، اگرچہ جب کبھی فتح کرنے نکلا، شکست کھا کر مایوس و ملول واپس آیا۔ وہ سلطان ابو سعید میرزا کا جس نے آخر مرتبہ امیر تیمور کی سلطنت کے جملہ اقطاع کو مجتمع رکھا، چوتھا فرزند تھا۔ کسی قدر پست قامت، تراشیدہ ٹیلی ڈاڑھی، سرخی مائل بال اور بڑے تن و توش کا آدمی تھا۔ اتنا تنگ جامہ پہنتا کہ پیٹ دبا کر بند باندھے جاتے اور بدن ڈھیلا چھوڑتا تو اکثر ٹوٹ جاتے تھے۔ اپنی غذا یا لباس کے بارے میں اسے کوئی خاص لحاظ نہ تھا۔ ڈھیلی دستار کے دونوں سرے پڑے لٹکتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مغلی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا۔

وہ اپنے عقائد میں پکا تھا۔ پابندی سے پنج و تہ نماز ادا کرتا اور اکثر قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اگرچہ شاہ نامہ پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ مزاج کا نرم، لیکن اچھا بہادر آدمی تھا قادر انداز بھی برا نہ تھا، مگر اس کے کئے میں غضب کی قوت تھی۔ جس کے بھی مارا وہ گرے بغیر نہ رہتا تھا..... آگے چل کر وہ ایک دو بار بزم نانوش میں شریک ہونے لگا تھا۔ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا۔ اکثر چوسر کبھی کبھی پانسوں سے کھیلتا تھا۔“

برخلاف اس کے بابر کی ماں امور خانہ داری میں مصروف رہتی اور محل کا جس کی آمدنی کم خرچ زیادہ تھا، انتظام کرتی تھی۔ یہاں اسے مغل ہی کے نام سے یاد کرتے کیونکہ اس کا باپ جس نے عمر شیخ سے اس کا عقد کیا، تاشقند کا مغل حاکم یونس خاں تھا۔ (وادئ فرغانہ میں ”منگول“ کا تلفظ ”مغل“ کیا جاتا تھا) وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتی تھی لیکن ان تفریحات کی اسے فرصت کہاں تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ اسے مختصر دربار کی آن بان قائم رکھنی پڑتی تھی جو تاشقند کے دربار سے جہاں وہ پٹی بڑھی، بہت ادنیٰ تھا۔ مگر فریہ اندام، من کے موچی امیر کی، جسے کبوتر بازی، بے نوشی اور کشور کشائی کے لامائل منصوبوں سے فرصت نہ ملتی تھی، صدر بیگم ہونے کے باعث یہ سب کام کرنے پڑتے تھے۔

بچے کی ولادت کی تقریب میں آنے کے لئے اس بیگم کے ماں باپ کو پورا ایک سال لگا کیونکہ وہاں چغتائی مغلوں کے خاندان یونس خاں کا ساتھ چھوڑے جا رہے تھے۔ اصل میں ان مغول کو اپنا پرانا طرز زندگی چھوڑنا کہ ادھر سے ادھر گئے لئے پھرتے ہیں اور چھاپے مار کر دولت لوٹ رہے ہیں، گوارا نہ تھا۔ ادھر یونس خاں جما ہوا تھا کہ نئے اصول معاشرت کو ہاتھ سے نہ دے گا، کم سے کم تاشقند کی فیصلوں کے اندر جہاں وہ اپنے جنگ جو رفیقوں پر آئین مذہب و تجارت چلا سکتا اور خود سیب کے باغوں میں آرام سے بیٹھ کر حافظ کے لطیف کلام کا اتباع کر سکتا تھا۔ اسے عیاریاں کرنی آتی تھیں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے ایک نئی جنگ چھیڑ دی اور شوریدہ سر قبیلوں کو اپنے جھنڈے سے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یونس خاں نے زمانے کے بہت نشیب و فراز دیکھے تھے۔ کئی بار زندانوں سے نکل کر محلات میں پہنچتا تھا یہاں تک کہ مرحوم ابو سعید میرزا نے اسے جلا وطنی میں ایران کے عشرت کدوں سے واپس بلایا اور چغتائیوں کی رہی سہی مملکت پر، چنگیز کے وارث صحیح کی حیثیت سے حکومت کرنے کی دعوت دی۔

بہر حال اب جو یونس خاں نواسے کو تحفہ تحائف دینے وادی فرغانہ آیا تو پوری شان شوکت سے قبائل کی فوج کی فوج لے کر آیا جن کے ساتھ نفیریاں کان اڑائے دیتی تھیں اور گھوڑوں پر دھرے ہوئے دف کی تال پڑ رہی تھی۔ ادھر سے عمر شیخ مرزا، باں تن و توش عاجلانہ چلا کہ ایک منزل آگے بڑھ کر خان کا استقبال کرے اور آداب خوردانہ بجا لائے۔ اسی کے ساتھ دل میں تشویش بھی ہو گی کہ یہ بزرگ مغل واقعی کچھ اعانت کرے گا یا داماد کی کچھ اور زمین ہتیا لے گا۔ کیونکہ، مدت بعد، بابر بیان کرتا ہے کہ ”بارہا میرے باپ نے مشکل کے وقت اپنے خسر کو مدد دینے کے لئے بلایا، مگر ہر مرتبہ اپنے ملک ہی کا کوئی حصہ اس کے حوالے کر دیا حتیٰ کہ خود تاشقند شہر بھی جو اصل میں میرے باپ کی ملکیت تھا، یونس خاں کو دے دیا۔“

مگر اس آمد کے وقت یونس خاں بزرگ خاندان بن کر آیا اور لطف و عنایت پر مائل تھا۔ یہ بابر کے عقیقہ کی تقریب تھی جس میں وہ شریک ہوا اور چونکہ بچے کے نام ظہیر الدین --- محمد، کو ادا نہ کر سکتا تھا۔ (۵) لہذا اس بوڑھے نے لاشعوری طور پر اسے بابر کے لفظ سے یاد کیا۔ پھر یہی عرف چل گیا۔

مولود کی ثانی ایساں بھی بچے کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئی۔ وہ بے نقاب صرف سفید براق

روبال سر پر ڈالے سواری کا گھرے رنگ کا پوتین پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آمد پر قلعے کی سب عورتیں خاموش ہو کر آداب بجا لائیں۔ ایسان (۶) کے شریفانہ اوصاف کا قصہ سن کر یونس خاں نے ۴۱ برس کی عمر میں اسے ایک صحرائی قبیلے سے عقد نکاح میں لیا تھا اور اب تیس سال سے یہی بیوی اس کے دکھ درد میں شریک اور اس کے روز افزوں مرض فالج میں اس کی تیمار دار تھی۔ ایک مرتبہ جب یونس خاں کو غلے کی تلاش میں مغولستان کے باہر اپنے رشتہ داروں کے پاس جانا پڑا تو اس کے ایک جانی دشمن نے چھاپہ مار کر ایسان کو گرفتار کر لیا اور اپنے کسی ساتھی کو دے دیا۔ ایسان نے اپنے نئے مالک کا خیر مقدم کیا اور کپڑے اتارنے میں مدد دیتے وقت قتل کر ڈالا۔ پھر اپنے گرفتار کرنے والے خان کو اطلاع کرائی اور کہلا بھیجا کہ تم مجھے جان سے مار سکتے ہو لیکن یونس خاں کے سوا اور کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اعزاز کے ساتھ وہ اپنے شوہر کے پاس واپس بھیج دی گئی۔ ایسان کی تعلیم صرف گرم و سرد زمانہ کا تجربہ تھا۔ صحرا نوردوں کی طرح خطرے کو تاڑ جانے اور اس سے بچ نکلنے کا ہنر جانتی تھی۔ اس کی چوکی آئندہ بابر کے بہت کام آئی۔

بابر جو اسی نام سے پکارا جانے لگا تھا، پہلی دفعہ وادی سے باہر سمرقند گیا تو اس سے ایک سال قبل یونس خاں خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ وہ اگرچہ ابھی پانچ سال کا بچہ تھا، پھر بھی شان دار باغوں کے محلات، سورج میں مقبروں کے لاجوردی چوکوں کی چمک دمک دیکھ کر تعجب کرنے کی اس میں سمجھ تھی۔ اپنے افسانوی جد امجد کا عظیم مقبرہ ”گور امیر“ دیکھ کر شاید اتنا حیران نہیں ہوا، جتنا ایک چینی پگوڈا میں ہاتھی دانت کے جانور دیکھ کر، یا ”گوئنجی مسجد“ میں آواز کا جواب سن کر، جس کا پکارنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ ایک اور باغ ”د لکشا“ نام کی بارہ دری میں تیمور کی فتح ہند کی تصویریں منقوش تھیں اور یہ دیکھ کر خود اسی کی وادی جیسے شہسوار عجیب قسم کے جنگلی ہاتھیوں کو مار کر بھگا رہے ہیں، ضرور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں گی۔ مگر ہمارے شیر کو لوگوں نے اس کی دلسن دکھائی تو وہ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ یہ اسی کی ہم عمر بیچ سالہ شہزادی عائشہ تھی جو منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے گھونگھٹ ڈالے لائی گئی اور رسم ادا ہوتے ہی الٹے پاؤں بھاگ گئی۔ بابر نے اسے خرد رائے لونڈیا سمجھا اور آئندہ بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا رہا۔

لیکن ایک اور تماشا جس نے شاید اس کے دل پر بہت پائے دار نقش چھوڑا، یہ ہوا کہ اس کے چچا سلطان احمد میرزا نے ایک اور شادی انہی دنوں رچائی۔ یہ چچا اس وقت سمرقند

کا مالک تھا اور اپنے بھائیوں میں صلح صفائی کی کوشش کے ساتھ درپردہ انہیں بے وقعت کرنے کی فکر میں تھا۔ اس پوری عمر کی شادی میں اس نے ننھے باہر کو بلا کر کہا کہ دلہن کا گھونگھٹ منہ سے ہٹا دے۔ جس وقت وہ تعمیل حکم کی کوشش کر رہا تھا، اس نے حاضرین امرا کے قہقہے کی آواز سنی جو گویا اس کی تضحیک کر رہے تھے۔ (۷)

باہر اب اپنے آس پاس کی عورتوں کے جذبات سمجھنے لگا تھا۔ عائشہ اسے ناپسند کرتی تھی۔ بہن خازنہ جو اب بڑی عورتوں کے سے زیورات کی خواہش مند ہو چلی تھی، اس کی طرف دار چاہنے والی تھی۔ ماں خیر خواہی سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی۔ نانی کی ہر وقت دیکھ بھال رہتی تھی۔ ان باتوں نے باہر پر بہت اثر کیا۔ اگلے سال اسے زنان خانے سے باہر بھیج دیا گیا کہ اپنے باپ کے ساتھ رہا کرے۔

یونس خاں کے مرنے سے باہر اور اس کا باپ اپنے ایک حمایتی سے محروم ہو گئے۔ وہ انہیں نوچتا کھوٹتا رہتا تھا مگر کنبے بھر میں ان کا سچا حلیف اور محافظ بھی تھا۔ ورنہ تینوں بڑے سگے بھائی عمر شیخ میرزا کا ملک نکال لینے کی خواہش میں متحد تھے اور سرقد میں پچھلے دنوں ملاپ کا جو سوانگ رچایا گیا، اس کے بعد صرف آپس کی بدگمانیوں نے ان بھائیوں کو فوراً ایسا اقدام کرنے سے باز رکھا تھا۔ ان کی طمع کا سبب یہ تھا کہ گوموٹے بھائی کے ہاتھ میں روپیہ نہ تھا اور اسی لئے کوئی مضبوط فوجی جمعیت بھی اس کے پاس نہ تھی، تاہم اس کی وادی خوب آباد اور سرسبز تھی۔ باہر جب اس قابل ہوا کہ گھوڑے پر چڑھ کر باپ کے ساتھ دورے کرے تو اس کی سب سے پہلی محبوب شے یہی وادی فرغانہ بنی۔

کابلک ٹوٹتی ہے

ایک مدت بعد باہر کیفیت لکھتا ہے کہ ”سر زمین فرغانہ آباد (متمدن) دنیا کے سرے پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سرقد اور جنوب کی طرف بدخشاں کے بلند اقطاع ہیں۔ شمال میں جیسا کہ تاریخ بتلاتی ہے، سابق میں المایق اور الماتا (سیہوں کا باپ) جیسے شہر آباد تھے لیکن جب سے ازبکوں کے قدم آئے وہ قریب قریب سب اب ویران ہو گئے ہیں۔

خود فرغانہ کا رقبہ زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں غلہ اور پھل افراط سے ہوتے ہیں۔ اس کے ہر طرف پہاڑیاں کھڑی ہیں، سوائے مغرب کے جو سرقد اور نجنڈ کی سمت ہے ادھر

پہاڑیاں اٹھی ہوئی نہیں ہیں اور اسی طرف سے دور دور کے دشمن فرغانہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس علاقے میں ریتیلہ سیر (سیحوں) بہتا اور بوند سے گزر کر شمال کا رخ کرتا ہے۔ پھر وہ ترک قبائل کی میدانی زمینوں میں پہنچتا ہے اور راستے میں کوئی معاون ندی نہ ملنے کی وجہ سے آخر ریگستان میں جذب ہو جاتا ہے۔“

ان شمالی گیاہستانوں پر پہلے یونس خاں کا پہرا رہتا تھا۔ نو عمر بابر کی نظر میں اب وہ مخدوش زمین بن گئے تھے۔ جس کے پار وحشی جتھے ایسے نظر آتے تھے جیسے میدانوں سے افق پر کالی گھٹا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں پہاڑیوں کی فسیل بھی کوئی مضبوط حائل نہ تھی کیونکہ ندیوں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ سواروں کا انہیں طے کر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہ ندیاں برف کے پانی سے جاری رہتیں اور نیچے کی مزرعہ اراضی تک پہنچنے میں پہاڑیاں کاٹ کے راستے تیار کر دیتی تھیں۔ فی الواقع اسی قسم کے راستوں سے تجارتی قافلے منزل بہ منزل آتے اور خطا (چین) کا مال سمرقند کی منڈیوں میں لاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا قافلہ بابر کے شہر کے قریب مرغزار میں پڑاؤ لگاتا تھا کہ برفستان طے کرنے کی ٹکان دور کرے اور ایال دار یاک اور ٹٹوؤں سے سامان اتار کر گھوڑوں پر منتقل کرے جو سمرقند کے آگے، سرخ ریگستانوں سے گزرنے کے لئے دوبارہ اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔ زیادہ بلندی والے درے جاڑوں میں عموماً مسدود ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان بلندیوں کو طے کرنے والے ایک قافلے کو برف نے آدیا اور صرف دو آدمی زندہ بچ کر نشیبی وادی تک پہنچ سکے۔ جونہی میرے باپ نے یہ خبر سنی، داروغہ روانہ کئے کہ قافلے کے ہلاک ہونے والوں کا مال اسباب تحویل میں لے لیں اور اگرچہ اس وقت اپنے جملہ مداحل وہ ٹھکانے لگا چکا تھا اور روپے کا ضرورت مند تھا، مگر اس نے یہ تمام سامان مقفل کرا کے وارثوں کے واسطے محفوظ کر دیا۔ انہیں اطلاعاتیں بھیجیں تا آنکہ ایک دو سال میں سمرقند اور خراسان سے مال کے وارث آئے اور اس نے بجنہ سارا مال اسباب ان کے حوالے کر دیا۔ وہ ایسا متدین آدمی تھا۔“

عمر شیخ میرزا دوسروں کے حق میں فیاض مگر خود اپنے لئے نفع رساں نہ تھا وہ اپنے شہر اند جان میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا کرتا تھا مگر اتنا نہ ہوا کہ اس کی مورچہ بندی بھی کرا لیتا۔ تھوڑی ہی مدت میں بابر نے پتا چلا لیا کہ اس کی وادی دو مختلف علاقوں پر مشتمل ہے : ایک تو ندیوں کے کنارے کے نشیبی دیہات، دوسرے غیر آباد پہاڑیاں۔ اس کے شہر کی

ندی سے نو نہریں بستی میں آتی تھیں۔ وہ بہت دن اسی حیرت میں رہا کہ یہ گھروں میں پہنچ کر کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کا تجسس اسے اوپر پہاڑیوں پر لے گیا جہاں نرسل کے جھنڈ اور وہ تنگ گھاٹی تھی جسے ”جست گوسفند“ کہتے تھے اور پھر اوپر برفانی چوٹی کے کوہ برا کا دید بانی مقام تھا۔ نیچے کی سطح ہری بھری چراگاہ میں مویشی کے گلے چرتے پھرتے اور دور دور گاؤں نظر آتے تھے۔ خود پہاڑی کے آس پاس بھی گرمیوں کی چرائی کے لئے اونچے قطعات کا سلسلہ تھا جہاں کہیں کہیں قبائلی لوگ چرمی چھول داریوں میں جو تیز ہوا سے بچاتی تھیں، زمین پر بیٹھے ہوتے، ارد گرد چند بھیڑیں اور کالی بکریاں ہوتی تھیں۔ پہاڑی لوگ نوعمر شہزادے کی بادام اور مونے تیر کے گوشت سے تواضع کرتے تھے۔ باہر اندازہ بتاتا ہے کہ ایک تیر کا شوربہ چار آدمیوں کے لئے کفایت کر سکتا تھا۔ اس قسم کے گشت میں خود اس کے ساتھ کوئی مسلح سپاہی یا سردار ضرور ہوتا تھا۔ ان کو ہستانی قطعات میں اس نے قدرتی عجائبات دیکھے۔ مثلاً سنگ ساق کی ایک چوٹی کہ بالکل درگاہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک دھندلا سا استادہ پھراتا چکنا کہ اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ اسے باہر نے ”سنگ آئینہ“ موسوم کیا۔ پھر پہاڑیوں میں وہ بھول بھلیاں تھیں کہ دیہات میں نہیں ہوا کرتیں۔ ان کی بنیاں پتھر کی منڈریوں سے پہچانی جا سکتی تھیں جن پر چل کر پناہ گزین شہری قوانین کی گرفت سے بچتا بچاتا دوسری وادی تک جا نکلے۔ ہمارے شیر نے جلد رشد و ہدایت حاصل کی اور ان خفیہ راستوں کے بھیج بھی سیکھ لئے۔ نوعمر رفیقوں کے ساتھ وہ ان ویرانوں میں سفید ہرن شکار کرتا پھرتا تھا۔

آمد بہار یا فصل کی تیاری پر عموماً بستیوں میں میلے لگتے ان تقریبات میں اکثر بڑی عمر کے لوگ بھی شراب ممنوعہ پیتے اور عمر شیخ میرزا کے ساتھ نزد و قار آکر کھیلتے۔ وسط گرما میں گلاب اور لالہ کے پھول کھلتے۔ لڑکے شام کو بڑے بڑے کچھوؤں کی پشت پر موم بتیاں جما کے روشن کر دیتے اور ان کے باغوں میں خراماں خراماں پھرنے کا تماشا دیکھتے۔ خربوزوں کی فصل تیار ہوتی تو ان دنوں گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں لوگوں کے مجمعے لگتے تھے۔ ہمارا شیر مزے کا رسیا تھا۔ انہی میلوں، کھیل تماشوں یا ریلے پھلوں کی بنا پر ہر بستی کو یاد رکھتا تھا۔ پرانے بچہ میں بڑے رس بھرے اثار ہوتے تھے۔ کاروانی شاہراہ اسی کے قریب سیر دریا کو آتی تھی اور اس کی پہاڑیوں میں اعلیٰ درجے کا فیروزہ مل سکتا تھا، مگر وہاں سانپوں کی بھی کثرت تھی۔ اور آگے مرغیناں کی خشک خوبائیاں جن میں بادام بھرے جاتے تھے، اسے پسند

تھیں۔ اسی مقام کے مکہ باز پہلوان مشہور تھے۔ لڑنا بھڑنا، دھونس دھڑکا انہیں خوب آتا تھا۔ اسی سے یہ مثل بن گئی تھی کہ ”جو دھونیا ہے وہ مرغیناں کا۔“ دریا کے پار کی بستی بابر کا اصل مسکن ہونا چاہئے تھی۔ اس کا نام انخی (۸) اور یہاں وادی فرغانہ کا سب سے قدیم و مستحکم قلعہ تھا۔ شروع میں عمر شیخ نے یہاں اقامت کی مگر پھر اسے چھوڑ دیا۔ البتہ یہاں ایک کبوتر خانہ بنا دیا تھا اس کی نگہداشت کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بستی کے مکان تو آڑ میں محفوظ تھے لیکن کھلی پہاڑی کی چوٹی پر بالا حصار ہوائے تند کی زد میں تھا (بابر لکھتا ہے) ”قلعہ بلند چٹانوں کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ ڈھلوان ندی نالے اس کے پہلوؤں میں خندق کا کام دیتے ہیں۔ قلعے کے سامنے دریا بہتا ہے۔ قلعے اور بستی کے درمیان صحرا ہیں جن میں سفید ہرن کی کچھ کی نہیں ہے اور باز کا شکار بھی ہر طرف خوب ہوتا ہے۔ صحرا کے اسی اتصال کے باعث یہاں والے کہا کرتے ہیں ”کہاں ہے صحرا، کہاں ہے شہر؟“ (۹) انخی کے خربوزے ایسے اچھے ہوتے ہیں کہ دنیا میں نظیر نہیں رکھتے۔“ بابر ان پر وزن، سرنی مائل خربوزوں کو عمر بھر نہیں بھولا۔ واقعی وہ ایسے بامزہ ہوتے تھے کہ لوگ انہیں امیر تیمور کے خربوزے کہنے لگے تھے۔ (۱۰) مگر اس کا باپ انخی چھوڑ کر اہل و عیال کے ساتھ وادی کے مشرقی سرے پر اندجان میں جا رہا۔ وہاں بابر کو کوئی چیز دل کشی کی نظر نہ آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے فصیل کے اندر کی بستی بہت گنجان تھی کیونکہ وہ لکھتا ہے اس کے کوچہ و بازار اس راستے کے سرے تک چڑھے چلے آئے تھے جو قلعہ کے گرد بنا ہوا تھا۔ قلعہ کی خندق کا کام ایک چھوٹی ندی انجام دیتی تھی اور اسی کی بدولت تھوڑے دن بابر کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی تھی۔

اندجان کے میوہ باغ میں بابر استاد کے آگے دو زانو بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ جاڑوں میں ایوان کے اندر جسے بڑی اگیکیاں گرم کرتی تھیں، پڑھائی ہوتی۔ بے شبہ اس نے پڑھائی پر بہت محنت کی ہوگی کہ گیارہ سال کی عمر تک اتنا کچھ پڑھ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد تو اسے تعلیم پانے کی فرصت ہی کہاں ملی۔ استاد اسے اور اس کے چھوٹے محلاتی بھائیوں کو حساب کے مسائل، ستاروں کے نقشے، اسلامی تعلیمات ذہن نشین کراتا اور خاندان کی کئی پشت کی تاریخ، تیمور و چغتائی تک پڑھاتا تھا۔ بابر کی فطرت میں تجسس بھرا تھا، بہت جلد اس نے حافظے میں معلومات کا ایک خزانہ جمع کر لیا۔ اس کی تیز نگاہ سے یہ بات بھی مخفی نہیں رہی کہ اخوند جو پڑھانے میں تشدد کرتا تھا، کردار میں اتنا کمزور تھا کہ قبول صورت لوندوں کو

ساتھ سنانے پر پھسلاتا تھا۔ ایک اور استاد کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ بھی شہوت پرست، فریبی، ریاکار آدمی تھا۔“

نوعمر بابر کے گرد و پیش تین زبانیں بولی جاتی تھیں۔ لہذا اسے دیہات کی پرانی ترکی، کوچہ و بازار کی فارسی بولی اور اہل علم کی فصیح فارسی اور عربی پر قدرت حاصل کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی۔ وہ ضلع جگت سن کو بہت خوش ہوتا تھا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کے حال سے کمال دلچسپی تھی۔ اب اپنی وادی کے باشندوں کو وہ بزرگان دین، خواجگان کے اقوال اور شعرا کے اشعار سنانے لگا تھا۔ شاہ نامے کی مترنم ابیات میں اسے بہادر شاہ و شہریار کی فتح و شکست کے افسانے ایسے معلوم ہوتے گویا ان وادیوں میں جو اس کی وادی سے کچھ بڑی تھیں، ابھی ابھی یہ واقعات گزرے ہیں۔ اس کا مزاج حقیقت پسند تھا، جو چیز عجیب اور پراسرار معلوم ہوتی اس کی ٹوہ لگاتا تھا۔ اندجان کے قلعے میں چند کتابیں عجیب معلومات سے پر تھیں مگر بابر ابھی ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ رومیؒ کا الہامی کلام ستارے بھرے آسمان کے پار کی خبریں سنانا تھا اور ان غیبی ہستیوں کی، جن کا کوئی نام نہیں۔۔۔۔۔ وہ جو کبھی کبھی کسی کو خواب میں نظر آ جاتی ہیں۔ اس کا باپ نشے میں گرما کر مثنوی کو جھوم جھوم کے خوب پڑھ سکتا تھا لیکن جب اس کے معارف بیان کرنے چاہتا تو زار و قطار آنسو جاری ہو جاتے۔ وہ اپنے بیٹے کو اسی قدر بتا سکا کہ ایک قطب الاقطاب حضرت احراریؒ ایسے بزرگ ہیں (۱۱) جو اسرار حیات کی شرح کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ وہ درست شکستہ در اندجان میں کبھی نہیں آئے۔ عمر شیخ میرزا کے قلعے میں فقط آدھ گردن جوئی البتہ آ جایا کرتے تھے۔ انہیں خوب کھانے کھلائے جاتے اور وہ چند سکوں کے عوض آئندہ کی خبریں سنا دیا کرتے تھے۔

رات کو گھر والوں کی باتیں سن سن کر یہ بھی بابر کے ذہن نشین ہو گیا کہ اس کے چچا جو دور کے شہروں میں رہتے ہیں، ان کے گھروں کا حال بھی اندجان ہی جیسا ہے۔ فنون سپہ گری میں مہارت اور اعلیٰ درجے کے سامان عیش و طرب کے ذوق شوق کے باوجود ابو سعید میرزا کے چاروں بیٹے کچھ بہت دولت و مال نہ رکھتے تھے۔ شعرا جو ان کی مدح میں قصیدے کہتے، حضرت رومیؒ کے مرتبے کے نہ تھے کہ ان کی بات کا یقین کیا جائے۔ چاروں شہزادے مانگے کی ناموری پر بسر کرتے تھے۔ وہ شاہ خرچ، ناعاقبت اندیش اور کچھ اسی قسم کے قسمت آزما من چلے تھے۔ جنہیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور لوٹ کھانے کا شوق ہوتا

ہے۔

عمر شیخ میرزا نے صیغہ راز میں بیٹے کو سمرقند اور موروثی تخت، نیز میدانی علاقے کے تاشقند پر قبضہ کرنے کے منصوبے بھی سنائے۔ وہ خود اچھا تیر انداز یا شہ سوار نہ تھا مگر بیٹے کو دس برس کی عمر سے سپہ گری سکھانے پر مصر تھا۔ چنانچہ بابر کو دربار کے ماہرین جنگ کی شاگردی میں دے دیا گیا اگرچہ اس نے اپنی کتابی تعلیم ہاتھ سے نہیں دی۔ یہ جنگی تربیت آئے دن شکار کھیلنے یا کبھی کبھی ان جنگی تاختوں میں شریک رہنے سے ہوتی تھی جو اس کے باپ کے نقشے پر دریا پار کی جاتی تھیں۔ کیونکہ کوہستان کے شرفاء میں معرکہ آرائی فقط میدانوں میں یا صف بند لشکروں سے نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ کسی وقت بھی کسی مقام پر ہو سکتی تھی۔ بابر کے اتالیقوں نے بخوبی سمجھا دیا تھا کہ اسے ہمہ وقت، خصوصاً جو وقت اس کے حق میں نہایت تکلیف دہ ہو، ایسی معرکہ آرائی متوقع سمجھنی چاہئے مثلاً سوتے میں یا سیب چختے میں۔ ایک بہادر مگر ذرا موٹی عقل کا جنگ آزما سلاخ کے عرف سے مشہور تھا۔ (۱۲) اس نے بابر کو سواری کی حالت میں ڈھیلی زرہ اور ہلکا خود پہن کر لڑنا سکھایا تھا۔ سواری کے بغیر تو آدمی کسی شمار قطار ہی میں نہیں رہتا۔ اس نے گھوڑے پر سے تلوار گھمانے اور دشمن کے وار سے بچنے میں ڈھال کو حرکت دینے کی مشق کرا دی تھی۔ ایک چھوٹی ترکمانی کمان سے آگے یا پیچھے کے رخ بھاگتی چیز پر کس طرح نشانہ لگاتے ہیں، یہ ہنر بھی بابر سیکھ گیا تھا۔ استاد سلاخ عمر شیخ میرزا کی ملازمت میں آنے سے پہلے یونس خاں کا آفاقی (۱۳) رہا تھا۔

بھورے بال والا سردار قاسم محل سرا کا داروغہ تھا، اسے دست بدست جنگ کی زیادہ فکر نہ تھی۔ اس کا قول تھا کہ گلہ بان داؤد شمشیر زن جالوت سے زیادہ عاقل تھے۔ بابر کو بھی دشمن کو تیز رفتار تیر سے پہلی ضرب لگا کر بیکار کر دینے کی ترکیب سیکھنی چاہئے۔ بابر نے یہ نکتہ فراموش نہیں کیا لیکن وہ سردار قاسم بیگ کو اتنا بھروسے کے لائق نہیں سمجھتا تھا جتنا لالہ بالی مگر وفادار سلاخ کو۔ اصل میں اونچے رتبے کے امیر جو خود بھی طلب جاہ سے خالی نہ تھے، ان پر اتنا اعتماد کیا بھی نہ جاسکتا تھا، جتنا معمولی ملازمین پر۔ ایک اور امیر پیر یعقوب نے گھٹنے کے زور سے گھوڑا چلانے، دوڑانے کے گر سکھائے۔ اس نے کہا اگر تم پھرتی سے حرکت کرو گے تو دشمن کا آسانی سے ہدف نہیں بن سکتے۔ یہ حسن (۱۴) یعقوب بیگ اچھا دلیر، جھگڑالو آدمی تھا۔ لڑکوں کے ساتھ چوگان یا گھوڑی کا کھیل کھیلنے میں شریک ہو جاتا اور

انہیں چھیڑنا، چڑاتا رہتا تھا۔ اس نے بابر کو یہ بات بھی سنا دی تھی کہ اگر تمہارے سر پر عقاب کلاں کا سایہ نہ ہوا تو کالے کوئے تمہاری ہڈیاں کھائیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر نو عمر شہزادے کو محافظ اور پشت پناہ نہ ملے تو سر رہ بھیک مانگنے والوں کی طرح مارا جائے گا۔ حسن یعقوب اسی طرح کے ذو معنیں شعر بھی خود کہا کرتا تھا۔

قاسم بیگ کہ ناخواندہ آدمی تھا، متنبہ کرنے میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ ۱۱۴۹ء کی گرمیوں میں جب کہ فصلیں تیار، چرائی بھی اچھی تھی۔ قاسم کو خطرہ پیدا ہوا، جو اوروں کو نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ بابر کے سب سے بڑے چچا سلطان احمد اور یونس خاں کے فرزند اکبر محمود خاں میں قول و قرار ہو گئے ہیں اور یہ دونوں گھوڑے چرانے نکلے ہیں لیکن فرغانہ کے رخ بڑھ رہے ہیں اور درحقیقت یہ ان کی لشکر کشی ہے۔ ادھر عمر شیخ میرزا والی فرغانہ جسے اپنے لشکر کو جمع اور ہتھیار بند کرنے کی ضرورت تھی، فصلیں اور اپنے کبوتر دیکھتے اندجان سے چل دیا اور دارالملک ایک قاضی صاحب کے سپرد کر گیا جو نہایت مقدس مگر بالکل غیر عسکری قسم کے بزرگ تھے۔ ان بزرگوار نے رنگین مزاج حسن یعقوب اور عیار طبع قاسم بیگ کی بات نہیں مانی۔ قاضی کا خاندان سرقند میں بھی اپنے تقویٰ طہارت کی بنا پر ”قابل احترام مانا جاتا تھا۔ انہوں نے فرمایا اصل محافظ مشیت الہی ہے اور حکم خدا کے سوا اور کوئی قانون ماننے کے لائق نہیں۔ اور یہ کہ آگے چل کر خود بابر پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ بابر دل میں سوچنے لگا کہ خود اس کے باپ پر بھی یہ حقیقت کبھی کھلی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ جو اپنی ساری پاک طینتی اور دوستوں میں خوش طبعی کے باوصف ابھی تک ایفون نوشی اور نرم و قمار کے ممنوعہ اشغال سے دل بہلاتا رہتا تھا۔

اب جو اپنا کبوتر خانہ دیکھنے وہ اخی گیا ہوا تھا، گرمیوں کے ایک صاف دن میں بابر باز شکرے اور چند یار دوستوں کو لے کر اندجان سے باہر ایک پہاڑی باغ کی طرف روانہ ہوا کہ شکار کے ساتھ وہاں کی بارہ دری میں بیٹھ کر آرام بھی کر لیں گے (باپ کبوتروں کے قریب باز وغیرہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا تھا) یہ دو شنبہ (پیر) کا دن تھا اور باغ ہی میں ایک قاصد مارا اس کے پاس پہنچا۔ بابر لکھتا ہے کہ ”عجیب سانحہ پیش آیا۔ پہاڑ کی چوٹی سے اخی کا کبوتر خانہ کبوتروں اور عمر شیخ میرزا سمیت نیچے گرا اور اسی کے ساتھ میرزا کی روح عالم بالا کی کو پرواز کر گئی۔“ پھر صراحت کرتا ہے کہ ”اس مہینے بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ ہو گیا۔“

خزف ساحل کی طرح لڑھکتے پھرنا

خبر سن کر بابر نے پہلے ارادہ کیا کہ محل سرا کو جائے۔ وہ عمل فوراً کرتا تھا، سوچتا بعد میں تھا۔ چنانچہ شکرا ایک نوکر کے حوالے کیا اور سوار ہو کر سرپٹ باغ سے چلا۔ ساتھی پیچھے پیچھے آتے رہے۔

شہر کے بازار میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے سے محل کا ایک مہتمم آیا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر خبردار کیا کہ قلعے میں نہ جاؤ، ممکن ہے قید کر لئے جاؤ۔ عمر شیخ کے مرنے سے وادی فرغانہ چوٹ پڑی رہ گئی تھی کہ کوئی بھی رئیس امیر جس کی جمعیت مضبوط ہو اور مرحوم والی کے خاندان کی وفاداری بالائے طاق رکھنا چاہے، وہی اس کو اچک لے۔ اب بابر اور آنے والا سردار دونوں شہر کے پار عید گاہ (۱۵) کی طرف چل پڑے۔ جس کے باہر نیلوں سے جنوبی کوستان کو راستہ جاتا تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر بابر آزاد رہتا اور انتظار کر سکتا تھا کہ واقعات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن عید گاہ کے قریب ایک قدیم ملازم نے انہیں آ لیا اور پیام دیا کہ قائم مقام قاضی نے کہا ہے کہ بابر سیدھا شاہی دیوان میں آئے۔ بابر بلا تاخیر وہاں گیا اور دیکھا کہ وہ بزرگ قاضی معدودے چند وفادار عمائد کے ساتھ یہ بحث اور ہر پہلو پر گفتگو کر رہا ہے کہ نو عمر لڑکے کے لئے کیا کیا جائے جو خود حکمرانی کے قابل نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان کا ایک تاریخ نویس لکھتا ہے کہ اس وقت بابر کی حالت ”ساحل کے خزف کی سی تھی جو ہوا سے ادھر ادھر لڑھکتا پھرتا ہو۔“

اسے ان فوجی سرداروں کی جنہیں عمر شیخ میرزا نے جاگیریں دے رکھی تھیں، مدد کا ایک سارا نظر آتا تھا ورنہ حالات بہت ہی خراب تھے۔ لالہ بابی باپ نے اپنے طاقتور رشتہ داروں سے جھگڑے مول لئے تھے، اب وہ سب بابر کو متوارث ہوئے۔ ان عزیزوں میں سب سے اول تو بڑا چچا احمد تھا جو سمرقند سے بڑھا آتا تھا اور فرغانہ کے مغربی قصبات نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اب وہ اندجان پر پیش قدمی کر رہا تھا اور ادھر اس کا حلیف، یونس خاں کا بڑا بیٹا سیر دریا سے اوپر چل کے قلعہ اخسی کی طرف آ رہا تھا جہاں بابر کی ماں اور چھوٹا علاقائی بھائی گھرے رہ گئے تھے۔ کچھ اور دشمن جاگیرداروں کو مشرقی پہاڑوں کے ایک درے میں چین کی کاروائی شاہراہ پر دیکھا گیا تھا۔

قاضی نے حملے روکنے کی پریشان گفتار تجویزوں کو رد کر دیا اور کہا کہ خورد سال بادشاہ

کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار ہے کہ اپنے چچا احمد، والئی سمرقند سے جس کی لڑکی بابر سے منسوب ہو چکی تھی اور حملہ آوروں میں وہی سب سے طاقتور ہونے کے ساتھ کریم الغنص بھی تھا، مدد کی التجا کرے اور پھر معاملہ خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔ بابر نے یہ رائے فوراً مان لی۔ کچھ عرصہ بعد اپنے چہل سالہ چچا سلطان احمد کی کس چابک دستی سے یہ تصویر کھینچی ہے :

”وہ ذہن و ذکا سے خالی، سیدھا سادہ ترک تھا۔ احتیاط سے بل دے کے پگڑی باندھتا۔ پابندی سے بیچ و تہ نماز ادا کرتا۔ حتیٰ کہ نانوش کے جلسوں میں بھی جن کا سلسلہ ۲۰، ۳۰ دن تک چلتا وہ یہ فریضہ ترک نہ کرتا تھا۔ پھر وہ اتنے ہی دن تک شراب کو منہ نہ لگاتا اور اس کی جگہ تیز مسالے (۱۶) کے کھانے کھاتا تھا۔ شہر میں پلا، بڑھا مگر کوئی تعلیم نہیں پائی۔ انصاف پسند آدمی تھا اور ہر قانونی مسئلے میں اپنے پیرو مرشد سے مشورہ کرتا۔ داد رسی کے وقت اخلاق اور آداب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ زانو تک نہیں بدلتا تھا۔ البتہ ایک دفعہ جب فرش کے نیچے ہڈی نکلی، اس نے پہلو بدلا۔ بہت اچھا تیر انداز تھا کہ میدان کے پار گھوڑا دوڑاتے میں بانس پر رکھے ہوئے سب (۱۷) پر بار بار ٹھیک نشانہ لگاتا تھا۔ آگے چل کر جب تن توش زیادہ ہو گیا تو سلطان احمد میرزا نے گھوڑے پر شکار کھیلنا چھوڑ دیا۔ صرف شاہین اور جرے سے تیز بیر شکار کراتا تھا۔ فطرتاً ”سادہ مزاج، کم خن، بالکل اپنے خوانین کی رائے پر چلنے والا۔ خرچ کرنے میں جان چراتا تھا۔“

قاضی کی نصیحت کے مطابق بابر نے جلدی سے ایک سفیر سلطان احمد کی خدمت میں روانہ کیا اور ”فرزند اور خادم“ کی حیثیت سے اظہار اطاعت کے ساتھ صرف اپنے شہر پر بدستور حاکم رہنے کی درخواست کی۔ نیک دل احمد یہ پیش کش قبول کر لیتا لیکن اس کے سرداروں نے ایک لڑکے کی، جو قابو میں آ چکا تھا۔ شریں ماننا محض لایعنی خیال کیا۔ سفارت ناکام رہی۔ احمد کے رسالے سیدھے اندجان کی طرف چل پڑے۔

یہ شہر خوش فضا، گرد ہرے بھرے کھیت، تجارت کی گرم بازاری تھی لیکن قلعہ بند تھا۔ ندی کے کنارے اس کا بالاحصار بھی نیچا بنا ہوا تھا۔ گرد کی خندق پاٹ کر، اوپر بازار سا بن گیا تھا۔ ادھر اکثر باشندے بھی ایک لڑکے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار نہیں نظر آتے تھے۔ یہاں کے عام لوگ سوداگر ہوں، اہل حرفہ یا کسان عموماً تاجیک، قدیم سے اسی سرزمین پر بے ہوئے تھے اور صدیوں سے بازار پار کے جو مغل، ترک، تار حملہ آور ہوتے اور

حکومت جلاتے رہے ان کی باہمی جنگوں میں حصہ نہ لیتے تھے۔ امیر امرا مسلح عسکری جو بابر کی رفاقت میں جمع ہوئے (حسن یعقوب بھی ان میں تھا) وہ حصار کی فسیل کے رخنے بند کرنے اور شہر کی منڈی سے اجناس خوردنی فراہم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس عرصے میں سلاخ نے عماند کو ترغیب دی کہ اپنے چھوٹے سے بادشاہ کو لے کر چلیں اور کم سے کم دیکھیں تو سہی کہ دشمن کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر جمعیت نکل کر چلی۔ قاضی صاحب نے دعا دی ”خدا اس کا انجام بخیر کرے۔“

شام تک یہ جماعت ایک دھنسی ہوئی ندی کے کنارے پہنچی اور دوسرے کنارے پر سلطان احمد کے رسالوں کا کالا دل بادل معاہدہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ گذرا اس نے بابر پر بہت گہرا اثر کیا۔

سمرقندی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے، انہوں نے جو اندجان والوں کو دوسرے کنارے پر دیکھا تو ایک دم ندی کی طرف دوڑے۔ گدلے پانی کی اس دھار پر پتلا سا پل تھا اور دونوں کناروں پر دلدل تھی۔ اب جو ریلے پر ریلا پل پر آیا تو گھوڑے کچھ پانی میں گرے اور اونٹوں نے بھاگنا، بے حواسی میں دولتیاں جھاڑنی شروع کیں۔ رات کا اندھیرا ہونے تک کوئی سردار یا سالار اس طوفان بے تمیزی کو قابو میں نہ لا سکا۔ رات آنے پر سمرقندی سپاہ نے اپنے مضروب ساتھیوں کو سنبھالا اور واپس چل دی۔ اور پھر دوسرے دن بھی نظر نہیں آئی۔ تجربہ کار سرداروں نے بابر کو بتایا کہ سمرقند کی ایک فوج پہلے بھی اس پل پر مصیبت اٹھا چکی ہے۔ وہی لوگوں کو اب یہ خوف ہوا کہ یہاں جو لوگ پہلے مرے تھے ان کی روحمیں لڑنے آگئی ہیں۔ مشیروں نے احمد کو رائے دی کہ وہ خود اور بہت سے سپاہی علیل ہو گئے ہیں واپس چلنا چاہئے اور نیک مزاج بادشاہ نے پھر ان کا مشورہ قبول کر لیا۔ مگر اثر پذیر حساس بابر نے یہی اعتقاد کیا کہ دشمن سے پہلے مقابلے میں خدائے تعالیٰ نے میری مدد کی۔

ادھر پل کی اس عجیب و غریب شکست نے اخی کی قسمت پر بھی اثر کیا کہ یہاں جو اندجان کے خلاف سابقہ دار الحکومت ہونے کی وجہ سے بلند پہاڑی پر مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا، اس میں عمر شیخ میرزا کے سرداروں نے ڈٹ کر یونس خاں کے بیٹے کا مقابلہ کیا۔ پھر جب اس نے سنا کہ سلطان احمد فرغانہ سے واپس چلا گیا تو خود بھی الٹا پھر گیا۔ اس طرح چند حوصلہ مند بہادروں کے جے رہنے سے (جون میں) وادی کا مشرقی حصہ بھی بابر کے پاس رہا

اور وہ اس موقع پر جرات دکھانے سے جو فائدہ ہوا تھا، اسے عمر بھر نہیں بھولا۔

اس واقعہ کے بعد ہی بابر بہت جلد آخری باپ کی قبر پر گیا۔ یہ پہاڑی کی چوٹی پر بنی تھی۔ کبوتر خانہ ٹوٹ جانے سے پالتو کبوتر بے گھرے رہ گئے اور ادھر ادھر دیواروں پر اڑ رہے تھے۔ عمر شیخ روز انہیں دانہ ڈالتا تھا۔ بابر نے خیال کیا کہ ”مرحوم کا فیض عام تھا اسی طرح اس کی روح کی برکت وسیع ہو گی۔“ اس نے فاتحہ پڑھی، قبر کے گرد پھرتا رہا پھر فقیروں کو جو اسی امید میں کثرت سے جمع ہو گئے تھے حسب دستور خیرات تقسیم کی۔ چلنے سے پہلے ایک شکاری کو حکم دیا کہ کبوتروں کو روزانہ دانہ کھلایا کرے۔

بابر کے بہت سے سپاہی مشرقی دروں سے حملہ آوروں کو نکلنے گئے وہ خود اہل محل کو لے کر واپس اندجان آیا جہاں اس کی ماں عدت میں گوشہ نشین ہوئی۔ یوں بھی وہ خاموشی پسند عورت تھی اور اپنے بچوں کے بے قابو مزاج پر انہیں سمجھانے، فہمائش کرنے کی بجائے دل میں گھٹا کرتی تھی۔ ہوش مند ثانی کا یہ حال نہ تھا۔ بابر رائے زنی کرتا ہے کہ ”عقل سلیم اور فراست میں بہت کم سمجھوتہیں شہزادی ایسان دولت کی مثل ہوں گی۔ وہ بہت دور کی بات دیکھ لیتی اور اسے جانچ لیتی تھی۔“ یہ بالاحصار کے دروازے کے برج میں آ رہی کہ آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔ بابر کے خاص خاص دوستوں سے اخلاص و محبت کرنے پر اعتراض کرتی اور ایک پرانی مثل سنایا کرتی تھی کہ ”بادشاہی کوئی رشتہ کنبہ نہیں جانتی۔“ اسے چوگان کے کھلاڑی، ظریف الطبع حسن یعقوب کے وزیر بنائے جانے پر بھی اعتراض تھا۔ فرمانہ میں صرف حسن (۱۸) ایسا شخص تھا جس نے سمرقند کے اکابر سے صلح صفائی کا راستہ نکال لیا اور ادھر سے بھی گویا اظہار دوستی کے لئے اس ایک شادی کے جشن میں شرکت کی دعوت بھیجی گئی تھی۔ اپنے دید بان سے ایسان یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے محترم قاضی صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ پھر تند مزاج قاسم کو طلب کیا اور آخر بابر کو بلا کر برا بھلا کہا۔ اسے خود رائے قرار دیا اور یہ کہ لوگوں کے کہنے سننے میں آ جاتا ہے مگر جس بات کو خود کرنا نہ چاہے اسے کسی کے مشورے سے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بخلاف بابر کے، اس کا علاقائی بھائی جمالتگیر (اور یہ نام آل تیمور میں بہت مقبول تھا) جس کی دس برس کی عمر تھی، حسن یعقوب جیسے اقتدار طلب وزیر کے بلا دقت قابو میں رہ سکتا تھا۔ پھر بابر سے ایسان نے تقاضا کیا کہ نئے بادشاہ کا سب سے پہلا کام کرنے میں دیر نہ لگائے اور وہ یہ کہ اپنے چھوٹے بڑے جملہ متوسلین کو اراضی عطا کرے اور بادشاہ کے

متعلق ان کی خدمات و فرائض انہیں بتائے۔ یہ کام خاطر خواہ ہو گیا تو خوانین اس کے وفادار رہیں گے۔ بابر کو اس بارے میں تامل تھا اور ادھر حسن یعقوب نے اپنا احسان مند بنانا شروع کر دیا تھا۔

بابر نے ثانی سے کہا کہ حسن یعقوب نے سمرقند والوں سے سردست صلح کرا کے ہمیں فائدہ پہنچایا اور خود ان کے بلاوے پر بھی سمرقند جانے سے انکار کر دیا، ایسے شخص کے ساتھ کیوں بدگمانی کی جائے؟ مگر ایسان کے نزدیک بابر کا اسے قابل اعتماد سمجھنا محض اس وجہ سے تھا کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ سارے اندجان میں تنہا حسن یعقوب سمرقند کے قاصدوں سے گفت و شنید کیا کرتا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ موقع ہاتھ آتے ہی امرائے سمرقند کی مدد سے وہ عمر شیخ کے فرزند اکبر کو الگ کر کے جہانگیر کو اس کی بجائے کٹ پتلی بادشاہ کے طور پر تخت نشین کر سکتا ہے۔

سلطان علی کا غائب ہونا

آئندہ ایام میں بابر نے دیکھا کہ یعقوب اپنا کام خوب انجام دے رہا ہے لیکن بعض پرانے سپاہیوں کے ساتھ نخوت سے پیش آیا اور انہوں نے قلعے میں آنا موقوف کر دیا۔ ایسان کی نگاہ اور دور تک جاتی تھی۔ اس نے قاضی، اور قاسم بیک کے ساتھ شاکی سرداروں کو بلایا۔ پھر بادشاہ سے پوچھے بغیر یہ لوگ مسلح ساتھیوں کو لے کر حسن یعقوب کی تلاش میں گئے مگر بالاحصار کے ایوان میں وہ کہیں نہیں ملا۔

اصل میں بابر کا یہ ظریف وزیر شر کے عید گاہ دروازے سے ندی کے پار سمرقند کی سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ قاسم بیک نے ادھر ادھر سے کچھ سپاہی جمع کئے اور تعاقب کرنے چلا تو معلوم ہوا کہ حسن یعقوب ایک جمعیت فراہم کر کے اخی کی طرف مڑ گیا ہے کہ اس قلعے کو اچانک جا دبائے اور پھر اپنے متوقع سمرقندی حلیفوں سے صلہ حاصل کرے۔ لیکن اب ایک اور تقدیری واقع یہ پیش آیا کہ حسن یعقوب نے ضابطہ پسند قاسم کو دھوکا دیا اور پھیر کھا کے اس کے پڑاؤ پر شیخون مارا مگر اندھیرے میں خود اپنے ایک ساتھی کا تیر کھا کے، کو لے ایسے زخمی ہوئے کہ گھوڑے پر چڑھنے کے قابل نہ رہا اور پھر اسی رستائیں میں گھوڑوں کی روند میں آکر ہلاک ہو گیا۔ بابر کی حتمی رائے ہوئی کہ ”اس طرح تقدیر الہی اس کی دغا بازی کا انتقام لینے کی ناک میں تھی۔“ پھر طفلانہ جوش میں بابر نے پختہ ارادہ کر

لیا کہ کمال تقویٰ کی زندگی گزارے گا۔ چنانچہ مشتبہ کھانوں (۱۹) سے پرہیز کیا۔ چچے، دستر خوان تک پاک و طاہر رکھنے پر توجہ کی۔ پچھلے پہر کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے لگا۔ اس نے قاسم بیگ کو محل سرا کا آغا اور اپنے شہر اندجان کا حاکم مقرر کیا۔ ایساں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

خزاں میں اس مرتبہ برف نے وادی فرغانہ کے راستے بند کر دیئے تھے۔ نو عمر بادشاہ کو چند ماہ اطمینان رہا لیکن آئندہ سال (۱۳۹۵ء) باہر سے بری بری خبریں آنے لگیں۔ سمرقند میں شریف مزاج اور بیکار شہریار سلطان احمد میرزا کا انتقال ہو گیا جو امیر تیمور کی بادشاہی کی آخری پرچھائیں تھا۔ کوہستانی ولایات میں عمر شیخ اور اس کے بھائیوں کے زمانے ہی میں حالات ابتر و پرآگندہ ہو گئے تھے۔ اب بھائی بھتیجیوں کے جھگڑوں نے جن میں سے ہر ایک فوجی جمیعت رکھتا اور تیموری وراثت کا دعویٰ دار تھا، انہیں اور بھی خراب و یاس انگیز بنا دیا۔ ادھر جیوں پار کی خطرناک مغل ٹولیاں نمودار ہونے لگیں جنہیں زمین یا لوٹ کی تلاش تھی۔ خود سمرقند ایک فصیل بند اکھاڑا بن گیا جس میں سازش دعا بازی کے ساتھ سرگرم کار تھی اور شہر والوں کو لوٹ مار سے بچنے کی پڑی تھی۔ لیرے سربازار غنی نئی بد معاشیاں دکھا رہے تھے۔ سپاہی لوگ جو شہر کے مالک بنے ہوئے تھے طرح طرح کے شرمناک سانگ بھنڈیوں سے کراتے اور سرعام امردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکرڑتے پھرتے تھے۔ باہر کا بیان ہے کہ ”کوئی شخص بغیر امد کے نہیں نظر آتا تھا۔ لوگ رات کے وقت اپنے رضاعی بھائیوں کے بچوں تک کو اٹھالے جاتے تھے۔“

بابر نے سمرقند کی بد نظمی کا تاریک نقشہ کھینچا ہے۔ وہ جن کو پسند نہیں کرتا ان کی خبر یعنی خوب جانتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اب ایک نیا عزم اسے تحریک میں لا رہا تھا۔ عمر شیخ میرزا کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان احمد کی وفات ایک شگون معلوم ہونے لگی تھی۔ ریشہ دوانی کرنے میں اسے مہارت نہ تھی اور سازشوں سے جب تک اس کے مفید مطلب نہ ہوں، الگ رہتا تھا۔ اس میں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کا ملکہ خداداد تھا اور ثانی کو تنبیہ کے باوجود اس صفت پر بھروسہ کرتا تھا۔ ایساں اور بابر کی ماں دونوں کو گذشت اقبال مندی کا غم تھا جب کہ عمر شیخ کی فرغانہ کے پار دور دور تک حکمرانی تھی اور انہوں نے بڑے بڑے درباروں کے ناز و نعم دیکھے تھے جو اب قصہ پارینہ ہو چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ فرغانہ کا الگ تھلک ہو جانا ایک طرح کی وقتی حفاظت کا باعث ہوا تھا۔ مگر یہ بیسیاں اس حفاظت

کی پائیداری پر شک رکھتی تھیں۔

انہی اثرات کے تحت باہر نے اپنا ایک مقصد سب سے الگ بنایا۔ وہ یہ کہ سمرقند کو لینے کے لئے جان و مال کی بازی لگا دے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اندجان میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تخت شاہی حاصل کرنا ہے تو وہ تیمور کا تخت ہونا چاہئے۔

اس کے حالات پر نظر کیجئے تو اس ہوس کا پورا ہونا غیر ممکن بات تھی۔ مگر اس کوشش کے سلسلے میں لڑکے نے ایک عزم مصمم کی ضرورت پرورش کر لی۔ دو سال ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کے متبعین دو ایک سرحدی بستیاں لینے کے سوا اور کچھ کامیابی نہ پاسکے۔ تاہم بعض نکالے ہوئے امیر اور کچھ گشت لگانے والے ضرور اس کے پاس پہنچے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے اپنی آمد کی باقاعدہ خبر کرا دی تھی۔ نو عمر باہر نے بھی تازہ وارد بھرتی ہونے والوں کی خاصی طرح دہراری پذیرائی کی: ”میں ایک شہ نشین پر تنکے لگا کے بیٹھا جیسی کہ سلاطین تیموری کی رسم ہے اور جب یہ چھوٹے چھوٹے ملوک قریب آئے تو اٹھ کر تعظیم دی، بغل گیر ہوا اور مسند پر اپنی دائیں جانب انہیں جگہ دی۔“

مغل رنکروٹ کوئی حکم نہیں مانتے تھے۔ باہر نے قاسم سے کہا کہ ان میں سے دو چار کو قتل کر دے کہ دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ قاسم نے حکم کی تعمیل کی لیکن چند سال بعد انہی مغل سپاہیوں کے خون کا بدلہ خون کے خوف سے اسے باہر کی نوکری چھوڑنی پڑی۔

اس اثنا میں سمرقند کے مجازلات سے باہر کو ایک نفع یہ ہوا کہ وہاں کے شکست خوردہ سپاہی اس کی فوج میں آنے لگے جس میں بہر حال استقامت تھی۔ اس کے ایک عم زاد بھائی سلطان علی میرزا کو اندھا کرنے کے لئے تہمتی سلاح آنکھوں سے چھوائی گئی تھی، وہ بھی بچ کر بھاگا اور محتاط لفظوں میں باہر کی طرف داری کرنے کا عہد و پیمان کیا۔ پھر جس طرح اس کے ساتھ قرارداد ہوئی تھی، گھاس خشک ہونے کے وقت، مئی ۱۳۹۷ء میں باہر نے سمرقند پر، خوانین کے مختصر گردہ، مسلح شہری اور جلو باشیوں کو لے کر پیش قدمی کی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر کو ایسان کے پاس چھوڑنے میں کچھ حرج نہیں سمجھا اور کوئی معتد علیہ نگرانی کے لئے نہیں چھوڑا۔ آئندہ ثابت ہوا کہ یہ بڑی فروگزاشت تھی۔

باہر نے خوشی خوشی سمرقند کی سرحد کی ندی پار کی۔ راستے میں کئی بستیاں لیں، جوان بھرتی کئے۔ خوش منظر پہاڑی گاؤں شیراز کے قریب کئی سواچھے مسلح سپاہی جن میں ایک دہلا

(۲۰) سردار بھی تھا، ملاقی ہوئے اور اس نے بطیب خاطر انہیں اپنی ملازمت میں شامل کیا۔ ایک مدت بعد معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لوگ پہاڑی گاؤں پر اسے روکنے کے لئے سمرقند سے بھیجے گئے تھے۔ اس کا اقراری حلیف سلطان علی مشرق سے نہ آیا۔ بابر نے اس کے غائب ہونے کی زیادہ فکر نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر پیدائشی قسمت آزما تھا مگر کسی سلطنت کی تعمیر کا اس میں مادہ نہ تھا۔ اس نے حکومت کرنا بھی زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر ہی سیکھا۔

شوال کا چاند دیکھ کر عید الفطر کا دکانہ ادا کر کے بابری لشکر آگے بڑھا اور ان پہاڑی باغوں میں ڈیرے ڈالے جہاں سے امیر تیمور کے قلعے کے چمکتے گنبد اور خاکی فصیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ اندر سے کچھ سلشور لڑنے نکلے۔ ان سے بابر کے دلیر تر سپاہیوں نے شمشیر زنی کی۔ ان کا غلبہ دیکھ کر بابر مسرور ہوا کیونکہ وہ ہر بات جو فال نیک کا پہلو رکھتی ہو اچھی طرح یاد رکھتا تھا۔ ایک دن سمرقند کے دو امیر جو شہر کے باہر چھتاتوں کے لئے لڑنے آئے تھے، زخمی ہوئے۔ ان میں سلطان تہنل کے برچھی لگی تھی مگر وہ گھوڑے سے نہیں گرا۔ البتہ دوسرا جو شہر کا بڑا قاضی تھا، (۲۱) گلے پر زخم کھا کے اسی وقت مر گیا۔ بابر نے روزنامے میں لکھا کہ ”وہ صاحب علم و فضل شخص تھا۔ ایک وقت میں میرے باپ نے اس کی بہت عزت حرمت کی اور اسے مہردار مقرر کیا تھا۔ وہ سب سے اچھا باز کا شکاری تھا اور کہہ رہا سے طرح طرح کے کرشمے دکھانے جانتا تھا۔“

نوعمر بابر کی اوہام پرستی بڑھ رہی تھی لیکن ایک عملی وجدان رکھتا تھا جس نے لڑے ہوئے سوداگروں کے معاملے میں اس کی صحیح رہنمائی کی۔ جب سے اس کا لشکر نواح شہر پر قابض ہوا انہیں آس پاس کے سرسبز علاقے کا دانہ چارہ افراط سے مل جاتا تھا جس کی شہر کے اندر فوجیوں میں نامیوری تھی۔ شہری اور تاجر جنہیں خانہ جنگی سے تعلق نہ تھا، بابر کے لشکر میں آنے جانے اور پڑاؤ کے بازار میں اجناس کا مبادلہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ایک دن بابر کے سپاہیوں پر طمع غالب ہوئی کہ انہوں نے ان تاجروں کا مال اسباب لوٹ لیا۔ اس پر قاسم بیگ اور خود بابر نے سپاہیوں سے مطالبہ کیا کہ سارا سامان جو لوٹا گیا ہے سمرقندیوں کو واپس کر دیا جائے اور ان کے ساتھ امن و صلح کی جو مفاہمت تھی، بدستور قائم رہے۔ چنانچہ ”دوسرے دن کی پہلی گھڑی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایک، تاکا اور ٹوٹی سوئی تک ان کے مالکوں کو بخشنے واپس کر دی گئی۔“ (لوٹ میں مغل تیر اندازوں کا بھی ہاتھ تھا۔ اب

جو سب سامان واپس کرنا پڑا تو اس بات کا بھی قاسم کی طرف سے کینہ ان کے دل میں مزید ہو گیا)

صرف ایک بار اندجان والوں نے مورچہ بند قلعے پر حملہ کیا، سو وہ بھی بارور نہ ہوا۔ بعض شہر والے انہیں رات کے وقت ”غار عشاق“ کے راستے بالاحصار تک لے چلے تھے لیکن جو لوگ ان رہبروں کے پیچھے پیچھے چلے وہ رات میں ایسی جگہ پھنسے جہاں قلعہ والے گھات میں بیٹھے تھے۔ باہر کے چند پرانے رفیق یہاں کھیت رہے۔

گر میاں ختم ہوئیں، سورج برج میزان کی طرف بڑھتا نظر آیا تو باہر کے سرداروں کو سردیاں گزرنے کی فکر ہوئی۔ طے پایا کہ کھلے پڑاؤ کو چھوڑ کر قریب کے ویران قلعوں میں قیام کیا جائے جہاں سپاہی چھتیں ڈال کر پناہ لے سکتے تھے۔ یہ منتقلی ہو رہی تھی کہ اسی رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس سے ممکن تھا کہ محاصرہ اسی وقت ختم ہو جائے۔ ہوا یہ کہ چارہ فراہم کرنے والے دوڑے ہوئے آئے اور خبر دی کہ مشرق کے راستے سے سواروں کا ایک لشکر آ رہا ہے۔ باہر کو امید ہوئی کہ شاید غائب ہونے والے حلیف ہوں لیکن ان کے پرچوں پر نئی طرح کی گھوڑوں کی دھن لٹک رہی تھیں۔ سب طے ہوئے تاریک نئے کی صورت میں، وہ قاتی لباس پہنے بغیر کسی ساز و سامان یا بہیر کے آ رہے تھے۔ نہ انہوں نے کوئی قاصد بھیج کر آنے کی اطلاع دی تھی۔ بارے باہر کے مغل سپاہیوں نے بہت جلد پہچان لیا کہ یہ دریا پار کا ازبک لشکر ہے۔ ساتھ ہی افواہ اڑ گئی کہ یہ نوجوان سلطان باسنفر کے بلائے ہوئے آئے ہیں جو اس وقت باہر کے مقابلے میں سر قند پر قابض تھا۔

جنگی فن فریب تو باہر کے حق میں سازگار نہیں ہوئے تھے لیکن ضرورت کے وقت فوری عمل کرنا اسے خوب آتا تھا۔ شاید اس کی بے خبری بھی اس وقت کار آمد ثابت ہوئی اور ممکن ہے اندجان کی ندی پر مٹھی بھر سپاہیوں سے مقابلہ کرنے میں جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہ اسے یاد آئی ہو کہ اس نے قریبی سواروں کو پکارا اور انہیں لے کر چپ چاپ آنے والے ازبکوں کے سامنے ایک بلندی پر جا کھڑا ہوا۔ اب یہ مقابلہ آپس کے بھائی بھائیوں کی آویزش نہیں تھی بلکہ پشتینی دشمنوں سے جنگ ٹھن رہی تھی۔ اندجان کے تمام سپاہی بہ عجلت اس کے جھنڈے کے نیچے ٹیلے پر جمع ہو گئے۔ ادھر ازبکوں کے سردار شیبانی خاں کو مشکوک صورت میں اندیشہ ہوا کہ کسی پھندے میں نہ پھنس جائے، لہذا اپنی فوج کو بڑھنے سے روک دیا۔ دن کے باقی حصے میں فریقین اسی طرح آمنے سامنے کھڑے رہے۔

ایک طرف بابر کے شہری سپاہی دوسری طرف خانہ بدوش لیبرے جو دارالحکومت کے بھگڑوں میں پاؤں اڑانے آئے تھے۔ شیبانی خاں بابر سے عمر میں بڑا تھا۔ وہ یونس خاں کو اپنے باپ کے قتل کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ رات ہوتے ازبک لشکر محفوظ پڑاؤ کے واسطے پیچھے ہٹ گیا اور جب اگلی صبح بھی قلعے کے اندر سے کسی فوج نے نکل کر ان سے ملنے کے اقدام نہ کیا تو وہ شمال کی طرف چمپت ہو گئے۔ بابر کی اپنے دور اندیش اور آئندہ بارہ برس میں غالب آنے والے حریف سے یہ پہلی مد بھیڑ تھی۔

سمرقند میں ایک سودن

مگر اس بلا جنگ مقابلے نے محصور شہر اسے جتا دیا۔ شہر پناہ کے اندر سامان خوراک کم ہو رہا تھا۔ سردیاں سر پر تھیں اور شہر والے باسفر کی حکومت کے تحت بہت مصائب جھیل چکے تھے۔ یہاں بابر کے سوداگروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک نے بھی ان کے خیالات پر اثر ڈالا۔ ازبکوں کے باسفر کی مدد پر آجانے کا خوف بھی دور ہوا۔ اب اس کے امرا اپنی ریاستوں کو جانے کے لئے کھسکنا شروع ہوئے اور پھر خود باسفر چند صد رفیقوں کے ساتھ نکل کر راستے پر ہو لیا کہ اپنے خاندان کے دور دراز رہنے والے حامیوں کا دامن تھامے۔ اس کے جاتے ہی شہری اور نوجوان سوار جوق در جوق بابر کے سرمائی قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں جلو میں لے کر ہمارا شیر بالا حصار میں گھوڑے پر سوار داخل ہوا اور محل کے باغ میں اتر پڑا۔ اب وہ تیمور کے شہر اور اس کی وادی کا بلا شرکت مالک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا، خدا کی عنایت سے ہوا۔

عمر شیخ کے فرزند نے پائے تخت کا جہاں دس برس قبل بچہ سا آیا تھا، اب تفصیل سے جائزہ لیا۔ لکھتا ہے ”اتنے پسندیدہ محل وقوع کے شہر دنیا میں کم ہوں گے۔ تب ہی تو اس کی بنیاد سکندر نے رکھی اور یہ محفوظ شہر مشہور ہوا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کی کچی فسیل قدموں سے تاپی جائے۔ یہ پینائش دس ہزار چھ سو قدم نکلی۔“

بابر جب کسی مقام کی تفتیش کرتا تو اوپر کے طبقے سے شروع کرتا اور وہاں کی روایات و رسوم اور جو باتیں دل پسند ہوتیں، ان سب کو محفوظ کرتا تھا۔ سمرقند، فاضل حکما، فلاسفہ اور فقہاء کے ماثر کا خزانہ تھا۔ وہاں کے باشندے سنت والجماعت حنفی مذہب کے سچے اور پکے مسلمان تھے۔ اس کی ندی جو کوبک پہاڑی کے دامن میں بہتی ہوئی آتی تھی، اپنے رنج

ہوں سے پورے میدان کو سیراب کر دیتی تھی اور یہاں کی زرخیز مٹی میں نہایت ریلے سیب اور وہ گہرے رنگ کے انگور ہوتے تھے۔ جو (بہ تصحیح مترجم) صاجی موسوم تھے۔

”بالاحصار کے اندر امیر تیمور صاحب قرآن نے چار منزلہ محل تعمیر کیا تھا جو نیلے محل کے نام سے شہرہ آفاق ہوا۔ ”آہنی دروازے“ کے اندر پتھر کی عظیم جامع مسجد بنائی، جس کے دروازے پر آیت قرآن ”وہنا تقبل منا“ (۲۲) کندہ ہے۔ واقع میں یہ نہایت پر عظمت عمارت ہے۔“

شہر کے ایک دروازے کے قریب ایک مدرسے اور درویشوں کی خانقاہ کے آثار باقیہ تھے اور اسی احاطے کے اندر امیر تیمور اور اس کے اخلاف کے ”جنہوں نے سمرقند میں بادشاہی کی“ مقبرے تھے۔ عالم شادمانی میں بابر اپنے آپ کو بھی اسی درخشندہ زمرے میں تصور کر رہا تھا۔ اسی زمرے میں بزرگ فاتح کا وہ پوتا شامل تھا جس کا دنیائے علم و فضل میں نام روشن ہوا۔ یعنی الف بیگ، بطلیوس جغرافیہ نگار کی کتاب الجہتی کا شارح۔ ”اسی نے دامن کوہک میں سہ منزلہ رصد گاہ تعمیر کی تھی اور اسی رصد گاہ کی بدولت ستاروں کی وہ ”زیچ“ مرتب ہوئی جو آج کے دن تک مسلم و مستند مانی جاتی ہے۔“

علم ریاضی بابر کی دسترس سے باہر تھا لیکن ریاضی کے کمالات کی وہ قدر جانتا تھا کہ اس کے ذریعے ستاروں کے مقامات ماضی و مستقبل کی جدولیں بنائی جاسکتی ہیں۔ الف بیگ کے غیر معمولی حائظے کی یہ روایت بھی اسی نے سنی تھی کہ یہ شہزادہ جو کتب بینی کے ساتھ شکار کا بھی شوقین تھا، روزانہ اپنے شکاروں کی کیفیت روزنامے میں درج کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ سال بھر سے زیادہ کا روزنامہ کھو گیا تو الف بیگ نے حائظے سے اسے دوبارہ لکھوا دیا۔ پھر کچھ دن اتفاق سے گم شدہ روزنامہ مل گیا تو نئے لکھے ہوئے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف تین چار جانور جو وہ مار کر لایا تھا، دوبارہ لکھوانے میں چھوٹ گئے تھے۔

”کوہک کے دامن میں جانب مغرب ایک میدانی باغ کے اندر شان دار ”چل ستون“ کی دو منزلہ عمارت بنی ہوئی ہے کونے کے برجوں سے چار مینار اوپر نکالے گئے ہیں۔ ستون سب پتھر کے نئی نئی طرز سے تراشے ہوئے ہیں۔ بعض نالی والے، بعض پیچ در پیچ اور بعض میں دوسری ندرتیں ہیں۔ وسط میں وسیع ایوان بھی ستونوں پر قائم ہے۔ اوپر کی منزل میں چاروں طرف کھلی ہوئی غلام گردش بنائی ہے۔“

اسی طرح نو عمر فاتح نے رعایا کی تفریحی بارہ دری کا نقشہ کھینچا ہے جو ایک وسیع احاطے

کے اندر تھی اور ہر طرف چنار کے درختوں کا سایہ تھا۔ انہی کے نیچے لوگوں نے سنگ مرمر کی یہ عمارت بنائی تھی جس کے پتلے پتلے میناروں کے بیچ میں کاشانی چوکوں کا گنبد، سامنے ساکت پانی میں اپنا جھللاتا ہوا عکس ڈالتا تھا۔۔۔۔۔ یہ گویا تاج محل کا نقش اول تھا۔

عظیم تخت شاہی کا بابر نے غور سے معائنہ کیا۔ یہ ایک کوشک کے نیچے رکھا تھا اور پتھر کی ایک ہی بڑی ڈال کو تراش کر بنایا گیا تھا، جس کی لمبائی تیس فیٹ اور بلندی پندرہ فیٹ تھی۔ اس پر طرح طرح کے ابھرواں نقش و نگار تراشے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ ”یہ دیو پیکر چٹان بڑی دور سے لائی گئی تھی۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اسے یہاں قائم کرنے کے بعد اس میں درز آگئی ہے۔“

درز نے بابر کو تشویش میں ڈال دیا۔ دوسری نشانوں کے ساتھ یہ بھی آل تیمور کے زوال کی خبر دیتی تھی اس نے شمار کیا کہ صرف چار مختصر پشتوں ہی میں دس فرماں روا تخت سمرقند پر باضابطہ متمکن ہوئے اس کا غائب ہو جانے والا حلیف سلطان علی صرف ایک دو دن اور اس کا بھائی باسنغر چند ماہ بادشاہ رہے۔ بڑی کوشک کے گرد باغ میں ایک اور بارہ دری کی چھت پر چینی کے چوکے تھے۔ اسے جنگلی ازبک حملہ آوروں نے بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔ گو نئی مسجد کی شکستہ دیواروں کی کبھی مرمت نہ ہوئی تھی۔ بچپن میں بابر نے یہاں کے عجائبات دیکھے تو ان خرابیوں پر اس کی نظر نہیں گئی تھی۔ مگر مسجد کے چھوٹے ڈالان کے فرش پر اس نے پاؤں مارا تو اس وقت بھی وہی عجیب صدا ”لق لق“ (۲۳) گونجی۔ ”یہ حیرت ناک بات ہے اور کوئی شخص اس کا بھید نہیں جانتا۔“

بہر حال شہر کے تجارتی وسائل کا حساب کر کے بابر نے دل کو تسلی دے لی۔ سمرقند میں ہر پیشے والوں کا الگ بازار تھا۔ سب سے بہتر نان بائیوں کی دکانیں تھیں۔ دنیا کا نفیس ترین کانڈ سمرقند میں ملتا تھا اور وہ قرمزی ریشم جس کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی راسی کے رنگ سے انگریزی لفظ ”کرمرن“ مروج ہوا ہے) پھر بابر نے باہر کے مرغ زار اور سرمائی و گرمائی مقامات کی سیر کی، جہاں سمرقند کے خوش حال لوگ جا کے رہا کرتے تھے۔ انہیں ”قوروغ“ کہتے تھے اور یہاں ملوک و امرا کے خاندان ہفتوں قیام کر سکتے تھے۔ پردے کی دیواریں اغیار سے ان کی تمہانی کرتی تھیں۔ اصل میں شہری گلی کوچوں کی مسقف عمارتوں کے اندر بند پڑے رہنا ابھی تک ترک و مغل امرا کی عادت نہیں بنا تھا۔

بابر کی ناقدانہ نگاہ سامان لطف و نشاط کی ذرا ذرا سی چیز تک جاتی تھی۔ اسے شکایت

ہے کہ سمرقند کے نفیس ”چار باغ“ میں سرد، نارون، سفیدار کے درخت موزوں قسم بندی کر کے نصب کئے ہیں، لیکن آب رواں کا کوئی انتظام نہیں۔ وہ اس خطے کے ابلقی خربوزوں کی خوبی تسلیم کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ وہ میری وادی فرغانہ والوں کی مثل شاداب و شیریں نہیں ہوتے۔

ابتدائی چند روز کی شادمانیاں بہت جلد فکر و تشویش میں بدل گئیں۔ سمرقند کے جن امیروں نے اطاعت قبول کی بابر نے خاص طور پر ان کا خیر مقدم کیا۔ انہی میں سلطان احمد تبتل سے وہ خصوصی عنایت سے پیش آیا جس کا برچھی کا زخم اچھا ہو گیا تھا۔ اگرچہ فراموش نہیں ہوا تھا۔ لیکن خود بابر کی معجون مرکب فوج اب باعث خلجان ہو گئی تھی۔ سپاہیوں نے بازاروں سے کافی مال غنیمت حاصل کیا لیکن لوٹا نہیں تھا کیونکہ اس کی بابر نے اجازت نہیں دی کہ محاصرے کی وجہ سے پہلے ہی اس نے بہت مصیبت جھیلی تھی۔ موسم سرما کی آمد تھی اور نواحی علاقہ اجناس خوردنی سے بہت کچھ خالی کرایا جا چکا تھا۔ بیج تک کے لئے اسے اپنے مختصر ذخیرے سے غلہ تقسیم کرنا پڑا۔ ”بھلا ایسے مفلوک شدہ دیہات سے اور کیا لیا جا سکتا تھا؟ ہمارے فوجی لوگ پریشان تھے اور میں انہیں کچھ نہ دے سکتا تھا۔“ جاڑے کے موسم نے صورت حال کو اور ابتر کر دیا۔ ”لوگ گھروں کو چل دینے کی سوچنے اور ایک ایک، دو دو کر کے فرار ہونے لگے۔ جملہ مغول ساتھ چھوڑ گئے اور آخر میں سلطان احمد تبتل بھی چلتا ہوا۔“

سمرقند کے نیم ویران محلوں میں انتظار کرتے کرتے، بابر نے اپنے بزرگ قاضی سے امداد طلب کی تو معلوم ہوا کہ خود اندجان کے گرد مخالف جمع ہو رہے ہیں۔ اس کے مفروضہ حلیف سلطان علی کے ہرکاروں نے تبتل کو تلاش کر لیا اور پھر دونوں نے مل کر نئی فوج تیار کرنی شروع کی۔ نامطمئن افراد، مغول کی بگڑی ہوئی جمعیت کو ساتھ ملایا اور ہملا پھسلا کر بابر کے چھوٹے بھائی جمائگیر کو بھی اندجان سے باہر کھینچ لایا اس کے بعد یہ کہہ کر کہ ہم اسے جمائگیر کے لئے فتح کرنا چاہتے ہیں۔ سازشیوں نے شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔

ایسان دولت بیگم اور قاضی کے خط آئے کہ بلا تاخیر واپس آؤ اور اپنے شہر کو بچاؤ۔ لیکن مذکورہ سازش کی خبروں نے نو عمر بابر کو بالکل سرا سدا کر دیا تھا۔ ادھر سمرقند میں اس کے پاس ایک ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے۔

قاسم بیگ نے صحیح کہا کہ ہمارے پاس فوج کہاں ہے جسے اندجان بھیجیں۔ پھر اسی

نازک موقع پر بابر علیل ہو گیا۔ فکر و تشویش نے بخار میں ایسی شدت پیدا کی کہ چار دن تک خط پڑھنا، احکام جاری کرنا ایک طرف وہ زبان سے بات نہ کر سکتا تھا۔ بحران مرض میں صرف روئی سے پانی اسے چوایا جاتا تھا۔ اسی سے افواہ پھیلی کہ وہ بخار سے جانبر نہ ہو گا۔ سوئے اتفاق سے اسی زمانے میں باغی لشکر کا ایلچی آیا اور اصرار کیا کہ بابر کے سامنے مجھے لے چلو۔ تیماردار عمال کی غلطی تھی کہ اسے بابر کی حالت دیکھنے کا موقع دیا۔ چنانچہ وہ فوراً اڑا ہوا اندجان کے پڑاؤ پر پہنچا اور خبر دی کہ بابر نزع کی حالت میں ہے۔ اس خبر کو سن کر قلعہ دار نے باغیوں کے سامنے جن کے قبضے میں جہانگیر تھا، ہتھیار ڈال دیئے۔ تبتل نے کمال شقاوت سے بابر کے سب سے مستقل مزاج طرف دار، قاضی خواجہ کو سولی پر لٹکا دیا۔۔۔۔۔ بابر ترک میں لکھتا ہے کہ ”میں بلا شک و شبہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بزرگوار قاضی اولیاء اللہ میں سے تھا۔ اس حقیقت کا صرف یہ ایک ثبوت کیا کم ہے کہ جو لوگ اس کے خون ناحق میں شریک تھے، چند ہی روز کے اندر ان میں سے ایک شخص بھی دنیا میں باقی نہ رہا۔ سب کے سب ہلاک و بے نشان کر دیئے گئے۔ دوسرے خواجہ قاضی کی حیرت انگیز دلاوری بھی اس کے سچے باخدا ہونے کی کوئی معمولی شہادت نہیں ہے۔ اکثر بہادر سے بہادر اشخاص بھی دل میں خوف و خطر سے خالی نہیں ہوتے مگر اس بزرگ کے دل میں ان کا ذرا بھی گزرنہ تھا۔“

سمرقند میں بابر کو افاقہ ہوا تو اس واقعے سے پہلے ہی وہ تانی کا التجا آمیز خط پڑھ چکا تھا کہ ”اگر ہماری فریاد سن کر تم مدد کو نہ آئے تو سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔“ چنانچہ سواری کرنے کے قابل ہوتے ہی وہ اپنی سپاہ کو لے مضطربانہ اندجان کی طرف چل پڑا۔ وسط راہ میں اور خود اپنے وطن کی ندی کے کنارے ایک بستی میں خبر ملی کہ اندجان ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی روز دوسری طرف سے اطلاع آئی کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد سلطان علی نے سمرقند پر قبضہ جمالیا۔ ”اس طرح اندجان کی خاطر میں نے سمرقند کو کھویا مگر معلوم ہوا کہ اسے کھو کر بھی دوسرے کو نہیں بچا سکا۔“

بایں ہمہ بابر کو اذعان تھا اور ساری عمر رہا کہ بخار کی شدت میں اس نے پیر پیران حضرت احراریؒ کی طرف (جو کئی سال پہلے جب بابر سات سال کا تھا، فوت ہو چکے تھے) رجوع کیا اور انہی کی شفاعت سے اس کی جان بچی۔

بابر کی قزاقانہ جنگ

عمر شیخ کا فرزند بادشاہی کے دونوں سرے ہاتھ سے کھو چکا تھا۔ چالاک حریفوں کی سازش نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسے اپنی یاس انگیز حالت کا اندازہ ہوا۔ ”میں اپنے ملک اور رفیقوں سے کبھی اس طرح نہیں بچھڑا تھا۔“ یہ سوچ سوچ کر وہ غم زدہ ہوتا اور جب کوئی پاس نہ ہوتا، تو روتا تھا۔ حقیقت میں خود اس کی عمر، کہ اب وہ پندرہ سال کا ہونے والا تھا، خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو تو مفید مطلب کھ پتلی کے طور پر حریفوں نے بچائے رکھا تھا جیسا کہ ایساں پیش گوئی کر چکی تھی لیکن بابر جس نے کچھ روز پہلے سمرقند فتح کیا اور فوجوں کی سپہ سالاری کر دکھائی، دشمنوں کی نظر میں خار تھا اور وہ اس کانٹے کو دور کرنے کے درپے تھے۔ شکاری ہمارے شیر کو ہر طرف سے گھیرتے چلے آتے تھے اور وہ دو سال تک علاقے بھر میں مارا مارا پھرا کہ محفوظ جگہ کیس مل جائے۔ اپنی وادی چھوڑ کر نکل جانے کا اس نے خیال نہیں کیا۔ اپنے ماموں محمود خاں خلف یونس خاں کے پاس مدد دینے کے لئے قاسم بیگ کو بھیجا۔ اس وقت بابر کی ماں، محمود خاں کی بہن باغیوں کی قید میں تھی۔ محمود خوشی سے فوج لے کر چلا لیکن سمجھ گیا کہ حالات بھانجے کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ اس کے سرداروں نے تبت کے تائبین سے تحفے تحائف قبول کئے اور اپنے خاں کو مشورہ دیا کہ وادی میں خطرہ مول نہ لے، واپس ہو جائے۔ بابر اپنی فوجوں کو اسخ بیچ سے لا رہا تھا کہ ماموں سے آٹے، اسے بہت مایوسی ہوئی۔ پھر، محمود کی واپسی نے خود اس کی فوج میں انتشار ڈال دیا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر بہت سے سپاہی اور سردار دونوں سردیاں چمکتے ہی پڑاؤ چھوڑ کر چلنا شروع ہوئے اور ان کے اہل و عیال شہر اند جان کے اندر تھے اور اس مضبوط شہر کو چھین لینے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ لہذا وہ بابر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ”ان کی تعداد جنہوں نے میرے ساتھ بے خانماں رہنے، مصیبت بھگتنے کو ترجیح دی، کل دو تین سو ہو گی۔ اسی میں اچھے برے سب شامل ہیں۔ یہ صورت میرے لئے سخت روح فرسا ہو گئی اور میں دل بھر کے رویا۔“

ٹھیک اسی زمانے میں باغیوں نے اس کے اہل محل کو آزاد کر دیا۔ شیر دل ایساں کے آ جانے سے نواسے کو بہترین مشیر مل گیا۔ تامل کے بغیر خود بابر نے عاجلانہ تاشقند کا سفر کیا۔ محمود خاں سے مدد مانگنے لئے نہیں۔ بلکہ ظاہر اپنی خالواؤں سے ملنے اور ماں کے واسطے کچھ مسلح دستے مستعار لانے کی غرض سے۔ چنانچہ شمالی جنگ آزماؤں کے چند معقول جوق اسے

مل گئے اور وہ شوق ذوق سے انہیں لے کر چلا کہ اپنی وادی کے ایک سرحدی قصبے پر حملہ کرے۔ لیکن نئے سرداروں نے بتایا کہ اس پر قبضہ رکھنے کے لئے ہماری فوج ناکافی ہوگی۔ بابر کو زد پر چڑھا ہوا شکار بادل ناخواستہ چھوڑ دینا پڑا۔ البتہ وہاں کے تھوڑے مزہ دار خروڑے ہاتھ آئے ”ان شنی خروڑوں کا چھلکا کینخت کی طرح کھردرا اور گودا چار چار انگل ہوتا ہے۔ نہایت لطیف اور لذیذ ہوتے ہیں۔“

بابر کے قبضے میں ایک ہی بستی بنند رہ گئی تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا یہاں بھی قدم نہیں ٹک سکتے۔ یہ سیر دریا کے قریب سمرقند اخی کی کاروانی شاہ راہ پر ایک چھوٹا سا مقام اتصال تھا۔ لوگ دریا میں کشتیاں چلا کے یا بادام چن کر برائے وقت کرتے تھے۔ اس بستی میں چند صد مسلح سپاہیوں کی سربراہی کرنے کی استطاعت نہ تھی۔ بابر نے حسب معمول پسند نہ کیا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے بلکہ جس طرح ایک مستعار فوج سے لشکر کا پیکر تیار کیا تھا، اب اونچی پہاڑیوں میں جہاں غلے کے کھیت اور مویشی کے گلے تھے، مستعار لشکر گاہ حاصل کرنے کی تدبیر کی۔ ادھر روانہ ہوتے وقت سلطان علی کا، جس کی خاطر بابر نے سمرقند پر چڑھائی کی تھی، ہرکارا پہنچا اور تنبیہی پیام لایا۔ دشمن کا نرغہ بے گھرے شہریار کے گرد تنگ ہوتا جاتا تھا۔ پناہ کے لئے کوئی فصیل بند مقام نہ تھا۔ بابر نے انہی پہاڑیوں کا راستہ تلاش کیا۔ جہاں سابق میں وہ گھوما کرتا تھا اور جہاں اس کے آدمیوں کو خشک میدہ اور شکار ملنے کی امید تھی۔

اس پہاڑی گھونسلے میں، آتے جاتے لوگوں نے یہ بھی صلاح دی کہ پہاڑی بلندیوں کے پار ادھر ادھر ایسی بستیاں ہیں جہاں وہ قیام کر سکتا ہے ان میں ایک رقیب چاق خسرو شاہ کی عمل داری تھی جو کسی وقت سمرقند میں وزیر رہا اور علت ا۔ نے میں گرفتار تھا۔ مگر بابر نے یہ بات گوارا نہ کی۔ لکھتا ہے۔ ”خسرو شاہ دروغی کرنے والا غدار۔۔۔۔۔“ یہ الفاظ بابر نے اس وقت لکھے جب سنا کہ خسرو شاہ نے اپنے سابق آقا کے ایک بیٹے کو مروا دیا اور ایک کو اندھا کرا دیا۔ ”خدا کی ہزار لعنتیں، ایسا کرنے والے پر۔ اور جو اس کا یہ فعل سنیں ان کی لعنتیں تا قیامت اس پر ہوں!“

بابر کو معدودے چند ہی لوگوں سے عناد ہوا، لیکن وہ سب سے بڑھ کر اسی خسرو سے اظہار نفرت کرتا تھا۔ اوروں کی نگاہ میں خسرو کتنا ہی نرم خو ہو، بابر کی نظر میں اس نے اپنے ولی نعمت کی قبروں پر چڑھ کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس

روز افزوں لشکر و مال ہونے کے باوجود بابر کو یقین تھا کہ ذاتی طور پر وہ ”طویلے میں ایک مرغ کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔“ غرض مصلحت کی خاطر بھی اس نے خسرو کا رخ نہیں کیا۔ اگرچہ وہی ایسا طاقتور حاکم تھا جس سے مدد مل سکتی تھی۔ ادھر سے منہ پھیر کے بابر اپنے ساتھیوں کو اسی کوہ سفید کی چوٹیوں پر لے چلا۔ جہاں مہماں نواز قبائل کی جھوپڑیوں میں پناہ مل سکتی تھی۔ ان چٹیل بلندیوں پر کوئی اچانک حملہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ کسی تنگ گوشے میں اسے گھیرا جا سکتا تھا۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن جب تنہا گشت لگانے میں اپنے حال پر غور کیا تو اسے عجب طرح کی مایوسی نظر آئی۔ اب شارع عام پر بھنجد واپس جانا مخدوش تھا اور ادھر یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان جنگلی قبائل کے درمیان اپنے گھر والوں اور سپاہیوں کو کب تک رکھنا ممکن ہو گا؟

ایک دن انہی افکار میں غلطاں تھا کہ اسے ایک نشانی نظر آئی، یا اس نے اسے نشانی سمجھا۔ یعنی ایک درویش سے جو ساسی کی طرح بے گھرا تھا، ملاقات ہوئی۔ وہ شہید قاضی کا مرید تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی اور مل کر دعائے مغفرت، پھر ایک دوسرے کے حال پر افسوس کرتے رہے۔ درویش نے کہا کہ صرف قادر مطلق خدا ہی معاملات کو رو بہ راہ کر سکتا ہے، سہ پہر کو ایک سوار بابر کے پڑاؤ پر اوپر آیا اور بابر کے سابق قلعہ دار علی دوست کا، جس نے اندجان کا قلعہ باغیوں کے حوالے کر دیا تھا، تحریری پیام لا کر دیا۔ علی دوست کو تبت نے قبول اطاعت کے صلے میں فرغانہ کا تیسرا بڑا قصبہ مرغیناں حکومت میں دے دیا تھا۔ اب علی دوست نے محاصرین کی اطاعت قبول کرنے کی خطا کا اعتراف کیا اور اپنے اصلی آقا بابر سے درخواست کی کہ وہ خود مرغیناں آئے۔ علی دوست شہر اس کے حوالے کر کے اپنے سابقہ جرم کی تلافی کر دے گا۔ مضطرب جلا وطن کو یہ پیغام درویش کی دعا کا اثر معلوم ہوا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ باغیوں نے خواجہ قاضی کو سولی دی تو علی دوست کو انعام کیوں دیا؟

”مایوسی کے بعد، ایسی خوش خبری! ہم اسی گھڑی کہ سورج غروب ہو چکا تھا، بلا تامل سیدھے مرغیناں کی طرف چل پڑے، ایسی سرعت سے گویا چھاپہ مارنے جا رہے ہیں۔ وہ جگہ سڑک سے کوئی پچیس فرسخ ہو گی۔ ہم ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک مارا مارا چلتے رہے۔ یہاں تک کہ بھنجد کے ایک گاؤں کی پتلی ندی پر پہنچ کر دم لیا۔ خود سستائے۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام کی نوبت بچتے ہی پھر سوار ہوئے، صبح تک چلے اور اسی

طرح اگلے دن شبانہ روز چلے یہاں تک کہ اگلی فجر ہونے سے کچھ پہلے مرغیناں سے چند میل پر پہنچ گئے۔ یہاں ”دیلا آغا“ (۲۴) اور دو چار آدمیوں کو ساتھ لایا اور مجھ سے حجت کی کہ ”حقیقت میں علی دوست بد آدمی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس سے نہیں ملا۔ اور آپ کے اور اس کے مابین گفتگو یا شرائط طے نہیں ہوئیں۔ پھر کس بھروسے پر ہم جا رہے ہیں؟“ ان کا اعتراض بجا تھا لہذا میں نے ٹھہرنے کا حکم دیا اور کنگاش کی۔ آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ہمارے خدشات صحیح ہیں لیکن اب بعد از وقت ہیں۔ دن رات منزلیں مار کر یہاں آئے ہیں اور اب کسی آڈمی یا گھوڑے میں طاقت باقی نہیں رہی۔ جائیں بھی تو کہاں جائیں؟ اتنی دور آہ جانے کے بعد آگے ہی چلنا ہو گا۔ آئندہ جو کچھ ہو گا، حکم خدا سے ہو گا۔“

”فجر کی نماز کے قریب ہم مرغیناں پہنچ گئے۔ علی دوست اس وقت تک بند دروازے کے باہر نہیں آیا جب تک کہ ہم سے شرائط طے نہیں ہو گئیں۔ طے ہونے کے بعد اس نے پھانک کے پٹ کھولے اور میرے سامنے آ کے آداب تعظیم بجا لایا۔ پھر ہم اندر چلے اور شہر پناہ کے اندر ایک مناسب مکان میں گھوڑوں سے اترے میرے ساتھ چھوٹے بڑے کل دو سو چالیس نفوس تھے۔“

تھوڑے دن بعد وفادار قاسم بیگ اپنے پہاڑی مامن سے ایک سو اور سوار لے کر آیا۔ پشیمان علی دوست کے سپاہیوں نے بابر کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اور اس طرح ہمارے شیر کے پاس میدان کا ایک مورچہ بند شہر اور خاصا چھوٹا موٹا لشکر پھر فراہم ہو گیا۔ اس نے تقدیر پر بھروسہ کیا اور سمجھا کہ تقدیر نے یادری کی۔ لہذا سازگار نصیب سے فائدہ اٹھانے کی مزید کوشش کرنے لگا۔ قاسم اور معتمد علیہ نایابوں کو اور فوج بھرتی کرنے ادھر ادھر بھیجا۔ ساری وادی میں دیہ بہ دیہ خبر پہنچی کہ بابر کو پھر قوت حاصل ہو گئی۔ قبائل جو انتظار میں تھے گھوڑوں پر سوار ہو ہو کر اپنے بادشاہ کے فرزند اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گھاس پکنے کے ساتھ شمالی دروں سے ماموں کے سپاہی جوق در جوق غارت کا مال ملنے کی طمع میں آنے لگے۔ اخی اور اندجان میں عوام نے ہتھیار سنبھالے۔ خوش مزاج بابر گلی کوچوں میں بہت ہر دل عزیز رہا تھا، ادھر تہل اور باغی سردار سختی سے حکومت کرتے تھے۔ غرض عوامی جذبات کا مرغ باد نما عمر شیخ کے بیٹے کی جانب پھر گیا۔ بلند چٹانوں پر اخی کے قلعے کو یکایک بلہ کر کے اور لڑ کر چھین لیا گیا۔ یہ معرکہ اس طرح ختم ہوا کہ تہل کی فوجیں ندی کے

راستے کشتیوں میں آئی تھیں، بابر کے مغول نے ان کا حملہ پسا کیا اور تنگی پیٹھ کے گھوڑوں پر سوار انہیں بھگاتے ہوئے ندی کے اندر تک گھس گئے۔

طوفانی تاختیں، چھاپے، پلٹ کر حملے، چھین جھپٹ کے ہنگامے میں جن کا بابر مرد میدان تھا، گرم تھے کہ اندجان والوں نے بھی بابر کی اطاعت کا اعلان کیا۔ اجیر مغلوں کا سردار وادی سے فرار ہوا۔ اس کے سواروں نے بابر کے اس وعدے پر کہ سابقہ بدعنوانیوں کی ان سے باز پرس نہ ہوگی، اس کی ملازمت قبول کر لی۔ دو سال تک ادھر ادھر چھپتے پھرنے کے بعد بالا خر جون ۱۵۹۹ء میں بابر دوبارہ فرغانہ کا مالک ہو گیا۔ کم سے کم خود وہ یہی سمجھا۔

حکومت ہاتھ میں لینے پر اس کا پہلا اقدام نہایت نقصان دہ نکلا۔ اصل میں اندجان کے قدیم رفیقوں پر اجیر مغلوں نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ اب اس کے عمائد فریاد کر رہے ہیں کہ انہی مغل دستوں نے ہم کو اور خواجہ قاضی کے متوسلین کو لوٹا تھا۔ انہوں نے اپنے رئیسوں کے ساتھ وفا نہیں کی تو کیا یہ ہمارا ساتھ دیتے رہیں گے؟ اس میں کیا خرابی ہے اگر انہیں پکڑ کر لوٹ کا مال ہمیں واپس دلویا جائے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے وہ انہی گھوڑوں پر سوار وہی پوشاکیں پہنے پھر رہے ہیں جو ہم سے لوٹ لے گئے تھے۔ ہم سے چھینی ہوئی بھیڑ بکریاں کاٹ کاٹ کے کھا رہے ہیں۔ کیا آپ ہمیں، ہمارا مال ان سے واپس لینے کی اجازت بھی نہیں دیں گے؟

جب بابر کی آوارہ گردی کے رفیقوں نے بھی انہی عمال کی تائید میں رائے دی تو بابر کو ان کی درخواست ماننی پڑی۔ اس نے مغلوں کو جو خاموش تھے حکم دیا کہ میری رعایا کا جو سامان وہ شناخت کر لیں، واپس کر دیا جائے۔ بابر لکھتا ہے کہ ”ہرچند یہ حکم بجائے خود معقول اور منصفانہ تھا مگر بے موقع عجلت سے دیا گیا، پھر متاسفانہ رائے قائم کرتا ہے کہ ”جنگ اور امور ملک وادی میں بہت سی باتیں بادی النظر میں عقل و انصاف کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن بیسیوں مختلف پہلوؤں پر احتیاط سے غور کئے بغیر ایسا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔“

شیر سبق سیکھ رہا تھا مگر ابھی تک سیکھے پر عمل نہیں کرتا تھا۔ چار ہزار مغل جو اس کی سپاہ کا قوی ترین حصہ اور اس کی ماں کے متوسل تھے، انہوں نے حکم ماننے سے انکار کیا لوٹ کا سامان لے کر کوچ کر گئے۔ ایک کن کٹے سردار کو جو ذاتی طور پر بابر کا احسان مند تھا، بھیج کر مطلع کیا کہ وہ اس کی نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تہن کے لشکر میں جا ملیں

گے، باہر انہیں روکنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت سے مغلوں کے اطوار سے، جو خود اس کے اجداد کے طور طریق تھے، اسے سخت نفرت ہو گئی اور ان کے نام تک سے جسے ”مغول“ تحریر کرتا ہے، بیزار ہو گیا۔

اپنے ہاتھوں، جنگ کرتے دشمن تبتل کو صحرائی جنگ آزماؤں کی ایسی زبردست کمک بھیج دی، تو اب نو عمر بادشاہ کو سوار فوج کے حملے سے اپنی چھاؤنی بچانے کی فکر ہوئی۔ ہر طرح کے ہتھیار، آدمی، جانور جمع کئے۔ پیادہ فوج کی حفاظت کے لئے چڑے کی ڈھالیں اور چلنے تک تیار کرائے۔ درخت کے گدوں کی باڑیں گاڑ کر مورچہ بندی کی کہ بلا سے سوار فوج کم ہے تو ان کا حملہ ہی روکا جاسکے۔ بایں ہمہ جب تبتل اور اس کے مغل اندجان کو گھیرنے آئے تو باہر نے اپنے دفاعی مورچوں اور چرم پوش پیادوں کو یاد نہ کیا۔ نئی آموختہ مال اندیشی بھی طاق پر رکھی اور اپنی معجون مرکب فوج کو لے کر میدان میں نکل آیا۔ وادی کے دیہات میں جلدی جلدی اپنے دستے پھیلا دئے۔ ایک دن علی الصباح فریقین کے رسالوں میں ٹکر ہوئی۔ باہر کے آزمودہ کار سردار ڈٹ کر لڑے۔ دشمن کا منہ پھیر دیا، بلکہ چند آراستہ خیمے چھین لئے لیکن آگے تعاقب کرنے سے ابا کیا۔ کیونکہ انہوں نے کہا بھاگتے مغلوں کا پیچھا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ معرکہ تو معمولی سا تھا مگر باہر نے رفیقوں کی تحسین اور انعام اکرام سے اس کی اہمیت خوب ہڑبھائی۔ لکھتا ہے کہ ”میری زندگی کا یہ پہلا میدانی مقابلہ تھا۔ خدائے قدیر نے اپنی عنایت سے مجھے فتح دی۔ میں نے اسے فال نیک سمجھا“ (مگر اس موقع پر بھی اسے یہ خیال نہ آیا کہ علی دوست نے دشمن کا تعاقب کیوں رکوا دیا؟)

سردیاں آ رہی تھیں۔ بادشاہ اور بادشاہی کے امیدوار دونوں ہی اپنے خدم و حشم کے لئے چھت کی فکر میں تھے۔ باہر نے وسط وادی کی جھونپڑیوں میں ٹھہرنا پسند کیا جہاں شکار مار کر کچھ نہ کچھ شکم سیری کی بھی صورت تھی۔ وہ شکار کا عاشق تھا۔ ”ندی کے قریب پہاڑی بکرے اور ہرن کثرت سے تھے۔ جنگلی سور کا شکار بھی تھا۔ جنگل کی بکھری ہوئی بھاڑیوں میں جنگلی مرغی اور خرگوش کی کمی نہ تھی۔ یہاں کی لومڑیاں دوسری جگہ سے زیادہ تیز پا ہوتی ہیں۔ بکری اور ہرن کے لئے ہم جنگل چھانٹتے تھے۔ جھاڑیوں کے بن میں مرغی پر شکرے چھوڑتے، دو شاخہ تیر سے بھی شکار کرتے تھے۔ اس تعلق میں دوسرے تیسرے دن میں شکار کھیلنے جاتا تھا۔ یہاں جنگلی مرغی، بچھڑ، موٹی ہوتی ہے اس کے گوشت کی ہمارے

ہاں افراط رہی۔“

ساتھی سردار اس جاڑے بھر شکار معرکہ آرائی سے زیادہ خوش نہ تھے ”چالاک بونے“ سلاخ کو تو گھوڑے پر چڑھ کر اپنے برادری والوں سمیت اندجان سے زبردستی روکنا پڑا۔ (۲۵)

سب سے بڑھ کر علی دوست، جس نے بابر کو پہاڑیوں میں سرگرداں پھرنے سے نجات دلائی، جتیں اور بار بار تقاضے کرتا تھا۔ کہ شدید سردی سے بچنے کے لئے دشمن سے عارضی صلح اور اندجان میں واپس چلنا چاہئے۔ بابر اسے وجدانی طور پر غلط سمجھتا تھا، مگر علی دوست سے جبراً اپنی بات منوانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ ”آخر اسی کی رائے ماننی پڑی۔ ۱۳۹۹ء کا خاتمہ مخدوش آثار میں ہوا۔ سمرقند ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ فرغانہ پر دعوے کے لئے علاقائی بھائی جہانگیر طاقتور دشمنوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا اور وقتی صلح کی بجائے علی دوست نے باقاعدہ صلح نامہ کی شرطیں طے کر لیں۔ بابر کی طرف سے تبت کو دوستانہ پیام سلام پہنچائے۔ قیدیوں کا تبادلہ کرایا اور شرط مان لی کہ بابر صرف اندجان اور سیردیا کے بائیں کنارے پر حکومت کرے، اخی اور دائیں رخ کا علاقہ تبت، جہانگیر، سلطان علی جتھے کے حوالے کر دیا جائے۔ طرہ یہ کہ بابر کی اتنی سی عمل داری بھی علی دوست کے رحم و کرم پر مبنی تھی اور جب تک دشمن سیر کی دوسری طرف سامنے خیمہ زن تھا، بابر کو علی دوست کی خاطر رضا جوئی کے بغیر چارہ کار نہ تھا۔

آگے چل کے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ میدان سیاست کے نئے شاطر کو اپنے اصلی ورثے یعنی وادی فرغانہ سے دست بردار ہونے پر تیار کر لیا گیا۔ بشرطیکہ سمرقند اس کے ہاتھ آجائے۔ انہی ایام میں امراء سمرقند کے قاصد اس کے پاس آ رہے تھے اور مصرحتے کہ وہ ان کی مدد سے اس دارالسلطنت میں واپس آئے۔ امیدیں باندھنے والے لڑکے کو یہ خفیہ بلاوے عین خدا ساز نظر آئے۔ سمرقند پر حکمرانی کی آرزو کے ساتھ اپنے طالع سازگار کا بھروسہ بھی ضرور شامل تھا اور یہ اذعان کہ ”العزم منا والاعلم من اللہ“ غرض علی دوست نے تبت سے مل کر وطنی شہر اندجان حوالہ کر دینے کی قرارداد کر لی اور اس مرتبہ یہ تحویل خود خوش عقیدہ بادشاہ کی رضامندی سے عمل میں آئی۔ بابر کے ذہن میں نہ آیا کہ تیمور کے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے کا اب کوئی امکان نہیں رہا۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں یورپ والوں میں، جنہیں بابر نے کبھی نہیں دیکھا،

بعض تبدیلیاں ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ پیٹرنزیار جیسے اطالیہ میں لب دریا فورنو دو کی گمنام سی جنگ میں غیر معمولی جاں بازیاں دکھانے پر بہادر ("ناٹ") کا خطاب ملا، اس کا طریق عمل ابھی تک گزرنے والے قرون وسطیٰ ہی کے مطابق تھا۔ خدا پر بھروسہ کر کے اپنے بادشاہ کی بے چون و چرا اور بلا خوف ملامت اطاعت کرنا ہی اس کا شعار تھا لیکن اسی زمانے میں ایک غیر معروف سانوجوان سفیر نکولو کیا ولی بھی ریاست فلورنس کی طرف سے دربار فرانس میں بھیجا گیا تھا جس نے دوران سفر میں شاہ و شہنشاہ کی جنگوں کے بے سود ہونے کا مشاہدہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اطالیہ کی ریاستیں ایک موہوم کلیسا اور سلطنت کی حدود کے اندر رہ کر بھی ذرا ذرا سی بات کے لئے لڑ کر برباد ہو رہی ہیں۔ کیا ولی کی باریک بین نگاہ میں اس وقت بظاہر نہ کوئی ہمہ گیر کلیسا باقی تھا نہ سلطنت۔ جو کچھ ہوتا تھا وہ قدرتی یا محض تقدیری اسباب ہی کا نتیجہ تھا۔ تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے اسے یقین کامل ہوا کہ بادشاہ بے دردی سے اپنی شخصی مرضی پر چلیں تو قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا موروثی ظل اللہ بادشاہوں کا دور ختم ہوا۔ خود اوپر آنے والے مطلق العنانوں کا زمانہ سر پر تھا۔

کیا ولی کے دائرہ فکر سے باہر، دیگر مقامات یعنی پرتگال کی بندرگاہوں میں نئی نئی سرگرمیوں کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ واسکو ڈگاما بعید ترین مشرق سے زندہ سلامت واپس آیا اور ساحل مالابار، ہندوستان کی بارگاہ کالی کٹ سے جہاز لدے پھندے لایا۔ یہ علاقہ اسی نصف دنیا میں تھا جسے چند سال پہلے پاپائے رومہ کے فتوے نے دریافت حال اور حکمرانی کے لئے بادشاہ پرتگال کے نام لکھ دیا تھا۔ پھر گرگیوری تقویم کے سال ۱۵۰۰ء میں ڈگاما کے ہم وطن پیڈرو کیرال نے کوئی درجن بھر بادبانی جہاز اور بہترین ملاحوں کے ساتھ بحر نوردی کی تیاری کی تاکہ اپنے بادشاہ کے لئے نئی تجارتی بندرگاہیں اور ہندوستان میں مزید علاقہ حاصل کرے۔

یہ اس شخص کے، جسے عہد جدید کی تاریخ میں پہلا "مغل اعظم" کہا گیا، شمالی ہند کو فتح کرنے سے ۲۶ برس قبل کی بات ہے۔

باب دوم

سمرقند سے اخراج

”عورتوں کا مقام“

جس وقت بابر خلاف مرضی اندجان کے قلعے میں لایا گیا تو وہ تینوں خواتین جو برابر اس کے ہمراہ پڑاؤ سے پڑاؤ میں ساتھ رہی تھیں، اپنے پرانے دالانوں میں اتریں اور اس جاڑے میں کچھ روز آرام کیا۔ مرد رشتہ داروں کے برخلاف خاندان کی سب مستورات بابر کی وفادار رہیں، سوائے ایک کے۔ اس کی دلاور ثانی بھی اپنے برج میں متمکن ہو گئی تھی۔ اب اس پر بدھاپا آ رہا تھا۔ علی دوست کی نسبت بدظنی کی باتوں سے کہ یہ بھی یعقوب کے متونی بیٹے کی طرح تمہیں سونے کی زنجیریں ڈال کر محض برائے نام بادشاہ بنائے ہوئے ہیں، وہ بابر کو فکر مند کرتی رہتی تھی۔ بہن خازنہ بیگم جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، سمرقند واپس جانے کے منصوبوں میں اس کی شریک تھی۔ ماں یاد دلاتی رہتی تھی کہ اب وہ انیس سال کا ہو گیا ہے اور شادی کرنے کے تقاضے کرتی تھی۔

اس اثنا میں معلوم ہوتا ہے بابر اپنی تعلیم کی کمی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا۔ پچھلی دفعہ پہاڑیوں پر جانے میں بھی دل پسند کتابیں ساتھ لے گیا تھا۔ پھر شہر میں خواجہ احرار کے مرید، بعض مذہبی لوگ بھی اس سے ملنے آئے جنہیں بابر سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے سادہ سپاہیانہ افکار کو کبھی کبھی اشعار کی شکل میں لانے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ جب موج آتی ترکی زبان میں جو عوام کی بولی تھی اور کبھی فارسی میں جو اہل علم کی زبان ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی ندیم عشق و محبت یا عورتوں کے باب میں گفتگو نہ کرتا تھا۔

آخر اس کی ماں نے اس کی دلہن کو لانے کا انتظام کرایا۔ شہزادی عائشہ اپنی دایہ

نوکروں اور چیز کے ساتھ سرقہ سے چل کر آئی۔ اب وہ پوری جوان اور جب تک بابر نے شوہر کی حیثیت سے اس کی نقاب چہرے سے ہٹائی، گویا ایک غیر خاتون تھی۔ یہ رسم بڑی شاہراہ پر جنم میں ادا ہوئی۔ اسے حاصل کرنے کے ابتدائی شوق کے بعد ان کے درمیان سرد مہری سی پیدا ہو گئی۔ بابر کی طرف سے شرمیلا پن اور بیوی کی طرف سے کچھ ناگواری رہی۔ ممکن ہے بہن کی ہمہ وقت رفاقت بھی اسے دلہن سے بے تکلف ہو جانے میں مانع آئی ہو۔ بقول خود ”میں اس کے پاس دسویں بیسویں دن جاتا تھا، بلکہ یہ رکاوٹ ایسی بڑھتی گئی کہ پھر والدہ ہی مجھے کسی قصوروار کی طرح دھکیل دھکیل کر مہینہ، چالیس دن میں بھیجا کرتی تھیں۔“ بیوی سے تعاف کی ایک اور وجہ بھی وہ بیان کرتا ہے کہ انہی ایام میں اسے چھاؤنی بازار کے ایک نو عمر لڑکے سے بڑی انسیت پیدا ہوئی اس کا نام بھی بابر ہی تھا۔ یہ جذبہ قریب قریب دیوانگی کے درجے تک پہنچا کہ وہ اس کی یاد میں محو رہتا اور شعر کہتا تھا۔ لکھتا ہے کہ ”قبل ازیں مجھے کسی کے ساتھ ایسی شیفنگی نہیں ہوئی۔ حالات روزگار نے عشق عاشقی کی باتیں سننے کبھی مہلت نہیں دی تھی۔ ان دنوں جو شعر میں نے لکھے ان میں ایک بیت بتاتی ہے کہ میں کس درجہ ذلیل و خوار عاشق ہوں۔ بابر میرے پاس کمرے میں آتا تھا تو شرم کی وجہ سے میں اس سے آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا۔

”میں معشوق کو دیکھ کر شرما جاتا ہوں“
لوگ مجھے دیکھتے ہیں، میں دوسری طرف دیکھتا ہوں“ (۳۶)

میں بر محل باتیں کیا کر سکتا تھا کہ اس کا دل میلے جب کہ خود اپنا دل قابو میں نہ ہوتا تھا۔ اس کے آنے کا شکریہ اور ٹھہرے رہنے پر اصرار تو اور بھی دشوار بات تھی۔ معمولی تواضع کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کی بھی مجھ میں طاقت نہ رہتی تھی۔ اسی شیفنگی سے مسحور ہونے کے زمانے میں ایک دن چند رفیقوں کے ساتھ گلی سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس کا سامنا ہو گیا۔ میں آنکھیں چار نہ کر سکا، کوئی بات میرے منہ سے نہ نکلی۔ شرمندگی اور کرب کی حالت میں برابر سے نکلا چلا گیا۔

جوانی کی دیوانگی اور جذبات کی اس طغیانی میں، میں کوچہ و بازار، باغوں، تاکستانوں میں برہنہ سر، برہنی پا پڑا پھرتا تھا۔ کبھی مجنوناں باغوں اور مضافات شہر سے نکل کر پہاڑیوں میں چلا جاتا۔ یہ آوارہ گردی میرے اختیار کی چیز نہ تھی اور نہ چلنے یا ٹھہر جانے پر مجھے کوئی قابو

تھا۔ دوستوں، ملاقاتیوں کی تعظیم و تکریم یا اپنی خودداری کی ذرا پروا نہ رہی تھی۔۔

”شوق نے مجھے ازخود رفتہ کر دیا، نہ جانتا تھا کہ یہ ایک پری چہرہ کے عشق کا کرشمہ ہے“

اسی شعر سے، بابر نے لڑکے کے ساتھ اپنی شیفنگی دور کی اور پھر بظاہر ایسے جذبے نے کبھی اسے پریشان نہیں کیا۔ تاہم اسی نے عائشہ بیگم سے اسے محروم کیا جو ایک لڑکی کی ولادت کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لڑکی چند مہینے میں فوت ہو گئی۔ پھر عورتوں کے باب میں متوکلانہ بے پروائی سی بابر کے مزاج میں جگہ پا گئی حالانکہ وہ اس کے ساتھ گہری موانست رکھتی تھیں۔ عرصے تک معلوم ہوتا ہے اس طرز عمل نے بچوں پر بھی جو دوسری بیویوں سے ہوئے اثر ڈالا۔

عائشہ کے زمانہ حمل میں اس بے لطفی اور بابر سے شیفنگی ہی کے دوران میں نوجوان بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اس کا سب سے بڑا طرفدار ہی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اب ایساں بیگم کی بار بار تنبیہ بھی خبردار کرنے کے لئے ضروری نہ تھی کیونکہ اتنے دن میں وہ علی دوست کی سیرت بخوبی سمجھ گیا تھا۔ ”میر علی دوست شاہی خاندان سے اور میری ثانی شہزادی ایساں دولت کے رشتے سے میرا رشتہ دار ہوتا تھا۔ اس کی فطرت میں مطلق العنانی تھی۔ اپنے باپ کے زمانے سے میں اس کی بہت پاس داری کرتا رہا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا کارگزار آدمی ہے لیکن سالہا سال جب وہ میرے ساتھ رہا میں نے اپنے لئے اس کی کوئی کارگزاری نہیں دیکھی اسے مقناطیس پتھر سے سحر کرنے کا بھی ادعا تھا لیکن باز اڑانے کے سوا کوئی ہنر نہ جانتا تھا۔ زرستانی، فتنہ انگیزی، ریاکاری، درشت گوئی، درشت روئی البتہ اس کی صفات تھیں۔“

ایک شخص بابر کا سچا وفادار تھا۔ وہ اور ایساں اندجان کے چھوٹے سے دربار میں علی دوست کی ریشہ دوانیاں بھانپ رہے تھے۔ بابر لکھتا ہے: ”اندجان میں پلٹ آنے کے بعد سے اس کا طرز عمل بدلا۔ میری پر مشقت چپاولی جنگ کے رفیقوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگا۔ ایک کو تو نکال باہر کیا اور دبلے (لاغری) کو قید میں ڈال کر مال اسباب چھین لیا۔ قاسم بیگ سے بھی اس نے پیچھا چھڑایا۔ ایک دفعہ اعلان کیا کہ خواجہ قاضی کا عزیز دوست خلیفہ شہید قاضی کے بدلے میں اسے (علی دوست کو) قتل کرنا چاہتا ہے۔ ادھر اس کے بیٹے نے

وہ طور اختیار کئے گویا آئندہ بادشاہ ہونے والا وہی ہے۔ امرا کو باریاب کرتا۔ سب کو کھانے کھلاتا اور اپنے لئے شاہی درباروں کے سے آداب ملحوظ رکھواتا تھا۔ باپ اور بیٹے کو یہ جرات اس لئے تھی کہ تبتل کی پشت پناہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔

واقعی تبتل کی فوجیں دریا پار پڑی تھیں کہ یہ صلح نامے کی شرطوں کے مطابق تھا۔ اس حالت میں بابر اپنے باقی وفاداروں کی مدد سے علی دوست کے درباری گروہ پر ضرب نہ لگا سکتا تھا اور نہ اندجان کو ایسی حالت میں چھوڑنے کا خیال کر سکتا تھا۔ ”میرے لئے یہ عجیب طرح کا نازک موقع تھا۔ علانیہ کوئی بات زبان پر نہ آتی تھی مگر میں مجبور تھا کہ باپ بیٹے کی اہانت آمیز حرکتیں برداشت کروں۔“

بابر یہ سب زیادہ مدت تک برداشت نہ کر سکتا تھا اور غالباً سازش کرنے والے بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے۔ انہیں بجاطور پر یقین تھا کہ علی دوست کے بیٹے کو تخت اندجان لینے کی تیاریاں کرتے وہ دو چار ہفتے اور دیکھے گا اور پھر مزاحمت کئے بغیر نہ رہے گا اور یا ان سے الگ ہو جائے گا۔ مگر بابر نے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کی بلکہ اسے اندجان سے ہٹانے کی لئے جو طمعہ دیا گیا تھا، اسے قبول کر لیا۔ ممکن ہے اس چال میں ایسان کی عیاری کا دخل ہو۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ ”صلح کرتے وقت جو صورت میرے لئے پیش کی گئی تھی۔“ میں سمرقند فتح کرنے کی کوشش کروں گا اور لشکر کشی کے لئے اپنے آدمیوں کو طلب کیا۔

ادھر سمرقند میں بھی کچھ اسی قسم کے واقعات پیش آئے جیسے بابر کے جانے کے بعد اندجان میں گزرے تھے۔ سلطان علی کی ٹولی جس کا شر پر قبضہ ہوا، وہاں کے اشراف سے طرح طرح سے مالیہ کھینچ رہی تھی۔ پھر وہاں کے ممتاز خاندانوں کے پاس نواح کے باغ اور مزرعے تھے۔ وہ امیر تیمور کے زمانے سے ترخان کے لقب سے ملقب تھے۔ انہیں خاص مراعات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ لوگ روپیہ اور زمین کے نقصان کے ساتھ بے عزتی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بعض جوان رئیس زادوں نے اپنی جاگیروں میں ہتھیار سنبھالے۔ ادھر سے مغل دستے نے جنگ میں حصہ لیا۔ سلطان علی کے سرداروں نے باغی ترخانوں کو شکست دی۔ (بابر لکھتا ہے کہ اپنے آخری زمانے میں شہزادہ سلطان علی نے صرف اسی چھوٹے سے معرکے کو اچھی طرح سرانجام کیا) باغی ترخانوں کو بابر کی سمرقند پر صد روزہ بادشاہی کی فیاضیاں یاد آئیں اور اب انہوں نے عاجلانہ قاصد دوڑائے کہ بابر آئے اور ان

کی مدد سے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔

فریب اور سازشوں کی گرم بازاری میں قاصد یا اپچی بھی ایسا درکار تھا جس کی بات کا یقین کیا جاسکے۔ سمرقند سے آخر میں جو اپچی آیا وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ یعنی ایک خاندانی مغل سردار جو اندجان میں خواجہ قاضی کی حمایت میں لڑ چکا تھا۔ باہر نے بھائی جہانگیر میرزا کے پاس بھی اسی مغل سردار کو عاجلانہ اخی روانہ کیا کہ اس کٹ پتلی بادشاہ کو مطلع کر دے کہ قرارداد کے مطابق میں فرغانہ اسے دے کر سمرقند جا رہا ہوں۔ ”چنانچہ میں اپنے مسلح سپاہیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔“ یہ جون کا مہینہ تھا۔ یہاں تک تو ہمارے شیر نے نانی کی نصیحت پر عمل کیا لیکن فوج پاس ہو تو اس سے دشمن پر حملہ کئے بغیر نہ رہا جاتا تھا اور ایسا صبر کرنا آئندہ بھی کبھی نہ آیا۔

یورپ میں نوجوان تلواریا بسیار بھی اسی قسم کی جرات دکھانے کا مادہ رکھتا تھا لیکن مغربی آئین شجاعت کے تحت میں اس کی تلوار حق کی راہ میں صرف بادشاہ کے حکم سے اٹھتی تھی۔ ایشیا کے مردان جنگ اور بھی بڑی ذمہ داریوں کے تحت میں تھے۔ باہر کے فرائض کا تقاضا تھا کہ لشکر کے سپاہی اور وادی کے تاجیک باشندے، غرض اپنے سبھی متوسلین کی حفاظت کا یکساں خیال رکھے۔ ایک طرف مغول کی قدیم روایت اسے اپنے جد اعلیٰ چنگیز کے قانون لیساکو ابھی تک یاد دلاتی تھی اور دوسری طرف ”یاسا“ سے بڑھ کر اسلامی قانون کی گرفت تھی۔ بے باک و سفاک امیر تیمور نے ان روایات کے باہمی اختلاف کا فیصلہ اس طرح کیا کہ رسمی طور پر دونوں کو تسلیم کیا لیکن اپنے عظیم مقاصد کو خود ہی پورا کر لیا اور وسط ایشیا میں ایک نیا مرکز تہذیب اپنے دارالسلطنت سمرقند کو بنا لیا۔ وہ متاخر سلطنت روما کی طرح، اسے ایشیا میں وحشی اقوام کو روکنے کے لئے مستحکم حصار بنانا چاہتا تھا اور چینی اثر دہے کے اقدام سے بچانے کی بھی فکر تھی جسے وہ آخری ایام میں مغلوب کرنے چلا تھا کیونکہ چینی اثرات اس وقت کاشغر اور تبت تک نفوذ کر چکے تھے جو باہر کی وادی فرغانہ سے چند روز کی مسافت پر تھے۔

غرض باہر ایک طرف تو اعتقاد صحیح سے خدا کی مرضی کے سارے عمل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اپنے ملک اور ”اپنے لوگوں“ کی ذمہ داری کندھوں پر تھی (اگرچہ یہ لوگ کسی معنی میں ایک قوم نہ تھے) اور تیمور کی کھوئی ہوئی سلطنت یا ملک و تہذیب کو جس کا مرکز سمرقند تھا، بحال کرنے کی بھی دل میں لگن تھی۔ اسی لئے یہ شہر اس کے لئے پناہ گاہ سے

کچھ زیادہ ہو گیا تھا اور اب اپنی اندرونی آویزشوں سے دعوت دے رہا تھا کہ تیوری آرزوؤں کو بر لانے میں دوسرے اہل خاندان کی ناکامی کی تلافی وہ کرے۔ بابر نے مطلق نہ سوچا کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ بلکہ بے تامل اس طرف چل پڑا۔ اسی ماہ جون میں سب سے خطرناک صحرائی یعنی ازبک بھی مغرب کی طرف سے سمرقند پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ (اس زمانے میں وسط ایشیا کے القاب و خطابات حالیہ عمدہ و منصب کی بجائے زیادہ تر سابقہ تاریخ بتاتے تھے۔ ”سلطان“ کا لفظ عربی سے آیا ہے۔ ”شاہ“ اور ”میرزا“ فارسی سے۔ اور ”خان“ ترکی مغلی سے۔ عام طور پر یہ محض اعزازی ہوتے یا خاندانی امارت کی نشانی اور یا انہیں کوئی از خود اختیار کر لیتا جیسے ایک مجبول الاحوال لقب چاق ترک نے جو قندز کا مالک بن بیٹھا تھا اپنا لقب خسرو شاہ بہ معنی بادشاہ فرماں روا، رکھ لیا۔ تاہم کسی مغل نام کے ساتھ ”خان“ کے معنی شاہی خاندان والے کے ہیں جیسے تیوریوں میں ”میرزا“ کے آگے ”بیگ“ یا ”بک“ کا مترادف ہم نے امیر یا سردار لکھا ہے۔ بابر ناموں کے ساتھ عموماً پورا خطاب دیتا ہے۔ ہم نے اسے مخفف کر دیا ہے۔ عورتوں کے باب میں ”خانم“ اور ”بیگم“ شاہی خاندان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ جن کا انگریزی میں پرنس (شنزادی) ترجمہ کیا گیا ہے۔ لفظ منگول کو بابر موگل، مغل، مغول تحریر کرتا ہے۔ ہم بھی آئندہ اوراق میں اسی کی پیروی کریں گے۔)

شیبانی خاں کا رحم

ہمارے شیر نے عقل مندی کی کہ اہل و عیال کو چھوڑ کر چپ چاپ اندجان سے نکل آیا۔ علی دوست کو جو اس کی نگرانی کر رہا تھا، خبر تک نہ ہوئی۔ صرف بھروسے کے ملازمین ساتھ لئے جن میں خواجہ، اس کا کتاب دار اور فوج رکاب کے جوان تھے۔ اس قسم کے نمک حلال رفتا میں اس کا زرہ بکتر اتار کر سونا ممکن تھا۔ کسی کی وفاداری جانچنے کے بارے میں اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا۔ ان سب احتیاطوں پر بھی اس کا ایک عسکری کھسک گیا کہ سمرقند میں سلطان علی کو اس کے آنے کی خبر کر دے۔

کاروانی شاہراہ پر اس کی لشکر گاہ چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ہرندی نالے کے پل یا گھاٹی سے گزرتے ہوئے تازنے والے اس کی جمعیت کا تخمینہ لگا سکتے تھے۔ اور یہ خبر بھی مشہور ہو چکی تھی کہ عمر شیخ میرزا کا بیٹا اپنے شمشیر زنوں کو بلوا رہا ہے۔ ہر رات پڑاؤ پر لوگ بھرتی

ہونے آتے یا قاصد ان رئیسوں کی طرف سے جو ابھی دور ہی رہنا مصلحت سمجھتے تھے، دوستی کے پیام سلام لاتے تھے۔ قاسم بیگ اپنی جمعیت لے کر آ ملا اور جنگ چپاولی کے پرانے رفیق جنین علی دوست نے تنگ کر کے نکالا تھا، ناخواندہ ہی آن آن کر شریک لشکر ہو گئے۔ پھر یکایک خود علی دوست اپنے بیٹے اور عملے کو لے کر ایک دن حاضر ہوا اور اسے محض حسن اتفاق پر محمول کیا۔ بابر جانتا تھا کہ یہ کہنا صحیح نہیں مگر خوش طبعی سے تائیداً "کہا" "ہاں کیا اتفاق ہے۔ تم اس طرح آئے گویا ملنے کی قرارداد ہو گئی تھی۔" اصل میں اب اس کے اور علی دوست کے درمیان قوت کا توازن برابر ہو گیا تھا۔

قبر علی سلاخ کے "جنگے سرنگے پیر" آنے پر بابر نے بہت مزا لیا۔ یہ شنی خورہ مشیخت سے تبتل کے پاس تنہا اخی گیا تھا۔ اس نے پکڑوا لیا اور اس کی جاگیوں پر جا چڑھا۔ بابر نے ایک ترکی مثل نقل کی ہے جس کے معنی ہیں "دوست پر اتنا بھروسہ نہ کر کہ تیری کھال میں بھس بھر دے۔" (۲۷)

سمرقند کے قریب ایک سردی میں منزل ہوئی تو وہاں پانسہ علی دوست کے خلاف پلٹ گیا۔ شہر کے ترخان اور امرا کا اپنے عالی موالی سمیت یہیں پڑاؤ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بزرگ خواجہ کو شہر میں چھوڑ آئے ہیں جو عام باشندوں کو طرف دار بنانے میں سعی ہے۔ اتنی بات سب جانتے تھے کہ تیمور کے شہر کی فصیلوں پر حملہ کامیاب نہ ہو سکتا۔ اندر والوں کے مل جانے ہی سے راستہ مل سکتا تھا۔ لشکر گاہ میں بابر دربار لگا کر اجلاس کرتا تھا۔ علی دوست میں بہر حال قوت تمیزی تھی۔ وہ اندیشہ مند اور شاید شرمندہ ہو کر بابر کی خدمت میں آیا اور ملازمت سے علیحدہ ہونے کی اجازت مانگی۔ بابر نے بے تامل منظوری دی باپ بیٹے رخصت ہو کر تبتل کے پاس گئے اور اس کی ملازمت کر لی۔ وہاں باپ کے ہاتھ میں کچھ روز بعد سرطان کا پھوٹا نکلا اور وہ اسی سے مرا۔ بیٹا وہاں سے بھی نکل گیا تھا اور آخر ازبکوں نے پہاڑوں میں پیچھا کر کے اسے پکڑا اور اندھا کر دیا۔ بابر کہتا ہے "نمک فلاں کس چشم ہائے اور گرفت" (یعنی کسی کے نمک نے اس کی آنکھیں پھوڑیں) بایں ہمہ اس موقع پر سمرقند اس کے ہاتھ نہ آیا کہ حالات سیرین کے نظاروں کی طرح ذرا ذرا سی دیر میں رنگ بدلتے اور کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے.....

مغرب کی طرف سے ازبک بڑھے آ رہے ہیں۔ خطرے کی پرچھائیں اس طرح پڑ رہی ہے جیسے میدان میں شاہین کا سایہ چڑیوں کو نظر آتا ہے۔ اس آوازے کے ساتھ کہ شیبانی

خاں نزدیک ہے اہل سمرقند کے باہمی جھگڑے، نیز دوستی کے عہد و بیان ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ سلطان علی میرزا کی ماں خود ہی اس آن بان والے ازبک رئیس کی زوجیت میں آنے کی درخواست کرتی اور سمرقند میں اسے بلاتی ہے۔ سلطان علی ہچکچاتا ہے۔ پھر ایک کم زور بچے کی طرح ضد کر کے میدان کے باغ میں ازبک سے ملاقات کرنے چلا جاتا ہے۔ شیبانی کوئی خاص مہربانی نہیں کرتا۔ اپنی مسند کے پائیں میں بٹھاتا ہے اس کی سازشی ماں کو اپنے خیمے میں لے جاتا ہے۔ سلطان علی کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور وہ شیبانی سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے لیکن چند آدمی اس کے ہمراہ کئے جاتے ہیں جو مرغ زاروں میں اس کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح ترخانوں کا حامی خواجہ یحییٰ ایک سڑک پر دوڑ باہر لے جا کر ہلاک کیا جاتا ہے اگرچہ شیبانی کے ملزم سردار اس کے قتل سے انکار کرتے ہیں۔ بہر حال یہ بزرگ خواجہ اور تیموری شہزادہ سلطان علی معدوم ہو گئے۔ تو اب فرمان دہی کے لئے صرف شیبانی خاں کی آواز رہ جاتی ہے۔

بابر، جنوب میں شہر سے دور راستے پر ہے، مگر یہ خبریں گاؤں گاؤں گشت کرتی اس تک پہنچتی ہیں۔ انہیں سن کر سربر آوردہ ترخان اس کا ساتھ چھوڑ کر خسرو شاہ کا آسرا تلاش کرتے ہیں جو پہاڑوں کے دوسری جانب قندز اور حصار کا مالک اور تنہا وہی محافظت کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ بابر اس کے پاس جانے سے انکار کرتا ہے اور اپنی وادی کی طرف پلٹتا ہے جس پر تہل قابض ہو گیا ہے۔ وہ اپنی چپاولی جنگ کے رفیقوں کے ہمراہ راستہ کاٹ کر کوہ سیاہ (۲۸) کی پہاڑیوں میں ایک تنگ گھاٹی سے گھسا، جس میں خوفناک غار اور کراڑے تھے کہ آدمی یا جانور گرے تو وہیں ہلاک ہو جائے۔ آخر ایک خوش فضا جھیل کے کنارے ان قبائل میں پہنچ جاتا ہے جنہوں نے پہلے بھی اسے پناہ دی تھی۔ یہاں اسے ایک قلعہ ملتا ہے جو غیر آباد پڑا تھا۔ ساتھ والوں کی جن میں سلاخ بھی ہے، گنتی کی جاتی ہے تو دو سو چالیس آدمی نکلتے ہیں۔ اب وہ بھر بے گھرا اور اس خطے میں تیمور کا اکیلا وارث شہزادہ رہ گیا ہے۔ پہاڑوں کے نیچے ازبک شوارع عام سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی تعداد تین سے چار ہزار تک ہے۔ کچھ مدت میں شیبانی سمرقند کی فصیلوں میں اور مستحکم ہو جائے گا۔ لیکن --- میدان کے باغ سے خبر ملتی ہے کہ۔ ابھی یہ ازبک سردار احتیاطاً شہر کے باہر پڑاؤ میں ہے۔ ہنوز سمرقند والے اس کی خاطر جنگ نہیں کریں گے البتہ چند روز میں وہ ضرور شہر پر متصرف ہو جائے گا۔ لہذا اگر بابر کسی طرح اس وقفے کے اندر سمرقند کے اندر پہنچ جائے

تو ممکن ہے وہاں کے عوام پھر اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ اس کے سردار پہاڑی قلعے میں یہ بحث مباحثے کرتے ہیں۔ بابر ان کی رائیں سنتا اور آخر جواب دیتا ہے کہ ”ایک دفعہ شہر پر قبضہ ہو جائے تو پھر اللہ مالک ہے جو چاہے کرے۔“

بابر نے بے خبر شہر کو جالینے کے شوق میں جو حملہ کیا، اس میں خفت اٹھانی پڑی۔ بڑی فسیلوں کی حفاظت پر سپاہی تعینات اور پورے چوکس تھے۔ قسمت آزمائی کرنے والوں کو جس تیزی سے آئے تھے، اسی طرح الٹا جانا پڑا۔ اپنے پہاڑی مامن میں پہنچ کر بابر نے پھر حقیقت شناسی کے ساتھ اپنے حال پر نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ اپنے حریف شیبانی خاں جیسے ہنرمند و آزمودہ کار حریف کے مقابلے میں وہ ناتجربہ کار نوجوان ہے۔ ازبک کا خوف شہر والوں کو اس کی مدد کرنے میں مانع ہے قلعے کے پاسبان چوکنے ہو گئے ہیں۔ اور دوسرا چھاپہ مارا گیا تو تیار ملیں گے۔

یہ سب تو تھا لیکن اب اس کے لشکر میں خوراک کم ہوتی جاتی تھی۔ ایک دن اسی کے پاس چند سردار بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کام نہ تھا نہ کئی تجویز پیش نظر تھی۔ سمرقند کے حملے کے بارے میں غیبتیں کرنے کو رہ گئی تھیں۔ اتنے میں بابر نے بات کاٹ کر سوال کیا کہ ”اچھا یہ تو کہو ہم خدا کی عنایت سے سمرقند کب تک لے سکیں گے؟“ کسی نے کہا اگلی گرمیوں میں۔ یہ خزاں کے آخری ایام تھے۔ پھر بعض نے چالیس، کسی نے تیس کسی نے بیس دن کہے۔ سردار کو کلتاس (۲۹) نے کہا، ہم چودہ دن میں اسے لے لیں گے۔ خدا نے اس کی بات سچ کر دکھائی۔ واقعی ٹھیک چودہ دن میں ہم نے سمرقند جیت لیا۔“

”اس گفتگو کے بعد ہی میں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ سید اولیا حضرت (خواجہ عبید اللہ) احراری میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے استقبال کیا اور وہ اندر آکر بیٹھے۔ ان کے لئے دسترخوان بچھایا گیا مگر اس میں کوئی بات حضرت خواجہ کے مزاج کے خلاف ہوئی۔ میں نے اشارہ کیا کہ یہ قصور میرا نہیں ہے۔ حضرت سمجھ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ ہم ایک مکان کے دالان میں ہیں۔ وہاں حضرت نے میرا ایک بازو پکڑ کر مجھے اتنا اٹھایا کہ ایک پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ پھر ترکی میں کہا ”ایک ولی نے سمرقند تم کو دیا۔“ (۳۰)

”اس کے بعد اگرچہ ہمارا منصوبہ چھپا ہوا نہ تھا، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا اور دوبارہ سمرقند پر چلے۔ خواجہ ابوالکارم (۳۱) میرے ساتھ تھے (شاید خواب میں جو اشارہ تھا، اس کی

تعمیل کے لئے) ہم آدھی رات کو خیابان کی گہری خندق کے پل پر پہنچے اور وہاں سے ستر اسی آدمیوں کو سیڑھیاں دے کر بھیجا کہ غار عشاق کے مقابل فصیل پر چڑھ کر اندر سے فیروزہ دروازے کے پاسبانوں پر حملہ کریں اور قابو پا کر مجھے خبر بھیجیں۔ چنانچہ یہ جوان چڑھ گئے اور پاسبانوں کو خبر ہوئے بغیر اندر پہنچ کر پہرہ داروں کو مار ڈالا اور تیر سے قتل توڑ کر پھانک کھول دیا۔ لمحہ بھر میں میں پہنچا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ خانقاہ پر جا کر ٹھہرا تو احمد ترخان بھی کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں آ گیا۔ اکثر شہر والے پڑے سوتے تھے۔ مگر بعض دکانداروں نے دکانوں سے جھانک کر دیکھا اور مجھے دعائیں دیں۔ شہر بھر میں خبر پھیلی تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور میرے سپاہیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر انہوں نے گلی گلی، کھائی کھائی ازبکوں کو ڈنڈے اور پتھر مار مار کے اس طرح مارا جیسے بادے کتے کو مارتے ہیں۔ ازبک حاکم شہر خواجہ یحییٰ کے مکان میں رہتا تھا، وہ فرار ہو کر شیبانی خان کے پاس پہنچ گیا۔

میں خانقاہ کے دروازے میں استادہ تھا۔ صبح ہونے تک ہر طرف شور و غوغا مچتا رہا۔ بعض تاجر و عمائد شہر خوشی خوشی میرے پاس آئے اور جو کچھ کھانا تیار تھا، لا کر پیش کیا۔ دن نکلے معلوم ہوا کہ آہنی دروازے کے چھتوں میں ازبکوں نے پناہ لے رکھی ہے اور وہاں لڑائی ہو رہی ہے۔ کوئی پندرہ آدمیوں کو لے کر میں گھوڑے پر سوار ادھر چلا۔ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے شہر کے بلوائی جو لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، انہیں دروازے سے باہر نکال چکے تھے۔ سورج چڑھے شیبانی خان رات کا ماجرا سن کر گھوڑے پر سوار ادھر آیا۔ کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ موقع تو بہت اچھا تھا۔ مگر میرے پاس معدودے چند جوان تھے۔ شیبانی یہ دیکھ کر کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ آہنی دروازے سے میں قلعہ (ارک) میں اور محل کے باغ میں آیا۔ وہیں شہر کے معززین اور عمائد ملاقات اور مبارک دینے آئے۔

سمرقند قریب قریب ایک سو چالیس برس ہمارے خاندان کے پائے تخت رہا۔ ایک اجنبی، ازبک (کیسی نسل کا؟) دشمن اس میں گھس کر قابض ہو گیا تھا۔ بارے ہمارا یہ لٹا کھٹا شہر پھر ہمیں واپس مل گیا..... (میں نے جو دوسروں سے اسی قسم کے معاملات کا مقابلہ کیا، اس کا منشا) اوروں کی تنقیص اور اپنی خود ستائی کرنا نہیں، صرف واقعات بیان کئے ہیں۔ شعرا نے اس فتح پر نظمیں لکھیں۔ ان میں یہ شعر مجھے یاد رہا۔

باز گفتا خرد کہ تار بخش
فتح بابر بہادر است بداں
(مترجم)

دراصل، بابر حسب عادت پھر خوشی سے پھولا نہ سہاتا تھا اور یقین کر رہا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اوج پر ہے۔ تمام ولایت سمرقند میں باشندے ازبک جنوجوں کو جو قلعوں میں متعین تھیں نکال رہے تھے بابر ان فتوحات کو ایک ایک کر کے گناتا ہے۔ ادھر محتاط شیبانی فساد زدہ علاقے سے جانب مغرب ہٹ گیا۔ اب بابر کے اہل محل بھی سمرقند میں اس کے پاس آ گئے۔ اس کی دلہن عائشہ کے ہاں یہیں لڑکی پیدا ہوئی، اسے کہ چند ہی مہینے زندہ رہی فخر النساء کا نام دیا گیا تھا۔ بہن خازنادہ بیگم محل سرا میں اس کے ساتھ ساتھ گشت لگایا کرتی تھی گویا منحرف بھائی (جہانگیر) کی جگہ پر کرنا چاہتی ہے۔ اسی زمانے میں خبر آئی کہ شمال سے ایک قافلہ ازبکوں کے بعید پڑاؤ میں آیا اور شیبانی اور اس کے سرداروں کے اہل و عیال کو لے آیا ہے جس کے معنی یہ تھے کہ ازبک ان علاقوں میں ڈٹے رہیں گے۔ بابر اور اس کے رفیقوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ مستقل خطرہ ہے۔ چنانچہ موسم سرما میں انہوں نے عمر شیخ میرزا کے دور دور کے رشتہ داروں اور عزیزوں کو تائیدی پیام بھیجے کہ دشمن ازبک کے مقابلے میں بابر کے گرد پوری جمعیت کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ واقعی یہ ان کے لئے اتحاد کرنے کا وقت تھا۔

شیبانی خاں، جیسا بابر کہتا ہے، پرہیزی یا اجنبی ضرور تھا لیکن اس کا نسب کچھ غیر معروف تو نہ تھا۔ وہ چنگیز کے سب سے بڑے بیٹے جوچی کے ایک فرزند کا ہم نام تھا۔ اس کا جد امجد ذی شان باتو ”التون اردو“ (لشکر زرین) یعنی مغول کی صدر عسکری تنظیم کا مالک رہا تھا جس کی عمل داری روس کے شہروں سے وسط ایشیا کی کوہستانی فصیل تک وسیع تھی اگرچہ زیر نظر عہد میں اس کے اجزائے پر آئندہ صرف کنارہ والگا سے بحر اسود کے سواحل تک باہمی جنگ میں مبتلا رہ گئے تھے (مذکورہ بالا اقطاع میں منگول تاتاری جاگیرداروں کا تو ہمارے زمانے سے کچھ پہلے تک دور دورہ رہا) یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بابر کے زمانے میں انتشار پذیر التون اردو کا جزو کبیر انہی ازبکوں کے دم سے قائم تھا۔ شیبانی کے دادا کے ماتحت ان کی ایک بدوی قسم کی سلطنت حدود چین سے موسکو تک جو آئندہ ملک روس کا مرکز

سلطنت بنا، صحرائی اقطاع میں قائم ہو گئی تھی۔ پھر ان سے قزق (بہ معنی آوارہ گرد) قبائل ٹوٹ کر مشرق کی طرف کٹ گئے۔ ایک جنگ میں یونس خاں نے وحشی ازبکوں کو شکست دی اور شیبانی کے باپ کو قتل کیا۔ خود شیبانی جوانی میں بابر ہی کی طرح قسمت آزمائی کرتا پھرتا تھا۔ ازبکوں کے صدر گروہ پر ان سے بھی زیادہ جنگی قزاق اور جاہلی (کفار) کرغیز دباؤ ڈال رہے تھے۔ انہی کے دباؤ سے بچا کر شیبانی اپنے جنگ جو قبائلی جتھے کو بحیرہ ارال کی شمالی چراگاہوں سے عمداً جنوب کی طرف لے آیا تھا۔ دیکھ بھال کی ابتدائی تاختوں میں جو تیموری شاہزادوں کی سرسبز ولایات پر کی گئیں، شیبانی ان کی کمزوری سے آگاہ ہو گیا اور اب اپنی پوری قوم کو ان جنوبی اقطاع پر چڑھا لایا جو تیموری سلطنت کا قلب تھے۔ مشہور مزاروں کے شہر بخارا پر اس کا قبضہ جم چکا تھا۔ ازبک جنگ آزماؤں کے بیوی بچوں کی آمد بابر کے لئے پیشگی اطلاع تھی کہ اسبندہ سمرقند کو بھی فتح کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ کچھ خبر نہ تھی کہ شیبانی حملہ کس طرح کرے گا۔

پل کا معرکہ

بابر کے ایک نوجوان عزیز میرزا حیدر نے ازبک شیبانی کی نسبت یہ عجیب سی بات کہی کہ ”وہ برا آدمی ہے مگر درباری یا کاروباری آدمی نہیں ہے۔“ شیبانی خاں دربار میں کسی کو برائے بادشاہ بنائے رکھنے کی اور دوسروں کو بازار میں داد و دستد کرنے کی اجازت دیتا اور خود کشور کشائی سے شغف رکھتا تھا۔ سنت والجماعت مولویوں نے اسے تعلیم دی اور وہ تین زبانیں جانتا تھا۔ بظاہر شہری عورتیں اسے پسند کرتی تھیں اور بابر کا اسے وحشی کہنا درست نہ تھا۔ وہ فوراً فیصلہ کرتا، اپنے اصلی مقصد کو چالاکی سے چھپاتا اور سفاک آدمی تھا۔ اس کے خطرناک ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ وہ وحشیوں کا تعلیم یافتہ سردار تھا مگر اس بات کی اسے پروا نہ تھی کہ اس کے جنگی قبائل شہروں کو تاراج کر کے اپنی صحرائی مملکت تیار کریں گے۔ وہ چنگیز خاں کے سچے وارث ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور فی الواقع بعض تاریخ نویسوں نے اس کی سلطنت کو خانہ بدوشوں کی آخری حکومت قرار دیا ہے۔

موسم بہار کے آغاز (اپریل ۱۵۰۱ء) میں بابر اپنے مختصر لشکر کو لے کر چلا کہ ازبکوں کے پڑاؤ پر حملہ کرے یہ بات اس لئے بھی ناگزیر تھی کہ سمرقند کی بڑی فصیلوں کے اندر کوئی فوج ایسی حالت میں گزارہ نہ کر سکتی تھی جب کہ نواح میں جہاں اجناس خوردنی کے کھیت

تھے، دشمن چھایا ہوا ہو۔ بابر کو لوگوں نے ہوشیار کر دیا تھا مگر اس نے دانستہ اغماض کیا۔ رشتہ داروں سے اسے محض اظہار خیرگالی کے طور پر تھوڑی سی کمک بھیجی گئی تھی۔ یعنی مامون، محمود خاں نے چار پانسو سوار، دو سردار بھیجے۔ جہانگیر میرزا اب بروئے معاہدہ حلیف اور حاکم فرغانہ تھا۔ اس کی طرف سے، تبت کی دعائے فتح کے ساتھ سو جوان آئے۔ بعد مغرب کے تیموری شہزادوں نے ہر رات جیسے بڑے شہر سے، ہمت افزائی کا پیام تک نہیں بھیجا۔ نہ خسرو شاہ نے جو ترخانوں کا بڑا حامی بنتا تھا، کوئی کمک بھیجی کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ بابر اس سے باسفر کے قتل کا انتقام لے گا۔ تاہم کئی ترخان اپنی سماعتوں کے ہمراہ بابر سے آ ملے۔ خاصی بڑی فوج ہو گئی۔ پھر اسے اپنے طالع پر بھی اعتماد تھا۔ غلطی یہ کی کہ مزید کمک پہنچنے کا انتظار نہیں کیا۔ بابر نے اس غلطی کا اقرار کیا ہے اگرچہ بعد از وقت۔ غرض نواح سمرقند سے دیکھ بھال کرتے آگے چلے اور اس ندی تک پہنچے جو سمرقند سے بہ کر بخارا کے قریب سے گزرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ازبک ندی کے کنارے پڑے ہیں۔ ان کے مقابل لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ حفاظت کے لئے خندق کھودی اور شاخوں کی باڑ لگا دی۔

ہمارے شیر نے اب دوسری غلطی کھائی۔ قبر علی سلاخ باڑ کے پیچھے پڑے رہے اور جنگ میں دیر کرنے کا شاکی تھا۔ ادھر نجومیوں نے بتایا کہ دب اکبر کے آٹھ ستارے آج کل فریقین کے وسط میں آسمان پر قائم ہیں۔ لیکن چند روز بعد ازبکوں کی طرف چلے جائیں گے۔ بابر بعد میں اقرار کرتا ہے کہ یہ سب واہیات باتیں تھیں مگر اس وقت تو فوج کو باہر نکال کر دریا کے پل کی طرف لے چلا جہاں ازبک انتظار میں تھے۔

لڑائی شروع ہوئی تو بابر کی میدان کے ہر حصے پر نظر تھی لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالم خواب میں ہے اور بالارادہ کوئی حصہ نہیں لیتا بلکہ ہر طرف جو ہزیمت ہو رہی ہے اس میں اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ رہا ہے۔ سب سے اگلی صف جنگ میں قاسم بیگ اور سمرقند کے چیدہ جوان بڑھے تھے کہ ازبکوں کے قلب میں گھس جائیں۔ بابر اور باقی سپاہ اس پر جوش قراول کے عقب میں تھی جو دشمن کی صفیں توڑ دینے کا داعیہ رکھتا تھا۔ اول اول ایسا ہی ہوتا نظر آیا کہ تصادم ہوتے ہی سمرقندی مارتے کاٹتے ہوئے آگے چلے لیکن ان کا جھکاؤ دائیں طرف زیادہ تھا۔ اسی رخ دشمن پسپا ہوتا معلوم ہوا، مگر پھر لڑائی پھیل کر سمرقندی صفوں کے پیار پر ہونے لگی اور ادھر سے دشمن گھیرا دے کر ان کے پیچھے نکل آیا۔ بابر کو اپنے قریبی سواروں کو پیچھے مڑنے کا حکم دینا پڑا۔ لیکن اس طرح پلٹنے سے اس

کی فوج اپنے قراول سے جو شجاعانہ آگے چلا جا رہا تھا، جدا ہو گئی اور اوجھل میں آ گئی۔ اب وہ سمجھا کہ یہ ازبکوں (مغول) کی مشہور جنگی چال (تو لغم) تھی جس میں دائیں بازو کا بعید چیدہ رسالہ یکبارگی سرپٹ گھوڑے دوڑا کر تیر مارتا ہوا دشمن کے عقب میں پہنچتا اور اسے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ شیبانی خاں نے اس موقع پر اپنے ایک بازو کو اسی لئے پیچھے ہٹایا تھا کہ باہر کے دوسرے پہلو پر جا پڑے اور اسے گھیر کر نکلے نکلے کر ڈالے۔ قبل اس کے کہ قاسم بیک اور اس کے ساتھ بڑھ جانے والے جنگ آزما، اصل حقیقت کو سمجھیں، برق رفتار سواروں نے جنگ ختم کر دی تھی اور سمرقندی لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لڑ بھڑ کر اس مقتل سے نکلنے اور ندی کے کنارے پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا :

”میرے پاس اب دس یا پندرہ آدمی رہ گئے تھے۔ کوہک ندی قریب تھی جس طرح ہوا ہم اس تک پہنچے اور اگرچہ پوری طرح مسلح، زرہ پوش تھے لیکن گھوڑوں سمیت ندی میں در آئے۔ آدھی دور تک گھوڑوں کے قدم نکلے رہے پھر تیر کر پار کرنا پڑا۔ ساز و راق سے لدے پھندے تھے۔ ندی سے نکل کے گھوڑوں کے بھاری ساز کو کاٹ کر پھینک دیا اور شمالی کنارے پر دشمن سے دور ہو گئے۔ مغل جو میری مدد کرنے آئے تھے، اب لڑائی چھوڑ کر میرے جوانوں کو گھوڑے سے اتار کر کپڑے اتروانے لگے۔ یہ پہلا موقع نہ تھا کہ انہوں نے ایسا کیا۔ ان کم بخت مغول کا طریقہ یہی ہے۔ اگر دشمن پر غالب آئے تو سب سے پہلے وہی اسے لوٹنا شروع کرتے ہیں اور اگر شکست ہوئی تو خود اپنے حلیفوں کو لوٹ کر چل دیتے ہیں۔ اس موقع پر ابراہیم ترخان اور بہت سے اچھے اچھے جوانوں کو انہوں نے گھوڑوں سے اتارا اور قتل کر ڈالا۔“

بعد میں بابر نے یا اور کسی نے ترک کے اس صفحے پر یہ شعر بھی لکھ دیا تھا کہ :

”مغول اگر فرشتے کی نسل سے ہوں تو وہ نسل بری ہے،
مغول کا نام آب زر سے لکھا جائے تو وہ بھی برا ہی رہے گا“

اپنے بزرگوں کی نسل کو اس طرح قلم زد کرنے کے بعد، بابر نے پل کی لڑائی ہارنے پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ ”وہ جو شباب کاری کرتا ہے آخر میں اسے انگشت تاسف چبانی پڑتی ہے۔“ اس کا رنج و ملال حقیقت میں گہرا اور ناقابل تسلی تھا۔ چند ہی روز پہلے وہ ایک عظیم حصار بند شہر میں تخت نشین ہوا۔ اہل شہر نے جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا۔

امدادی فوجیں ہر طرف سے آرہی تھیں۔ اگر چندے اور خندق سے محفوظ پڑاؤ ہی میں رہتا کہ اس کی فوجی جمعیت بڑھتی اور ازبک مجبور ہوتے کہ حملے کا خطرہ مول لیں!

آئندہ پھر کبھی بابر نے اجیر سپاہیوں پر اعتماد نہیں کیا اور نہ نجومیوں کو اجازت دی کہ اس سے کوئی فیصلہ وہ کرائیں۔ علیٰ ہذا وہ صحرائی سواروں کے اس خوفناک جھپٹے (تو لغم) کو بھی نہ بھولا جس نے اس کے لشکر کو پیچھے سے آگھیرا تھا۔ کیونکہ اس جنگلی چال کے سامنے اچھے سے اچھے گھوڑے اور اسلحہ یا ذاتی شجاعت کام نہ دے سکتی تھی۔ اسی حملے کی وجہ سے اس کے بہت سے جاں نثار ساتھی اور بہترین سپاہی دریا کے کنارے مارے گئے۔ پھر سرقند کی طرف مارا مار پسپائی میں اس نے باقی ماندہ فوج کا انتشار معائنہ کیا۔ مغل کمکی تو ظاہر ہے اپنی لوٹ کے ساتھ سب چل دیئے تھے۔ لیکن بعض طاقتور سردار بھی آئندہ مصائب کے آثار دیکھ کر ایسے گئے کہ پھر سرقند کی صورت نہ دیکھی۔ تیر علی آیا بھی تو صرف اس غرض سے کہ اپنے بال بچوں اور مال اسباب کو لے کر نکل جائے اور خسرو کا دامن تھامے۔۔۔۔۔ (یہاں بابر لالابالی سلاح کی مغل نژاد کو یاد کرتا ہے) ایک اور سردار وفادارانہ واپس آیا کہ بابر کے جلسہ مشاورت میں شریک ہو لیکن اپنے اہل و عیال کو دوسری جگہ بھیج کر آیا تھا۔ اور اس کا مطلب بابر سے مخفی نہ رہا۔

وہ اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اس نے اپنے حاکم رشتہ داروں سے مدد کی جو التجا کی تھی وہ اس نازک وقت میں بے اثر رہی۔ کیونکہ کامرانی کے زمانے ہی میں اسے بہت کم مدد ملی تھی تو اب شکست کھانے کے بعد وہ اس کی کیا امید کر سکتا تھا۔ پھر بھی یہ سن کر وہ ہچ و تاب کھائے بغیر نہ رہا کہ بعید ہرات کے سلطان (۳۲) نے دوستانہ سفارت روانہ کی تو وہ اس کے پاس نہیں، بلکہ شیبانی خاں کے لئے بھیجی گئی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود بابر نے ٹھان لی کہ جب تک جان ہے سرقند کی مدافعت کی جائے۔ قاسم بیگ اور خواجہ ابوالکلام جان نثاری سے مشورے میں شریک تھے اور اپنی پچی کچھی جمعیت کے قابل اعتماد جوانوں کی کمک ہر جگہ لے جانے پر آمادہ ہوئے۔ تجویز یہ ہوئی کہ فیصل کی نگرانی اہل شہر کریں اور جہاں خطرہ ہو وہاں یہ جوان دوڑ کر مدد کو پہنچ جائیں۔ شہر پناہ اتنی مستحکم تھی کہ تھوڑی دیر تک اس پر حملہ آوروں کو روکا جاسکتا تھا۔

اس اثنا میں بابر کی نومولود لڑکی فوت ہو گئی اور عائشہ بیگم چلی گئی تھی۔ خاندانہ جنگ و جدال میں بے بس تھی، اپنے والان میں پڑی کڑھتی رہتی تھی۔

پناہ گزینوں کا شعل فراری رہ گیا

ہزیمت اٹھانے کے بعد شیر نے بہادری سے کام لیا۔ اس کا عزیز میرزا حیدر لکھتا ہے کہ ”باہر دلیری میں اپنی ساری قوم میں بڑھا چڑھا تھا اور اس کی قوم والوں میں کسی نے ایسے عجیب نشیب و فراز نہ دیکھے تھے۔“

ازبک نواح شر پر قابض اور ہاتھ پاؤں بچا کے فصیلیں دیکھتے پھرتے تھے۔ باہر کو معلوم ہوا کہ محاصرے میں ایک بڑا مسئلہ شہر والوں کو قابو میں رکھنا تھا۔ انہیں کوئی چشم زخم نہیں پہنچا تھا اور جہالت کی دلیری دکھا رہے تھے لکھتا ہے:

”میں نے اپنا خیمہ مدرسہ الف بیک کی بڑی محراب کے نیچے لگوا دیا۔ بازاری عوام گلی کوچوں سے نکل نکل کر محراب تک آتے اور درود و صلوٰۃ کے نعرے لگاتے تھے۔ جب یہ بھیڑ کی بھیڑ باہر تک جانے لگی تو شیبانی خاں نے احتیاطاً ان پر حملہ نہیں کیا لیکن چند روز میں بڑھ کر دروازہ آہنی کے قریب تر آ گیا۔ بازاری لوگ زیادہ دلیر ہو گئے تھے۔ دور تک آگے چلے۔ میں نے بازگشت کی حفاظت کے لئے سواروں کی ایک ٹکڑی نویان کو کل تاش کی قیادت میں روانہ کی۔ اس میں چند اور کو کہ اور میرے ملازمان خاص شامل تھے۔ ازبکوں نے گھوڑوں سے اتر کر یورش کی اور عوام کو دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ پناہ گزینوں کو سوائے فراری کے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ البتہ میرے آدمیوں نے تلواریں سونت کر ازبکوں پر حملہ کیا تو عوام رک کر داد دینے لگے۔ میں دروازے کی چھت سے کمان چلا رہا تھا۔ ایک دن اس کمان سے میں نے شرط باندھ کر ایسا تیر مارا کہ ایک ہی زخم سے ایک ازبک سردار کے گھوڑے کو ہلاک کر دیا.....

ازبک حملہ کرتے کرتے دروازے کے قریب آ گئے اور فصیل کے نیچے قدم جمائے۔ میں اس قدر جنگ کرنے میں مشغول تھا کہ شہر پناہ کے دوسرے حصے کی حفاظت کا خیال نہ رکھا۔ شیبانی خاں نے ظاہر میں تو میری جانب حملہ کیا لیکن آٹھ سو آدمی اور پچیس چوڑی سیڑھیاں چھپا کر دوسری طرف سے حملہ کرا دیا۔ بائیں ہمہ قوچ بیک اور تین دوسرے بہادروں نے دوڑ کر انہیں روکا اور چڑھ آنے والوں کو مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ سب سے بڑھ کر قوچ بیک نے بہادری دکھائی اور کار نمایاں انجام دیا ایک اور موقع پر قاسم بیک دروازہ سوزن گراں سے جمعیت لے کر نکلا اور کئی ازبکوں کو گھوڑوں سے گرایا۔ چند سر کاٹ کر لایا۔“

ذاتی بہادری فصیلوں کا دفاع کر سکتی تھی لیکن محصور شہر کے مصائب دور نہ کر سکتی تھی۔ تجربہ کار اذکیوں نے ایسی آویزشوں کو چھوڑ کر محاصرے کا دائرہ تنگ کیا اور راتوں کو ڈھول دماے بجا بجا کر مدافین کو تنگ کرنا شروع کیا جو تھکے ماندے بستر چھوڑ چھوڑ فصلیں بچانے کو بھاگ کر آتے تھے۔ مزید برآں اب انہیں بھوک ستانے لگی تھی۔ فصلیں تیار ہو گئی تھیں۔ مگر شہر میں کوئی نیا غلہ نہ لاتا تھا۔ لوگ بہت تنگ ہو رہے تھے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ کتوں اور گدھوں کا گوشت کھانے لگے تھے۔ گھوڑوں کا دانہ چارہ نہیں رہا تھا۔ درخت کے پتے کھلائے جا رہے تھے۔ ان میں شہتوت اور درخت ”قزاقچ“ کے پتے بہتر کام دیتے تھے۔ معصوموں نے درختوں کی چھال پانی میں بھگو کر کھلائی۔ باہر سے کوئی کمک نہیں آئی کہ ہم کو محاصرے سے نکالتی۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ قلعے کی حفاظت کے لئے ایک سر، دو ہاتھ دو پاؤں درکار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سر یعنی سردار، فوج اور کمک دو ہاتھ اور قلعے کے اندر خوراک اور پانی یہ دو پاؤں ہیں۔ ہم مدد کے لئے ارد گرد نظر ڈالتے تھے تو جو مدد دے سکتے تھے ان کی توجہ دوسری طرف تھی۔ سپاہی اور شہری دونوں کی آس ٹوٹ گئی اور وہ دو دو چار چار کر کے ساتھ چھوڑنے لگے..... میرے ذاتی ملازمین، معتبر اشخاص تک فصیل سے خود کو گرا کر فرار ہونے لگے۔ اب محاصرے سے نجات ملنے کی بالکل امید نہیں رہی۔ سامان خوراک کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔

شیبانی خاں کو ہمارے مصائب کا علم تھا۔ اب وہ آگے بڑھا اور غار عشاق میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ ادھر سے میں نے بھی اس کے سامنے کوئے پایاں میں رہنا اختیار کیا۔ انہی دنوں اوزون حسن (مغلوں کا ایک سابق سردار) دس پندرہ آدمیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا۔ وہ جمائگیر میرزا کی بغاوت کا، جس کی وجہ سے مجھے پہلے سمرقند سے نکلنا پڑا، سرغنہ تھا۔ اس بار پھر اس کا اتنا بڑی جرات کی بات تھی۔ شیبانی خاں نے (اس کی وساطت سے) صلح کی گفتگو کی۔ اگر کہیں مدد یا خوراک ملنے کی کوئی امید ہوتی تو میں اس کی طرف بالکل اعتنا نہ کرتا۔ مگر مجبوراً کرنی پڑی اور بری بھلی صلح کی شرطیں طے ہو گئیں۔ آدھی رات کو میں شہر کے شیخ زادہ دروازے سے سمرقند سے نکل آیا۔ میری ماں خانم بھی میرے ساتھ تھی لیکن گڑبڑ میں بڑی بہن خانزادہ بیگم رہ گئی اور شیبانی کے ہاتھ آگئی۔ ”(مگر بابر کے اس قول کے خلاف حیدر میرزا کا بیان ہے کہ خانزادہ بیگم ازبک کے حوالے کر دی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا

ہے کہ یہ بلند ارادہ شہزادی خود شیبانی کے ہاں چلی گئی۔ اگرچہ جہاں تک ممکن تھا برابر اپنے بھائی کے لئے کام کرتی رہی۔ چاہنے والی ثانی نے بھی سرقد میں رہ جانا پسند کیا اور ان دو خاتونوں نے اس حال میں بھی موہوم امیدوں کو نہ چھوڑا

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو شیبانی کے وعدے پر کہ انہیں بخیر و سلامت جانے دیا جائے گا، بھروسہ نہ تھا اور اس کی مختصر جماعت رات کے وقت کھلے میدان کی بجائے دریا کی طرف سے راجہوں کے کنارے کنارے روانہ ہوئی۔ ”ان نہروں میں ہم راستہ بھول گئے۔ نماز فجر کے قریب صرف فاروغ کے ٹیکے تک پہنچے۔ راستے میں قبر علی اور قاسم بیگ سے میں نے گھڑ دوڑ کی اور دونوں سے آگے نکل گیا۔ انہیں دیکھنے کے لئے زین پر سے مڑا تھا کہ خود زین اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور تنگ ڈھیلا ہونے کے باعث میں سر کے بل زمین پر گرا۔ ہرچند اسی وقت اچھل کے پھر سوار ہو گیا لیکن شام تک دماغ صاف نہیں ہوا اور اس عرصے میں جو کچھ گزرا، وہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خواب کے واقعات ہیں۔ شام کو ہم ایلان اوتی میں گھوڑوں سے اترے۔ ایک گھوڑا ذبح کیا۔ گوشت بھونا، پھر سوار ہر کر چل پڑے..... دزخ میں ہمیں فریہ گوشت، میدے کے عمدہ نان، کثرت سے خربوزے اور اعلیٰ درجے کے انگور ملے۔ ایسی نامی سری کے بعد یہ افراط اور کیسی کچھ سختی کے بعد یہ امن و راحت نصیب ہوا۔ شعر:

موت کا خوف دل سے ہو گیا دور
بھوک کی آگ ہو گئی کافور

ایسا آرام و سکون ساری عمر ہم نے نہ دیکھا۔ شادمانی وہی بہت خوب ہوتی ہے جو رنج و تکلیف کے بعد میسر ہو۔ آئندہ زندگی میں چار پانچ دفعہ ہی مصیبت کے بعد ایسی راحت مجھے ملی مگر یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک موذی دشمن سے مجھے نجات ملی تھی دو تین روز تک ہم نے آرام کیا اور لطف اٹھایا۔“

ہمارا شیر پھر پہاڑیوں میں گلہ بانوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ سردیاں چمکنے سے قبل اس نے اپنی دوسری جلا وطنی کے معاملات کا انتظام کیا اور بیمار ماں کو لے کر تاشقند میں اپنے ماموں محمود خاں سے رہنے کے لئے کوئی بستی مستعار مانگی۔ اس نے جو مقام دیا وہ محض ایک گاؤں وہ کت (۳۳) تھا۔ ایک اونچے پہاڑ کے بازو میں یہ چرواہوں کے ٹیکے تھے۔

نجندی شاہراہ یہاں سے نظر آتی تھی۔ وہ کت میں کئی سرداروں نے جن میں چلبلا تمبر علی شامل ہے، اور جو اس طرح بھیڑ بکریوں میں کہ کہیں ہاتھ مارنے کا موقع نہ تھا، رہنا پسند نہ کرتے تھے۔ بابر سے اندجان کی نواح میں اپنے اہل و عیال کے پاس جاڑے گزرنے کی اجازت مانگی بابر نے انہیں جانے دیا۔

برے بھلے ہر حال میں وقت کو اچھی طرح گزرنے کا اس میں مادہ خداداد تھا۔ سمرقند میں ملک و مال سب کچھ ہاتھ سے دے کے راتوں رات ماں کے ساتھ کھائیوں اور نالوں کے راستے پچتا پچاتا نکلا تو صبح کو راستہ نظر آتے ہی گھڑ دوڑ کی سو جھی تھی۔ اب غربت میں ان ٹیکوں میں گشت ہی لگانا شروع کیا اور اپنی دلچسپی کے سامان ڈھونڈ لئے۔ لکھتا ہے :

”یہاں کے باشندے اگرچہ (فارسی بولنے والے) سرت (۳۴) ہیں لیکن ترکوں کی طرح بھیڑوں، گھوڑیوں کے بڑے بڑے گلے پالتے ہیں۔ اسی گاؤں کی بھیڑوں کی تعداد ۴۰ ہزار ہو گی۔ ہم یہاں کسانوں کے گھروں میں مقیم ہوئے۔ میں چودھری کے مکان میں اترا جو بہت سن رسیدہ کوئی اسی سال کی عمر کا ہو گا۔ مگر اس کی ماں زندہ اور اس کی عمر ایک سو گیارہ سال کی تھی۔ کتنی طویل زندگی اسے ملی۔ کہتی تھی اس کا کوئی رشتہ دار ہندوستان پر فوج کشی میں امیر تیمور کی سپاہ میں تھا۔ اسے یہ بات خوب یاد تھی اور مجھے سنایا کرتی تھی۔“

بابر نے حسب عادت حساب لگایا کہ گلہ بانوں کی یہ بزرگ خاتون تیمور کی فتح ہندوستان کے وقت پانچ سال کی ہو گی اسی عمر میں بابر نے سمرقند کے محل میں تیموری فتح کی تصویریں دیواروں پر بنی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ عروج رفتہ کا موبہوم سا اشارہ تھا۔ شیر نے ان خیالات میں کھو جانا تصعب اوقات سمجھا۔ مگر بالفعل یہ بات بھی ذہن میں نہ تھی کہ وہ آئندہ کیا کرے گا۔ لہذا اور کچھ نہیں تو اس نے صد سالہ بڑھیا کی اولاد کا حساب لگانا شروع کیا : ”اسی گاؤں کے علاقے میں اس کی اولاد، یعنی بیٹے، پوتے، پوتے، سروتے ۹۶ موجود ہیں۔ مرنے والوں کو بھی شمار کیا جائے تو اس کی اولاد کی کل تعداد دو سو نکلتی ہے۔ اس کے پوتے کا ایک پوتا ۲۵، ۲۶ برس کا گھرو جوان تھا۔ بھری ڈاڑھی سیاہ تھی“

حسب معمول بابر نے پہاڑی بیٹوں میں گھومنا شروع کیا۔ اکثر کسی خواجہ (مذہبی آدمی)

کے ساتھ اور اس سے باتوں میں وہ منہمک رہتا تھا :

”عام طور پر میں ننگے پیر چلا کرتا تھا۔ اس عمل سے پاؤں کے تلوے ایسے سخت ہو گئے تھے کہ روڑی پتھر کی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کے گشت لگاتے میں ایک دن عصر

و مغرب کے درمیان ہمیں ایک آدمی ملا کہ پگڈنڈی پر گائے لئے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کھلا راستہ کدھر ہے؟ کہنے لگا اس گائے کے پیچھے چلے آؤ۔ اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دو یہاں تک کہ وہ بڑے راستے پر پہنچ جائے۔ میرے ساتھ خواجہ (اسد) تھا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ”بھلا گائے راستہ بھول گئی تو ہم عاقل انسانوں کا کیا بنے گا؟“

”ان سردیوں میں قاسم بیگ بار بار کہتا تھا کہ آپ کے آدمی اندجان جا رہے ہیں۔ شہزادہ جمالتیر میرزا کو آپ کوئی تحفہ ضرور بھیجیں۔ میں نے اپنی قائم کی ٹوپی ہدیہ۔“

قاسم بیگ نے کہا تبتل کو بھی کچھ بھیج دیجئے تو کیا مضائقہ ہے۔ میرا جی نہ چاہتا تھا مگر اس کے اصرار پر (بہ تصحیح مترجم) نویان (نویں) کو کل تاش نے سمرقند میں جو بھاری تلوار ہوائی اور میں نے لے لی تھی، تبتل کو بھیج دی۔ اگلے سال یہی تلوار خود میرے سر پر چلائی گئی جیسا کہ آگے بیان کروں گا۔

”چند روز بعد میری نانی ایسان دولت بیگم جو میرے سمرقند چھوڑنے کے وقت وہاں رہ گئی تھی، اپنے بھاری اسباب، چند متعلقین اور کچھ ننگے بھوکے آدمیوں سمیت میرے پاس آ گئی۔“ من رسیدہ نانی کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سمرقند کی خبریں آئیں۔

”شیبانی خاں نے دریا (سیر) کو بھند پر منجمد جگہ سے عبور کیا اور مضافات کو لوٹ رہا تھا۔ ہم نے یہ سنا تو جماعت قلیل ہونے کے باوجود اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ ہم بھند کے نیچے تک آئے بلا کی سردی پڑ رہی تھی اور ہر وقت ہوا ایسی تند و تیز تھی جیسی ہارویش میں چلتی ہے (یہ کاروانی شاہراہ کے صحرائی ٹکڑے کا وہ مقام ہے جہاں مشہور تھا کہ آندھی میں چند بے نوا فقیر ہارویش ہارویش پکارتے پکارتے ہلاک ہوئے۔ وہاں کی تیز ہوا ضرب المثل ہو گئی تھی) شدت سرما کی وجہ سے ہمارے دو تین ساتھی ضائع ہو گئے۔ مجھے غسل کی حاجت ہوئی۔ ایک نہر میں جس کے کنارے کا پانی بخ بستہ مگر ہماؤ کے باعث بچ (۳۵) میں برف نہ تھی، میں نے غسل کیا۔ سولہ غوطے لگائے۔ سارے جسم کے اندر سردی سرایت کر گئی۔ دوسری صبح ہم بھی بھند کے قریب برف پر سے دریا پار ہوئے۔ لیکن شیبانی خان گاؤں لوٹ کر جا چکا تھا۔“

واپسی کے سفر میں بابر کو ایک صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ اس کا عزیز ترین رفیق نویان کو کلکٹاش جو ایک مقامی ضیافت میں پیچھے رہ گیا تھا، پہاڑی سے جہاں ضیافت ہوئی، ناؤ نوش کے وقت عجیب طور پر کھڈ میں گرا اور مر گیا۔ بابر کو سخت رنج اور شبہ ہوا کہ ایک ہرجائی

نوجوان (۳۶) جو اس سے دلی کینہ رکھتا تھا اس حادثے کا باعث ہوا لیکن مرنے والا مرچکا۔
سوائے اس کے کہ شدنی کہہ کر صبر کرے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

آمد ہمارے پہاڑوں پر برف کی سر توڑی۔ ایک روز ہمارا شیر کنار آب ایک دلکش پتھر پر چند حکیمانہ اشعار کندہ کروا کے خوش ہو رہا تھا کہ خبر ملی ازبک خود اس کے گاؤں کی طرف شارع عام پر دیکھے گئے۔ کولکناش کا صدمہ ابھی تازہ تھا۔ پریشانیوں میں خیال آیا کہ اس طرح بے در بے گھر بلا ملک و وطن پہاڑوں میں پڑے پھرنے سے کیا حاصل ہو گا۔ ”میں نے دل میں کہا بہتر ہے کہ ہم خان کے پاس تاشقند چلیں۔“ قاسم بیگ اس رائے کے سراسر خلاف تھا۔ اس نے سزاء ”تین چار مغل قتل کرائے تھے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اب وہ ان کے ہم وطنوں میں جانے سے اندیشہ مند ہوا اور میرے کہنے سننے سے بھی رضامند نہ ہوا اور اپنے بھائی بند، رفیقوں سمیت رخصت ہو کر حصار (خرو شاہ کا سرحدی مقام) چلا گیا..... میں خان کے پاس تاشقند کو روانہ ہوا۔“

عید رمضان ہونے تک ٹھہر کر بابر چلا تو ملازم خاص کے سوا صرف تین چار آدمی ساتھ چلنے کا ساز و سامان کر سکے۔ ماموں کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے کوئی مناسب تحفہ نہ تھا لہذا ایک رباعی لکھی اور تراش خراش کر کے ماموں کو سنائی۔ پہلا مصرعہ تھا کہ ”آفت زدہ کی دوسرا کوئی خبر نہیں لیا کرتا۔“ البتہ خود آفت زدہ نے سوچا تھا کہ خان اس کے واسطے کیا کر سکتا ہے۔

چنگیزی جھنڈوں کے ساتھ

محمود خاں نے بھانجے کا محبت سے خیر مقدم کیا۔ صحرائی قبائل کی مخلصانہ مہماں نوازی کی۔ اگرچہ وہ خود تھوڑی بہت شاعری کیا کرتا تھا مگر مغلوں کے رسمی رئیس اعلیٰ نے ازراہ احتیاط التجا آمیز رباعی کو سن کر کچھ نہیں کہا۔ بابر افسردہ ہو کر لکھتا ہے ”بظاہر خان بھی کلام کے حسن و فتح سے زیادہ واقفیت نہ رکھتا تھا۔“

اسی احتیاط کے ساتھ اس نے بابر کی تازہ تجویز کہ وہ دونوں مغلوں کا لشکر لے کر چلیں اور باغی تبت کو سزا دے کر ملک چھین لیں، قبول کی۔ طاقتور ازبک کی نسبت تبت بہر حال کمزور حریف تھا اور محمود خاں کے تجویز قبول کرنے میں اور مصلحتیں بھی تھیں جن کا اس نے اظہار نہیں کیا۔ لشکر کا کوچ خاص دھوم دھام کی رسموں سے ہوا اور بابر کو معلوم ہوا کہ

جنگی جھنڈوں کو برکت دینے کی قدیم رسم میں اسے بھی حصہ لینا ہو گا :

”ساری فوج باقاعدہ ایک بڑا دائرہ بنا کر کھڑی ہوئی۔ قدیم قاعدے کے مطابق ترہیاں (نفیرس) بجیں۔ خان گھوڑے سے اتر۔ اس کے سامنے نو جھنڈے لائے گئے جن سے گھوڑوں کی دھن لٹک رہی تھیں۔ ایک مغل نے لمبی سفید چادر کے سرے سے تیل کی ران کی ہڈی کو باندھا۔ وہ اسے تھامے رہا۔ دوسرے نے تین ایسی ہی چادریں جھنڈوں کی بلیوں پر دموں کے نیچے باندھیں اور پھر چادروں کا نچلا رخ پھیلایا کہ خان اس کا بیٹا اور میں ان کے اوپر کھڑے ہو جائیں۔ اب جس مغل نے چادریں باندھی تھیں، اس نے تیل کی ہڈی اپنے ہاتھ میں لی اور جھنڈوں کی طرف دیکھ دیکھ کر، کچھ اشارے کر کے بعض الفاظ کہے۔ خان اور اس کے گرد کھڑے ہونے والوں نے (پیالوں میں) گھوڑی کا دودھ لے کر تھوڑا تھوڑا جھنڈوں پر چھڑکا۔ پھر سب نثارے اور بوق (ترہیاں) یکبارگی بجائے گئے اور پوری فوج نے جھنڈوں کی طرف منہ کر کے تین دفعہ جنگی نعرے لگائے۔ اچھل اچھل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تین دفعہ جھنڈوں کے گرد سرپٹ دوڑایا اور نعرے مارتے رہے۔

”جنگیز خاں نے جیسے قاعدے بنا دیئے تھے ٹھیک اسی کے مطابق یہ مغل آج تک عمل کرتے ہیں۔ ہر شخص کی صفوں میں دائیں بائیں وہی جگہ مقرر ہے جہاں اس کے باپ دادا کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بھروسے کے لوگ یمنیں و یسار کے سروں پر دور کھڑے ہوتے ہیں..... دوسری صبح پھر فوج نے بڑا دائرہ بنایا لیکن یہ شکار کھیلنے کی غرض سے تھا۔“

صحرائی جنگ آزماؤں کی ان قدیم رسوم سے بابر کو زیادہ دلچسپی نہ ہو سکی۔ وہ مہمان کے طور پر شریک ہوا اور چونکہ یونس خاں کا نواسہ تھا، اس کی ان تقریبات میں عزت و توقیر مرعی رکھی گئی۔ پھر بھی اگلے دن گیارہ زار میں شکار کھیلایا گیا تو پہلی مرتبہ اس نے شکار میں شرکت سے اجتناب کیا اور اس میں شریک ہونے کی بجائے ایک غزل تیار کرنے میں مشغول رہا، جس کا مطلع تھا :

”جان کے سوا کوئی دوست مجھے نہ ملا“

بجز اپنے دل کے کسی کو میں نے محرم راز نہ پایا۔“

لشکر میں اس کی چینی کا طلائی حلقہ چوری ہو گیا تو اسے حد سے زیادہ ناگواری ہوئی۔

اگلے دن دو تین مغل لشکر سے فرار ہوئے تو اس نے دل میں انہی سے چوری منسوب کی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ مہم محض اس کی خاطر مشق کے طور پر چلائی گئی تھی۔ لکھتا ہے کہ ”خان نے کوئی قلعہ نہیں لیا۔ کسی دشمن کی گوشتالی نہیں کی۔ بس باہر گیا اور واپس آ گیا۔“

تاشقند واپس آ کر بابر کو کوئی آرام و اطمینان میسر نہ ہوا۔ میدانی علاقے کے اس بزرگ شہر میں جو دریائی شاخوں کے درمیان آباد اور فصیل بند کیا گیا تھا جامع مسجد میں دور دور کے لوگ نئی نئی شکلیں جمع ہوا کرتی تھیں۔ بابر کو ان سے کوئی سروکار نہ ہو سکتا تھا۔ سرقت کے کاروان گھینٹاں بجاتے دور شاہراہ سے گزرتے تو وہ آوازیں اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ یہیں سے بھاری مال کے قافلے مشرقی پہاڑوں کی نیلگوں بلندیوں کی طرف مڑ کر چین کی بڑی شمالی شاہراہ پر پڑ لیتے تھے۔ تاشقند میں کوئی تخت تاراج نہیں ہوئی لیکن اہل علم سے جو شہر کی جان ہوتے ہیں، خالی تھا۔ باہر چراگاہوں میں گھوڑوں اور مواشی کی کمی نہ تھی۔ لوگ پیٹ بھر کے اچھا گوشت، خشک میوے، تازہ گرم نان کھاتے تھے۔ گلی کوچوں میں زندگی کے لطائف و عجائبات پر زبان کھولنے والا کوئی شاعر نہ تھا۔ البتہ فقیر روتے جھینکتے بھرتے تھے تو انہیں دینے دلانے کے لئے بابر کے پاس نکا نہ تھا۔ خان کے دربار میں وہ جاتا تو دو تین آدمی سے زیادہ جلو میں نہ ہوتے جن سے توقیر ظاہر ہو۔ اسے اس طرح بسر کرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اپنی افتاد مزاج کے مطابق اسے آرزو تھی کہ گھوڑا لے اور اس مصیبت سے نکل جائے۔ زیادہ ان کس طرح ٹھہر سکتا تھا کہ لوگ اس کی بے سروسامانی پر انگلیاں اٹھائیں۔ سوچتا تھا کہ کسی ایسے ملک میں نکل جائے جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ چین کے راستے جانے والے قافلوں کو سامان لادنا دیکھ کر دل میں گدگدی ہوئی کہ وہ بھی اسی طرف نکل جائے۔ حسب معمول اس نے دل ہی دل میں اس منصوبے پر بحث کی کہ کوئی حتمی فیصلہ کر سکے۔ کیا وہ ہمیشہ سے سیر و سفر کا شائق نہ تھا جس سے فرغانہ میں بادشاہ ہو جانے کی ذمہ داریوں نے اسے باز رکھا؟ اب وہ بادشاہی تو قصہ ماضی ہوئی۔ اس کی ماں، اپنی ماں اور چھوٹے بھائی (محمود خاں) کے پاس حفاظت سے رہتی ہے۔ علی ہذا اس کی چھوٹی بہنیں محفوظ ہیں۔ بڑی بہن، اس کے حق میں اچھا ہو یا برا، بہر حال شیبانی خاں کی تحویل میں ہے۔

شیبانی کا دھیان آتے ہی بابر کو ماموں کا گھر چھوڑنے کی ایک تدبیر سوچھی اگرچہ عملًا

خان کے گھرانے کا فرد بن جانے کے بعد الگ ہونا سل نہ تھا۔ تاہم وہ فوراً اپنے مخلص اور دین دار مشیر (بہ تصحیح مترجم) خواجہ ابوالکلام کے پاس گیا اور دونوں نے مل کر خاصی معقول وجہ سوچ لی جسے خان کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ تھی شیبانی۔ یہ ازبک بابر کے ترکوں اور محمود کے مغلوں، دونوں کا مشترک دشمن تھا۔ ضروری تھا کہ اس کی قوت اور زیادہ مستحکم ہونے سے پہلے، آج اس کا تدارک کیا جائے۔ آگ کی آج نکلنے کے ساتھ ہی اسے بجھا دیتے ہیں ورنہ بھڑک اٹھنے کے بعد وہ قابو میں نہیں رہتی۔ بابر نے بر محل ایک قطعہ تیار کیا جو اس کاموں بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس کا آخری شعر یہ تھا:

• سہارا کہ زہ کند کماں را
دشمن کہ یہ تیر می توں دوخت

تجویز تو مرتب ہو گئی، اب سوال تھا کہ وہ کس طرف جائے؟ خیال آیا کہ کیوں نہ مشرق میں اپنے چھوٹے ماموں کے دربار کا رخ کیا جائے۔ بابر اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ اب مشہور ہوا کہ اسے ازبک کے مقابلے میں شریک کرنے کے لئے تاشقند لانے کی غرض سے جا رہا ہے۔ یہ چھوٹا ماموں چین کی شاہراہ پر تھا۔ بابر نے اپنے بلاد چین کو چلے جانے کی بات کسی کو، غالباً ابوالکلام کو بھی نہیں بتائی تھی۔ اس کی ماں ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی اور باقی ساقی رفیق بھی ساتھ چھوڑ کر چل دیتے۔ مگر شیر کے ماموں کے ہاں سے نکل جانے کی یہ ایچ بیچ کی چالیں، چل نہ سکیں۔ خواجہ ابوالکلام نے اس کے حسب ایما (چھوٹے ماموں کے پاس جانے کا) ثانی سے ذکر کر دیا اور جیسی توقع تھی فوراً خان تک خبر پہنچ گئی اس نے خواجہ کو طلب کیا اور پوچھا کہ بابر سے ایسا ناروا برتاؤ کیا کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح جانا چاہتا تھا؟ صریحاً خان کو برا معلوم ہوا۔ اس نے بھانجے کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس طرح چین کی طرف نکل جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا، پھر ایک بات ایسی پیش آئی کہ وہ بالکل ختم ہو گیا۔ بابر صفائی سے تزک میں اقرار کرتا ہے کہ ”میرا منصوبہ یونہی رہ گیا۔“ اصل میں ایک قاصد خبر لایا تھا کہ شمالی بڑی شاہراہ سے اس کا چھوٹا ماموں لچھ خاں (۳۷) خود تاشقند آ رہا ہے۔ (لچھ خاں یعنی قتال)۔ اس رسمی اطلاع کے بعد دوسرا ہرکارہ آیا اور بتایا کہ خان تاشقند کے قریب پہنچ گیا ہے۔

یہ محض حسن اتفاق نہ ہو گا۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ بڑے خاں کو بابر اور ازبکوں کے

مسئلے پر غور کرنے سے وہی تجویز مناسب معلوم ہوئی جو بابر نے اپنے چین جانے کا حیلہ کرنے کے لئے بنائی تھی۔ یعنی کہ دونوں خان بھائی ملاقات کریں اور اپنی فوجی اور دماغی طاقت جوڑ کر ایسی تدبیریں نکالیں جس میں بابر کے لئے کچھ کیا جائے اور اسی کے ساتھ خود ان خان بھائیوں کا بھی فائدہ ہو۔ دوسری طرف یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بابر نے اس واقعے کی ایسی کوئی توجیہ نہیں کی وہ اس عمر میں واقعات کی علت پر توجہ نہیں کرتا تھا۔ بظاہر اس نے اچھے خاں کے آنے کو اتفاقی ہی سمجھا مگر کام کرنے پر فوراً تیار ہو گیا۔

شہر میں اس کی آمد کا غلطہ ساچ گیا تھا۔ پچیس سال سے تاشقند والوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ حقیقت میں وہ پہاڑوں کے اس عظیم جھرمٹ کے پیچھے، جو ہند و کش، سطح مرتفع تبت اور جانب مشرق کو ہستان تھیان شان کے ملنے سے بنا ہے، چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ آخری نام تک جس کے معنی آسمانی پہاڑ ہیں، غیر ترکستانی، یعنی چینی ہے۔ اس کی چراگاہیں ”ارض مغول“ کہلاتی تھیں۔ قتل کا عرف اس بنا پر پڑا کہ بد وضع قزق گروہوں کو جو ازبک جتنے کو چھوڑ آئے تھے، اس نے کئی میدانی معرکوں میں شکستیں دیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے اصلی جنم بھوم، طلوع آفتاب کی سرزمین مشرق سے آ رہا تھا۔ جیتنے کا سچا وارث وہی تھا اگرچہ عمر میں چند سال بڑے ہونے کی وجہ سے یہ منصب برائے نام محمود خاں کو مل گیا۔ دونوں خانوں کی ماں دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ اچھے کے ہمراہ کتنے آدمی ہیں۔ اب کتنی دور رہ گیا ہے؟ انتظامات کے احکام دینے میں معروف تھی کہ کیا کیا کھانے کھلائے جائیں گے۔ کہاں اتارا جائے گا۔ پھر فرد گاہ کی درستی، شاگرد پیشوں کو جمع کرا رہی تھی۔ فرصت ملنے ہی بہنوں بیٹیوں کو ہمراہ لے کر وہ خود بھی بیٹے کو لانے اسی راستے پر روانہ ہو گئی۔ مغلوں کا دستور تھا کہ مہمان کی عزت و توقیر کا اندازہ اس فاصلے سے لگاتے تھے جتنی دور میزبان اس کے استقبال کو آئیں۔۔۔ اور خان کو چپک نے آنے کی اطلاع بھی تو بہت دیر میں کرائی تھی۔

شہزادیاں آگے تک گئیں۔ مگر بابر ان سے بھی آگے گیا۔ دل کہتا تھا کہ اسے اپنے انجانے ناموں سے اوروں سے پیشتر ملنا اور گفتگو کرنی بہتر ہے۔ لکھتا ہے کہ بیگمات کو ایک گاؤں میں چھوڑ کر میں بعض مقابر دیکھنے کے لئے آگے علاقے میں نکل گیا۔ ”ایکایک چھوٹے ناموں سے راستے میں آمتنا سامتا ہوا۔ میں رکا، اس نے بھی باگ روکی۔ وہ کچھ سٹ پٹایا کیونکہ غالباً گھوڑے سے اتر کر قاعدے قرینے سے ملاقات کرنی چاہتا تھا۔ ان رسمیات کا

وقت نہ تھا۔ خود گھوڑے سے کودا۔ گھٹنوں پر جھکا اور بغل گیر ہونے سے پہلے سیدھے ہو کر رو در رو کھڑا ہوا۔ انہوں نے فوراً مضطربانہ اپنے لڑکوں کو جو تیرہ چودہ برس کے تھے آواز دی کہ مجھے آداب بجا لائیں اور گلے لگیں۔ پھر میں سوار ہو کر انہیں شاہ بیگم (والدہ) کے پاس لایا وہ سب آپس میں ملے۔ بہنوں کو خان نے اتنے دن میں دیکھا، پہچانا پھر سب بیٹھ کر آدھی رات تک اپنی رام کہانیاں سناتے رہے۔

خان کو چمک قوی الجشہ بہادر آدمی تھے۔ ان کا دل پسند ہتھیار تلوار تھی۔ کہا کرتے تھے کہ گرز و تبر لگے بھی تو ایک ہی جگہ لگتے ہیں۔ (بہ تصحیح مترجم) تلوار سر سے پاؤں تک کاٹ جاتی ہے۔ چنانچہ تلوار ہمیشہ ہاتھ میں یا کمر سے بندھی رکھتے اور کبھی جدا نہ کرتے تھے۔ چونکہ دور دست دیہات میں پرورش پائی تھی۔ گفتار و اطوار میں کس قدر درشتی تھی۔“

لیکن یہ رسم پرست مغل بھانجے سے پہلی ملاقات کا بے ڈھنگا پن نہیں بھولا۔ دوسرے دن باقاعدہ مغل دستور کے مطابق اس نے بھانجے کو تحفہ تحائف دیئے (حالانکہ بیچارے باہر کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ نذر کرتا)

”اس نے مجھے خود اپنے ہتھیار، ایک گھوڑا مع زین اور پورا خلعت دیا جس میں اونٹنی، چینی، اطلس، کارچوبی کام کی قبا اور چینی زرہ بکتر شامل تھے۔ رسم قدیم کے مطابق بائیں طرف خر۔ لٹکایا گیا جس میں پتھر (ہتھی مٹی) کی تختی اور ایک بڑا تھا اور دائیں جانب تھیلی میں عورتوں کی انگوٹھیاں چھوٹی عطر دانی کی وضع کی تھیں۔“

اس عرصے میں بڑے خان چار فرخ تک بڑھ کر آئے اور بھائیوں میں ملاقات پوری رسوم و آداب کے ساتھ کہ دور افتادہ دیہات کے مغول کو بھی شکایت کی گنجائش نہیں رہی، انجام پائی۔ سڑک کے کنارے شامیانہ ڈال کر محمود خاں مسند پر متمکن ہوا ”خان کو چمک گھوڑے پر سیدھا وہاں تک آیا دائیں سے بائیں کو گرد چکر کاٹا پھر سامنے گھوڑے سے اترا اور آداب گاہ تک بڑھ کر نو دفعہ جھکا۔ پھر آگے بھائی سے بغل گیر ہونے چلا۔ فوراً بڑا خان اٹھا آنکھیں چار ہوئیں، اور بڑی دیر تک بھائی کو گلے سے لگائے رکھا الگ ہو کر دوبارہ خان کو چمک نے آداب گاہ پر نوبار تختی رکوع کیا اور اسی طرح تحائف گزرا نئے وقت۔ پھر وہ آکر بھائی کے پاس بیٹھا..... جب میں اس مغلی خلعت وغیرہ کو پہنے ہوئے چھوٹے ماموں کے ہمراہ تاشقند میں آیا تو خواجہ ابوالکرام تک نے مجھے نہیں پہچانا۔ پوچھنے لگے یہ کون سا

سلطان ہے؟ جب میں نے بات کی تب اس نے پہچانا۔“

حقیقت یہ ہے کہ ماموؤں کی ان جدی ریت رسموں میں بابر کوئی موزوں حصہ دار نہ ہو سکا اور ان کے مشوروں سے بھی الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ تاہم جب انہوں نے اپنی مسلح فوجوں کو صف بندی کرا کے باہمی ملاپ کی رسم مغلی طرز میں ادا کی تو وہ خوش ہوا۔ اس جائزے میں اس نے دیکھا کہ خان کوچک صرف دو ہزار شمشیر زن لایا تھا۔ پوری سپاہ کا تخمینہ تیس ہزار سوار مسلح ہوتا تھا۔ اس طرح فوجی جمعیت اور اقتدار کے لحاظ سے بھی بالادستی بڑے خان کو حاصل تھی۔ وہ مل کر تبت کی مزاحمت کا بہ آسانی خاتمہ کر سکتے تھے اور انہوں نے کہا بھی یہی کہ اس باغی کو فرغانہ سے نکال باہر کریں گے جس وقت بابر کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کے آگے بھیجا گیا تو وہ بہت مسرور ہوا اور عالم سرور میں اتنا بھی نہ سوچا کہ جو فوج اس کے ماتحت چلی وہ اس کے ساتھ کوئی وابستگی نہ رکھتی تھی۔ بلکہ محض دونوں خانوں کے حکم سے، جو ساتھ میں نہ آئے تھے، لڑنے نکلی تھی۔

اندھیرے میں تیر چلانا

بابر نے تو فوراً کوچ شروع کیا اور حد سے سوا محتاط ماموؤں کو دریا کے ایک طرف چھوڑ کر دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ ماموں بہت دیکھ بھال کرتے ہوئے شمالی کنارے پر تبت کی فوج کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ اسی حزم و احتیاط کے ساتھ خندقیں کھود کر مضبوط مورچے لگائے ان کی آمد کا منتظر تھا۔ خان جو دعوے کرتے تھے کہ تبت کو جاتے ہی روند ڈالیں گے، صرف گھبرا ڈالنے پر قانع رہے۔ مگر بابر ایسا تباہل کہاں کر سکتا تھا۔ تلوروں کا سبک پالشکر زیر قیادت اور اپنی مرضی کا مالک ہوتے ہی اس نے جنوبی کنارے پر یلغار کی۔ صبح ہوتے ایک قصبے کی محافظ فوج پر چھاپہ مارا، بستی پر قبضہ کر لیا۔ بستی والے خوش ہو گئے۔ وادی کے لوگ اس کے جانے سے رنجیدہ ہوئے تھے۔ اب جو واپسی کی خبر قافلوں کے ذریعے ہر مسجد اور سرائے میں قریہ بہ قریہ پھیلی تو قلعہ والوں نے دروازے کھول دیئے۔ خانہ بدوش قبائل گھوڑوں پر چڑھ چڑھ کر اس کے لشکر میں آ ملے۔ پرانے رفیقوں کو بھی ہمت ہوئی کہ اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر پھر حاضر ہو جائیں۔ وادی کے سرے پر اندجان والے بھی اس کے مشتاق تھے۔ تبت ان سے بہت دور تھا۔ لا محالہ بابر کو اپنے اصلی شہر میں جا پہنچنے کا خیال آیا۔ اس نے ٹھہر کر یہ بھی نہ سوچا کہ اب اس کے اردو میں

فرغانہ کے جنگ آزما اور بیرونی مغل دونوں بھرے ہوئے ہیں۔ لکھتا ہے۔ ”میرے ذہن میں آیا کہ راتوں رات اندجان کے قریب پہنچ کر وہاں کے شیوخ اور عمائد کے پاس کسی آدمی کو بھیجا جائے کہ شہر والے مجھے قلعے میں پہنچانے کی کوئی تدبیر بتائیں۔ چنانچہ ایک شام کو میں اوش سے چل کر ادھی رات کے قریب اندجان کے دروازوں سے کوئی دو میل فاصلے پر پہنچا۔ ”چل دختر!“ آیا اور قبر علی اور چند سرداروں کو آگے بھیجا کہ چپکے سے ہمارے قاصد کو شہر میں پہنچا کے وہاں کے عمائد کو اطلاع دے دیں۔ خود ہم اسی جگہ ان کے انتظار میں گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے۔ رات کی تیسری گھڑی تک بعض کو اونگھ آئی۔ ہر نوں پر جھک گئے۔ بعض سو گئے۔ یکایک جنگلی نعروں اور طبل جنگ کی آواز آئی۔ میرے آدمیوں کو جو غافل اور غنودہ تھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ دشمن کی تعداد کتنی اور ہم سے کتنے فاصلے پر ہے۔ صف بندی کرنے کی بجائے گھبرا کر بھاگ پڑے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر ہی کا راستہ لیا۔ مجھے ان کے درمیان جانے کی فرصت نہ تھی۔ سیدھا دشمن پر جھپٹنا حالانکہ صرف تین سوار میرے پیچھے رہ گئے تھے۔ تھوڑی دور بڑھا تھا کہ دشمن تیر چلاتے، نعرے لگاتے، ہم پر آ پڑے۔ ایک سوار جس کے گھوڑے کی پیشانی سفید تھی میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے گھوڑے کے تیر مارا کہ وہ گر کر مر گیا۔ دوسروں نے باگ روک لی۔ میرے ساتھیوں نے کہا، ”بڑا اندھیرا ہے، خبر نہیں ہمارا مقابلہ کتنوں سے ہے۔ بہتر ہے کہ پلٹ کر پہلے اپنے سپاہیوں کو جمع کریں۔ ہم اٹے پھرے۔ اپنے آدمیوں کو جالیا۔ بعض کے چابک بھی مارے مگر انہیں ٹھیرانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لہذا پھر ہم چار تعاقب کرنے والوں کی طرف پلٹے اور تیر برسائے۔ وہ ذرا رکے لیکن دوسری تیر باری کے بعد سمجھ گئے کہ ہم صرف چار آدمی ہیں تو پھر بھاگنے والوں پر ڈپے اور انہیں گھوڑوں سے گرانے لگے۔ ہم نے تین چار دفعہ حملہ آوروں سے اپنے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی۔ کوئی چھ میل تک اسی طرح پیچھا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ قربوق کی پہاڑی پر پہنچے۔ وہاں مبشر ہم سے آ ملا۔ میں نے کہا دشمن کی تعداد زیادہ نہیں۔ آؤ ان پر ایک اور دھاوا کریں۔ ہمارے اس حملے نے ان کو بڑھنے سے روک دیا (وہ لڑائی روکنے کے لئے پکارے) اس پر ہمارے مفور سپاہی بھی ادھر ادھر سے آکر جمع ہو گئے۔ پھر بھی بہت سے آزمودہ کار جنگ آزما، اوش تک کہیں نہ ٹھیرے، بھاگتے ہی رہے۔

”یہ افسوس ناک واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خود ہمارے لشکر سے ایوب بیگ چک کے

(دستے کے) کچھ مغل اوش سے کھسک آئے اور اندجان کی نواح میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ میرے لشکر کی آمد سے جو شور کی آوازیں سنیں تو دبے پاؤں قریب آئے اور پھر پلٹ کر لوٹنے میں غلطی ہو گئی۔ اس رات ساری فوج کے لئے پلوں کے دو لفظ ”تاشقند“ اور اس کا جواب ”سیرام“ یا پہلے سیرام کہیں تو اس کا جواب تاشقند مقرر تھا۔ ان مغلوں کی ہمارے ہراول سے مٹھ بھیڑ ہوئی جن کا سردار محمد علی (غالبا بابر کا کتاب دار) تھا۔ مغلوں نے ”تاشقند“ کا لفظ پکارا۔ محمد علی تاجیک تھا۔ اس کے منہ سے گھبراہٹ میں تاشقند، تاشقند نکلتا رہا۔ مغل سمجھے یہ کوئی دشمن کا لشکر ہے۔ نعرہ جنگ اُبھر گھوڑوں کے طبل بجا کر تیر مارنے شروع کئے۔ اس طرح سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ میرا منصوبہ پورا نہ ہوا۔ ہم سب اوش واپس آ گئے۔“

اپنا پائے تخت جسے کئی سال سے نہ دیکھا تھا، واپس لینے کا پہلا اقدام تو جھوٹا خوف پیدا ہو جانے سے ناکام رہا لیکن دوسری دفعہ کی قسمت آزمائی میں وہ پھر خلاف احتیاط کام کرنے کی وجہ سے واقعی خطرے میں مبتلا ہوا۔ مغلوں کے سبک پا لشکر کے اندجان کے قریب پہنچ جانے سے تبتل کو خواہی نخواہی عاجلانہ دریا پار کر کے شہر کی حفاظت کو ادھر آنا پڑا۔ راستے میں اس کی فوج کے کچھ سپاہی بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ہرول عزیز بابر کے مغل لشکر میں آ گئے۔ تبتل کے کمزور ہو جانے کی خبر سن کر بابر ہی نے یلغار کی اور ایک بار گھوڑا دوڑاتا ہوا (بہ تصحیح مترجم) اہل قلعہ کی ایک فوج پر جا پڑا اور انہیں بھگاتا ہوا شہر کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ جہاں اسی کے آزمودہ کار سرداروں نے اسے روکا جنہیں پسند نہ تھا کہ رات کے وقت قلعہ بند شہر کے اندر داخل ہو جائیں۔ بابر کی یہ رائے نہ تھی مگر سن رسیدہ مشیروں کی بات حسب معمول قبول کر لی اگرچہ ترک میں یہ لکھے بغیر نہیں رہا کہ ایسا کرنا غلط تھا جس کی وجہ سے تمام مغل سواروں کو نواح شہر سے سمیٹ کر شب گزاری کے لئے کوئی پڑاؤ ڈھونڈنا پڑا۔

”عثمان کے قریب ہم ایک ندی اتر کر موضع رباط زورق کے نزدیک خیمہ زن ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تبتل اس وقت بڑے راستے سے اندجان جا رہا ہے لیکن میری جوانی کی ناتجربہ کاری سے ایک چوک یہ ہوئی کہ ہم گاؤں کے قریب ہموار میدان میں اتر پڑے بجائے اس کے کہ ندی کے کنارے اترتے جو ہماری حفاظت کرتی۔ مزید برآں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر قراول، یا طلائیہ کے پہرہ دار تک مقرر نہیں کئے اور سب سو گئے۔ ہم خواب

راحت کے مزے ہی لے رہے تھے کہ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے قبر علی گھوڑا دوڑاتا اور پکارتا ہوا آیا کہ ”اٹھو، اٹھو دشمن آگیا۔“ آوازے دے کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اپنی کفٹان (زرہ) پہنے ہوئے سویا تھا اور زمانہ امن میں بھی میرا معمول یہی تھا۔ فوراً اٹھا، تلوار باندھی ترکش سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میرا نشان بردار بھی سوار ہوا اور چونکہ جھنڈے کو اس کی بیشک میں جمانے کی فرصت نہ تھی، ہاتھ ہی میں اٹھائے ہوئے چلا۔ ہم دشمن کی طرف بڑھے تو دس پندرہ سپاہی میرے جلو میں تھے۔ دشمن کے قراول سے ایک تیر کے پر تاب پر شاید صرف دس آدمی میرے ہمراہ رہ گئے۔ ہم نے جھپٹ کر حریف کے سپاہیوں پر تیر باری کی اور دبا تے ہوئے چلے۔ وہ ہٹ گئے تو ایک بار اور تیروں کی باڑ مار کر ہم دشمن کے قلب لشکر کے سامنے پہنچ گئے۔ احمد تبیل سہ آدمیوں کے ساتھ اسی جگہ تھا۔ وہ اور ایک اور شخص صف کے آگے کھڑے پکار رہے تھے: ”مارو، مارو“ انہیں مارو۔“ لیکن اس کے آدمی کھڑے پھر پھر کر رہے تھے گویا دل میں کہہ رہے ہیں کہ بھاگ جائیں یا نہ بھائیں؟

اس عرصے میں میرے پاس فقط تین آدمی، ناصر دوست، قلی کوکلتاش اور ترکمان رہ گئے تھے۔ میں نے وہ تیر جو انگوٹھے کے نیچے دبا رکھا تھا، تبیل کے خود کے چھجے کا نشانہ لے کر چلا دیا۔ ترکش میں ہاتھ ڈال کر دوسرا تیر کھینچا تو بجائے تیر کے مرمت کی نئی چھڑ (گوشہ گیر) جو خان کوچک نے دی تھی، نکلی۔ میں نے جھنبلا کر اسے ترکش میں واپس ڈالا۔ اس میں اتنی دیر لگی کہ دو تیر چلا سکتا تھا۔ تیر کمان میں جما کر میں پھر آگے چھپتا تو میرے ساتھی تینوں پیچھے ٹھنک رہے اور مقابلے میں سامنے سے دو سوار آئے۔ ان میں آگے خود تبیل تھا۔ ہمارے درمیان شارع عام کی پٹی تھی وہ اس کے ایک کنارے پر چڑھا اور میں دوسری طرف سے بڑھا کہ اس کا سیدھا ہاتھ مجھ تک اور میرا اس تک پہنچ سکتا تھا۔ تبیل پوری طرح مسلح تھا۔ میرے پاس کمان اور صرف تلوار تھی۔ میں نے تیر جوڑ کر کمان کان تک کھینچی اور تیر چلا دیا۔ اسی لمحے ایک تیر میری دائیں ران پر لگا اور اندر تک گھس گیا۔ میرے سر پر خود کھڑ بجائے گدہ دار کلاہ (طاق) تھی، تبیل کی تلوار اس پر ایسی پڑی کہ میں سن ہو گیا۔ کلاہ ذرا نیچی کٹی لیکن سر میں سخت ضرب آئی۔ تلوار کو صاف نہیں کیا تھا، وہ زنگ کی وجہ سے جلد کھینچ نہ سکی۔ تامل کا وقت نہ تھا، دشمن مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے باگ موڑی اور ایک اور تیر میرے ترکش پر لگا۔ سات آٹھ قدم ہٹا۔ میرے تین

ساتھی قریب آ گئے اب کے تبتل نے ناصر دوست کے تلوار ماری۔ ہم پلٹ کر چلے تو انہوں نے ایک پر تاب تیر تک ہمارا پیچھا کیا۔

ہم ندی کی بڑی دھار پر آئے جو گہری اور چوڑی تھی۔ صرف کہیں کہیں سے اترنا ممکن تھا، مگر خدا نے صحیح راستہ دکھایا اور ہم وہاں پہنچ گئے جہاں کنارہ نیچا اور پار اترنے کا موقع تھا۔ مگر یہاں ناصر دوست کا گھوڑا تھک کر گر پڑا۔ ہم نے اتر کے اسے کھڑا کیا اور پار ہو کے اوش کی بیٹا پر پڑ لئے۔ ٹیکرے پر چڑھے تو مزید طغائی آ ملا۔ وہ بھی زخمی تھا اور اگرچہ تیر ٹانگ کے پار نہیں ہوا تھا مگر مشکل سے اوش تک آ سکا۔ اس روز غیر مسلح ہونے کی وجہ سے میرے کئی بہترین رفیق مارے گئے یا گھوڑوں سے گرا لئے گئے۔

بابر زخم کی مرہم پٹی کرا رہا تھا کہ اسے یہ سن کر پریشانی ہوئی کہ ماموؤں نے تبتل کے سیر دریا کے پار اتر جانے سے خوشی خوشی بڑھ کر فرغانہ کا رخ کیا اور خان کوچک نے اندجان کے باہر اور بڑے نے ایسان دولت بیگم کے باغ میں جسے ”قوش تنگیاریاں“ (چڑیا چکی کا باغ) کہتے تھے، ڈیرے ڈالے اور فوراً بابر کو بلوایا :

”میں اوش سے آکر بڑے ماموؤں سے ملا تو انہوں نے وہ سب مقام (بہ تصحیح مترجم) جو پہلے مجھے دیئے تھے، اس عذر سے خان کوچک کو تفویض کر دیئے کہ شیبانی جیسا دشمن سمرقند پر قابض اور روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے (بابر نے اپنے چین جانے کے لئے خود بھی یہی سبب پیش کیا تھا)۔ دوسرے یہ کہ چھوٹے خاں کے پاس یہاں کوئی علاقہ نہیں، مناسب ہے اس کے لشکر کے لئے سیر کے ادھر کا علاقہ اور اندجان بھی اسے دے دیا جائے۔ شمالی کنارے پر اغنی کے اضلاع مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ پھر یہ بھی کہا کہ فرغانہ کا بندوبست کر کے سمرقند پر فوج کشی کریں گے وہ تم کو دیں گے اور فرغانہ کی پوری ولایت خان کوچک کے حصے میں آئے گی۔ غالباً یہ سب مجھے بھلانے کی باتیں تھیں مگر قبول کرنے کے سوا میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ بڑے خان سے مل کر میں چھوٹے خان کے ڈیرے کو جا رہا تھا کہ راستے میں تمبر علی سلاخ ملا اور کہنے لگا تم نے دیکھا کہ جو علاقہ تمہارا تھا وہ بھی انہوں نے ہتھ لیا یہ تمہارے کام نہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ اوش میں قلعہ بندی کر کے تم تبتل سے صلح کرو اور ان منہوں کو مل کر پہلے یہاں سے دفع کرو۔ پھر چھوٹے بڑے بھائی کے حصے لگانے کی بات کرنا.....“ میں نے جواب دیا ”خان میرے رشتہ دار ہیں، ان کی نوکری کرنا تبتل کے ساتھ مل کر بادشاہی کرنے سے بہتر ہے۔ تمبر یہ جواب سن کر اپنے کسے پر پشیمان ہوا اور

تین چار دن بعد چپکے سے اندجان چلا گیا۔

میں چھوٹے ماموں کے پاس گیا تو پہلی ملاقات کی تلافی کے لئے اس مرتبہ وہ مجھے لینے خیمے کے باہر تک دوڑے ہوئے آئے۔ میں ٹانگ کے زخم سے بہ مشکل چل سکتا تھا۔ خان نے مجھے گلے لگایا اور کہا ”ارے بھائی تجھے تو سب بہادر اور سورما کہہ رہے ہیں۔“ پھر خیمے میں بازو پکڑے پکڑے لے گئے۔ خیمہ قزاقانہ وضع کا چھوٹا سا تھا اور کچھ آراستہ یا صاف ستھرا بھی نہ تھا۔ یہاں انہوں نے مجھے خربوزے اور انگور کھلائے میں رخصت ہو کر اپنے خیمے میں آیا تو انہوں نے اپنا مغل جراح میرے علاج کے واسطے بھیجا۔ وہ نہایت حاذق اور ”اتیکہ بخشی“ (یعنی میسوں کا چھوٹا باپ) کہلاتا تھا۔ کہتے ہیں کسی کا سر پھٹ کر بھیجا نکل آتا تھا، تو بھی وہ اس کا تدارک اور معالجہ کر سکتا تھا۔ اس نے بہت سے عجیب علاجوں کا مجھے حال سنایا جو ہمارے (متمدن) ولایات میں نہیں ہو سکتے۔ میرے زخم پر پھلوں کی خشک چھال اور لومڑی کی ٹانگ کی کھال باندھ کر پٹی بندھوائی۔“

اس کراماتی پٹی سے زخم کو کیا فائدہ پہنچا، یہ تو معلوم نہیں مگر چند ہی روز میں ہم شیر کو گھوڑے پر سوار نہایت طولانی راستہ طے کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کے ماموں نے دوبارہ اسے انہی پر حملہ کرنے کو مضبوط جمعیت دے کر روانہ کر دیا اور خود اندجان ہی میں رہے۔ پھر اس کے سن رسیدہ سرداروں نے دشمن پر جا پڑنے سے اسے روکا۔ تزک میں لکھتا ہے کہ اکثر یہی ہوا ہے۔ حالانکہ جب ارادہ کر لیا تو جو کچھ کرنا ہے کر گزرتا چاہئے۔ وقت نکل جانے کے بعد بچپتانی سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اس عرصے میں ایک خلاف گمان صورت پیدا ہوئی۔ انہی کا قلعہ دار تبتل کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید تھا۔ ازبک کے مقابلے میں بابر کو سبرقتد میں تبتل نے جو مختصر فوج اظہار دوستی کے طور پر بھیجی تھی، اس کا سردار بایزید ہی تھا۔ اب اس نے ایک رازدار قاصد کو بھیج کر بابر سے درخواست کی کہ بلا تاخیر خفیہ قلعہ انہی میں آ جائے اور بایزید کو اپنی خدمت و جان نثاری میں لینا قبول کرے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک مستحکم قلعہ ہاتھ آ جائے۔ بابر نے اس پیشکش پر غور کیا۔

”اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے چالاکی سے ماموؤں سے توڑ لیا جائے۔ میرے ان سے الگ ہو جانے کے بعد وہ اس وادی میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ عجب نہیں کہ مجھے بلانا اپنے بڑے بھائی تبتل کے اشارے سے ہو اور مغل خانوں سے دور بلا کر وہ میرے ساتھ کوئی

عہد نامہ کرنا چاہتے ہوں لیکن میں نے خانوں کو اس بلاوے کی اطلاع کر دی۔ انہوں نے کہا: ”تم ضرور جاؤ اور جس طرح ہو سکے بایزید کو پکڑ لو“ مگر ایسی فریب کاری میری خصلت نہ تھی خصوصاً جب عہد و بیان کرنے ہوں میں بد عہدی نہیں کر سکتا تھا تاہم مجھے فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح اخی پنج جاؤں۔ یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے شیخ بایزید بھائی سے ٹوٹ کر میرے ساتھ ہو جائے۔ پھر کوئی مناسب صورت نکل آئے اور یا وہ اپنی قسمت میری قسمت سے وابستہ کر دے۔“

زندگی کے تلخ تجربے بھی عمر شیخ میرزا کے بیٹے کو یہ سبق نہ دے سکے تھے کہ ساز باز کرنے میں صرف اپنی سمجھ پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ حسب عادت اس مرتبہ بھی جو کام کرنے کو دل چاہتا تھا اس کے حق میں حجت نکال کر فیصلہ کر لیا اور جب فیصلہ کر لیا تو پھر اس جال کی طرف دھیان بھی دینا چھوڑ دیا جو اسے پھانسنے کے لئے بچھایا جا رہا تھا۔

”غرض میں نے اپنا ایک آدمی بھیجا اور اس نے بایزید سے قول و قرار کر لئے۔ پھر بایزید کے بلانے پر میں خود چلا گیا۔ وہ استقبال کرنے باہر آیا اور میرے سب سے چھوٹے بھائی ناصر میرزا کو ساتھ لایا۔ ہم اس کے ساتھ قلعے میں گئے اور اس نے مجھے میرے باپ کے محل میں ٹھیرا دیا۔“

یہی وہ مکان تھا جہاں کبوتر خانہ گرنے سے عمر شیخ میرزا کی وفات ہوئی تھی۔ یہ پہاڑی پر سنگین قلعے کی فصیل کے اندر بنا تھا۔ قلعے ہی میں بایزید کی سکونت تھی۔ یہ بات اندیشے سے خالی نہ تھی مگر بابر کو اس گھر کو دیکھ کر دوازدہ سالہ طفلی کی یادیں آ رہی تھیں۔ پائیں باغ میں باپ کی قبر تھی۔ فصیل کے طاقوں، کنگوروں پر کبوتر اسی طرح غرغروں کر رہے تھے۔ قدیم خدمت گار آ آ کر خوشی خوشی قدم چوم رہے تھے۔ بہت سی باتیں چھوٹے بھائی کو سنائی تھیں۔

اب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بابر رواں دواں ساعتوں میں زندگی گزارنے کا ایک خاص مزاج رکھتا تھا اور اس کے لئے قریبی ماحول میں غضب کی دل کشی تھی۔ اتفاقہ صاف راستہ سامنے آیا تو گھڑ دوڑ شروع کر دی۔ سایہ دار مرغ زار میں ندی نظر پڑی تو گھوڑے سے کود کر تھوڑی دیر اس کے کنارے لطف اٹھانے بیٹھ گیا۔ شب خونوں کے تلاطم میں بھی اس کے گھوڑے کے آس پاس جو کچھ گزرتا وہ اس کی ایسی صاف تفصیلات قلم بند کرتا ہے کہ تاریخ میں اور کوئی شخص ایسی کیفیات نہیں لکھ سکا۔ اپنے اس پرانے گھر

میں چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے میں اپنے ماموؤں سے رسل رسائل کرنا بھی یاد نہ رہا اور نہ وادی کے عام حالات کی زیادہ خبر رہی۔ یزید اس کا ہم عمر، متواضع آدمی تھا اس کا مہمان بن کر اس بات کی بھی فکر نہ ہوئی کہ قلعے اور بستی کے پل پر بائزید کا سپرہ ہے بحالیکہ بابر کے رفقا منڈی کے چوک یا بیرونی پڑاؤ میں الگ الگ مقیم ہیں اور خود وہ پہاڑی کے کنارے پر ٹکا ہوا ہے۔ غرض پھندا اس طرح لگایا تھا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

ادھر جب تبتل اندجان میں رنج ہوا تو اس نے ازبکوں کو مدد پر بلایا۔ چنانچہ شیبانی خاں سرقت سے چل پڑا تھا۔ اس کی آمد کی خبر نے وادی کے حالات کا رنگ ایک دم بدل دیا، جیسے سیرین کی تصویریں بدل جاتی ہیں۔ بابر تو دور جا چکا تھا۔ یہاں دونوں خانوں نے مغلی حفظ المقدم سے عاجلانہ کام لیا اور دریا (سیر) اتر کے انخی کے راستے جانے کی بجائے نیچے کے رخ بجنہ کے ممبر سے پار ہو گئے۔ خان کوچک بذات خود منصف مزاج، دین دار آدمی تھا لیکن اس کے قلعہ دار حسب عادت لوٹ مار کرتے رہے۔ اب جو مغل پسا ہوئے تو غضب ناک باشندے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مغلوں سے لوٹ کا مال اگلوایا۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی دانش مند ازبک نے تیموریوں اور مغول پر اس وقت تلوار اٹھائی جب کہ وہ باہمی نفاق و شقاق میں مبتلا تھے۔

بابر کو ازبکوں کی پیش قدمی کی خبر ملی (تبتل کئی ہزار آدمی لے کر انخی پر چل پڑا تھا) اس کے بعد بھی چالاک بائزید نے ایک اور داؤہ کھیلا کہ بابر کے منحرف بھائی جہانگیر میرزا کو بھی جو اپنے کئے پر نادم تھا یہیں لے آیا۔ یہ ایک نئی اور بھاری ذمہ داری ہو گئی، عمر شیخ کے تین بیٹے ابے پہاڑی قلعے کے گوشے میں جمع کر لئے گئے تھے۔ کسی جلاد کی تین ضربیں ان تینوں کا اور عمر شیخ کے زہینہ وارثوں کا اسی طرح خاتمہ کر سکتی تھیں، جیسے ان کے عم زادوں کا ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ مگر خود بابر کو خلاف توقع بھائی کے آجانے سے نہایت مسرت ہوئی۔

دو کھوجیوں کا موت کی ٹاک لگانا

”میں حمام میں تھا جب کہ جہانگیر میرزا تبتل کی حراست سے نکل کر آیا۔ میں باہر نکلا، اسے دیکھا اور گلے سے لگایا۔ بائزید بہت گھبرایا، حیران تھا کیا کرے کیا نہ کرے؟ جہانگیر اور اس کے ساتھی سردار ابراہیم بیک چاقوق نے مشورہ دیا کہ بائزید کو پکڑ کر قلعے پر قبضہ کر لینا

چاہئے اور سچ یہ ہے کہ عقل کا تقاضا یہی تھا۔ میں نے کہا میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں، عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ ہماری گفتگو کے وقت یازید باہر حصار میں گیا ہوا تھا۔ ہمیں اس کے پل پر پہرہ دار مقرر کرنے لازم تھے مگر دیکھ بھال تک نہ تھی۔ یہ سنگین غلطیاں ہماری ناتجربہ کاری سے ہوئیں۔ گجر دم تبتل آیا اور دو تین ہزار پورے مسلح لشکریوں کو لئے ہوئے پل اتر کر وہ بھی حصار (ارک) کے اندر آگیا۔ میرے پاس شروع میں ہی تھوڑے آدمی تھے۔ انہی میں قیام ہوا تو کچھ سپاہی بیرونی اضلاع یا تھانوں میں بھیج دیئے گئے۔ سو کے قریب میرے پاس رہ گئے تھے۔ ہم نے انہی کو سوار کرا کے مختلف کوچوں کے سروں پر متعین کیا اور جنگ کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ یازید قبر علی، نوجوان محمد دوست گھوڑے دوڑاتے ہوئے تبتل کے پاس سے صلح کا پیام لائے۔ میں نے پہرے کے جوانوں کو اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود ان لوگوں کو لے کر باپ کی قبر پر آیا گھوڑے سے اتر کے جمائگیر میرزا کو بھی بلوا لیا۔ شیخ یازید اور قبر علی پاس بیٹھے۔ دوست محمد حصار کو واپس چلا گیا۔ ہم مقبرے کے جنوبی کمانچے میں گفتگو کر رہے تھے۔ جمائگیر میرزا نے ضرور ابراہیم چاقوق سے مشورہ کر لیا ہو گا، اب میرے کان میں کہا کہ ان دونوں کو پکڑ لینا چاہئے۔ میں نے کہا، جلدی نہ کرو۔ پکڑنے کا وقت گزر چکا ہے۔ بات سن لینی چاہئے۔ شاید کوئی نتیجہ گفتگو سے نکل آئے۔ یوں بھی ہماری تعداد کم اور وہ بہت زیادہ ہیں۔ پھر وہ قلعے میں اور ہم اس کی بیرونی فصیل پر ہیں۔ شیخ یازید اور قبر علی اس دوران میں مختصر بیٹھے رہے۔ جمائگیر نے ابراہیم کو ارادے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ یا تو غلط سمجھا اور یا اس بہانے کہ غلط سمجھا تھا۔ یازید کو پلٹ گیا۔ اچھا نہ کیا۔ ہمارے آدمی جھپٹ کر آئے اور یازید و قبر دونوں کو زمین پر گرا دیا۔ صلح کی بات چیت ختم ہو گئی۔ میں نے حکم دیا کہ ان دونوں کو حراست میں رکھا جائے اور لڑائی کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا۔

میں نے شہر کی ایک سمت پر جمائگیر کو متعین کیا۔ اس کے اپنے آدمی کم تھے اس لئے کچھ اپنے آدمی بھی اس کو دیئے۔ پہلے اسی کا حصہ دیکھنے گیا۔ پھر دوسرے محلوں کا معائنہ کیا۔ شہر کے وسط میں ایک مسلح کھلا میدان ہے۔ یہاں کچھ سپاہی متعین کئے اور آگے چلا۔ اتنے میں دشمن کے ایک بڑے گروہ نے ان پر ہجوم کیا اور دھکیل کر ایک پتلی گلی میں ہٹا دیا۔ اسی وقت میں پلٹ کر ادھر گیا، اور اپنے مسلح جوانوں کو بڑھا کر دشمن کو وہاں سے نکالا۔ جس وقت ہم چوک خالی کرا رہے تھے، میرے گھوڑے کی ٹانگ میں تیر لگا۔ وہ اچھلا اور

اس طرح الف ہوا کہ میں عین میدان جنگ میں زمین پر گرا۔ اٹھا تو میرے صاحب قدم (اردلی) کاہل نے اپنے مرل سے ٹٹو سے اتر کر اسے میرے سامنے پیش کیا۔ میں سوار ہوا۔ اپنے آدمیوں کی پورے چوک میں صف بندی کرائی اور دوسرے کوچے کی طرف گیا۔ سلطان محمد لاغری نے دیکھا کہ میں بہت مرل گھوڑے پر سوار ہوں، تو اپنا گھوڑا مجھے دے دیا میں اس پر سوار ہوا ہی تھا کہ قاسم بیگ کا بیٹا زخم کھائے ہوئے آیا اور خبر دی کہ تھوڑی دیر قبل جہانگیر میرزا پر ایک بڑی جمعیت نے حملہ کیا اور وہ مضطرب ہو کے بھاگا شہر سے نکل گیا۔ میرے سن کر حواس گم ہو گئے۔

اسی وقت سید قاسم جسے ایک (دور کے) قلعے پاپ میں تعینات کیا تھا، قلعہ چھوڑ آیا۔ یہ اور نامساعد بات ہوئی کیونکہ اس نازک وقت میں بڑی ضرورت تھی کہ کہیں تو کوئی مضبوط قلعہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میں نے ابراہیم بیگ سے کہا اب کیا کرنا چاہئے؟ اس کے زخم خفیف آیا تھا اس کی تکلیف کے باعث یا ہمت ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ کے رہ گیا۔ میرے دل میں آیا کہ لڑ کر پل پر سے راستہ نکالیں اور پار ہونے کے بعد پل توڑ دیں۔ ایک اور جیوٹ بابا شیرزا (۳۸) نے بڑے کام کی بات کہی کہ ہمیں سب سے قریبی دروازے سے لڑ کر نکل جانا چاہئے۔ میں نے یہ رائے قبول کی اور ہم دروازے کی طرف چل پڑے ہم ایک کوچے میں داخل ہوئے۔ عقب کی حفاظت سید قاسم اور ناصر دوست نے کی اور (دشمن کے) باقی خیز (۳۹) سے خوب لڑے ابراہیم اور (بہ نصیج مترجم) میرزا قلی کو کھلتاش میرے ساتھ تھے۔ دروازہ شہر پر پہنچے تو دیکھا ادھر سے بایزید دگلا اپنے دو تین کو ساتھ لئے اندر آ رہا ہے۔ وہ صبح کو میری مرضی کے خلاف گرفتار کئے جانے کے بعد جہانگیر میرزا کی حراست میں تھا۔ میرزا اسے لے کر چلا تو بعض لوگوں نے بایزید کو قتل کرنا چاہا لیکن دوسروں نے اسے چھوڑ دیا۔ دروازے میں داخل ہو رہا تھا کہ میرا سامنا ہوا۔ جو تیر میری شست میں دبا ہوا تھا، میں نے پورا کھینچ کر چلا دیا۔ نشانہ بہت اچھا تھا لیکن اس کی صرف گردن کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ وہ بد حواس ہو کر دائیں کو مڑا اور ایک گلی میں بھاگا۔ میں پیچھے چلا۔ کو کھلتاش نے ایک پیادے پر بھاری لٹھ مار کر فرش کر دیا۔ وہ آگے چلا تو قریب ایک اور پیادے نے ابراہیم بیگ پر تیر کا نشانہ باندھا۔ ابراہیم نے ”ہے ہے“ کا نعرہ لگا کے اسے ڈرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب اس پیادے نے اتنے قریب سے جتنی ڈیوڑھی کی سیڑھی ہوتی ہے، وہ تیر مجھ پر چلا یا اور میری بغل میں لگا۔ میں قلماتی زرہ پہنے تھا، اس

کے دو پترے کٹ گئے۔ وہ بھاگا۔ میں نے اس پر تیر چلایا۔ اسی لمحے فیصل پر ایک پیادہ بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ میرے تیر نے اس کی ٹوپی کی چندیا چھید کر اسے کنگورے سے چپکا دیا۔ وہ کھلتی گہڑی کو سنبھالتا ہوا بھاگا چلا گیا۔ پھر ایک سوار بایزید کے پیچھے دوڑتا جا رہا تھا، میرے قریب سے گزرا۔ میں نے تلوار ماری۔ اس کی نوک گدی پر لگی وہ جھکا اور گلی کی دیوار سے ٹکرا کر بہ مشکل فرار ہوا۔ اس طرح ہم نے دشمن سے دروازہ خالی کرا لیا۔ وہیں جمع ہوئے لیکن صلاح مشورے کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کوئی دو سو آدمی تھے اور حصار کے اندر دشمن کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ میرے آدھے آدمی جمائگیر کے ساتھ جا چکے تھے اور اسے گئے اتنی دیر ہو چکی تھی جتنی دیر میں دودھ میں ابال آتا ہے۔ پھر بھی میری نا تجربہ کاری دیکھئے کہ ایک ہرکارا اس کے عقب میں دوڑایا کہ اگر تم قریب ہو تو واپس آؤ۔ پھر مل کر حملہ کریں گے۔“ حالانکہ اس کا وقت نکل چکا تھا۔ ابراہیم بیگ یا تو اس لئے کہ گھوڑا بہت تھک گیا تھا اور یا اپنے زخم کی تشویش کی وجہ سے کہنے لگا۔ ”میرا گھوڑا تو ختم ہوا۔“ اس پر مبشر کے ایک ملازم نے بڑی ہمت کی کہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اسے ابراہیم بیگ کو دے دیا۔ کسی نے اس سے کہا نہ تھا کہ یہ کرے۔ اوروں نے بھی اس وقفے میں کہ ہم دروازے پر استاد تھے۔ دلیری دکھائی یہاں تک کہ جمائگیر میرزا کے لئے جو ہرکارا گیا تھا واپس آیا اور بتایا کہ دیر ہوئی وہ دور نکل چکا ہے۔

”اب ہم روانہ ہوئے۔ حقیقت میں اتنی دیر ٹھہرنا ہی غلط فیصلہ تھا۔ ہم چلے تو دشمن کے بہت سے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے پل کے سرے تک آ گئے۔ میرے جلو میں بیس تیس رفیقوں سے زیادہ نہ تھے ایک پہلو سے قاسم کے بیٹے نے ابراہیم بیگ کو آواز دی کہ اپنی سپہ گری کی بہت شہنشاہیاں ہانکا کرتے ہو، آؤ میرے ساتھ چلو، یہ موقع تلوار کے ہاتھ دکھانے کا ہے۔“ ابراہیم بیگ نے جواب دیا ”کس نے منع کیا ہے تجھے، آجا۔“ یہ دیوانے اس ہزیمت کی حالت میں بھی اپنی دلاوری دکھانا چاہتے تھے۔ یہ ہمت آزمائی کا کہ ہم سب کو چلنے میں دیر ہو، بھلا کیا وقت تھا؟ ہم نے باگیں اٹھائیں۔ پوری رفتار سے گھوڑے چھوڑ دیئے۔ مگر دشمن بھی دبا تا چلا آتا تھا اور ایک ایک کر کے ہمارے سواروں کو آلیتا تھا۔

”اُسی سے دو میل کے اندر گنبد چن ایک مقام ہے، اس سے گزر رہے تھے کہ ابراہیم بیگ نے مجھے مدد کے لئے پکارا۔ مڑ کر دیکھا تو بایزید کے ایک خانگی غلام سے وہ لڑ رہا تھا۔ باگ کھینچ کر پلٹنا چاہتا تھا کہ قلی خان جو پہلو میں تھا باگ پکڑ لی اور کہا یہ وقت پلٹنے کا نہیں ہے اور مجھے تیز تیز بڑھائے ہوئے لے چلا۔ اُسی سے چار میل، مقام سنک تک پہنچے۔ میرے اکثر ساتھی گرائے جا چکے تھے (اتفاقاً) یا بالارادہ یہ لوگ شمالی پہاڑوں کی سرحد کی طرف جا رہے تھے جہاں سے سنک ندی نکلتی تھی۔ اس کی بالائی گھاٹی پر پہنچ کر محفوظ ہو جاتے اور بایں کو مڑ کر تاشقند کا راستہ پکڑ سکتے تھے۔ دونوں خان بھی تاشقند کو بھاگ رہے تھے)

سنک کے قریب کوئی پیچھا کرنے والا نظر نہ آیا تو ہم اس گاؤں کے قریب سے ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے اب ہم کل آٹھ رہ گئے تھے۔ ناصر دوست، قاسم بیگ کا لڑکا۔ میرزا قلی کو کلتاش اور چار اور تھے۔ ندی کے علاوہ ایک بٹیا پہاڑیوں میں بل کھاتی شارع عام سے دور، چلی گئی تھی۔ اس پر چلتے رہے یہاں تک کہ ندی کو دائیں پر چھوڑا اور دوسرے راستے سے چل کر مسلح میدان میں آئے عصر کے قریب کا وقت تھا۔ اتنے میں مجھے ایک دور سیاہی سی نظر آئی۔ ساتھیوں کو آڑ میں کر کے میں بلندی پر چڑھا کہ دیکھوں کیا چیز ہے۔ یکایک ہمارے عقب کے راستے سے کچھ سوار ہم پر ٹوٹ کر گرے بغیر دیکھے کہ کتنے ہیں، ہم گھوڑوں پر چڑھ کر نکل گئے۔ حقیقت میں وہ بیس یا پچیس سوار تھے اور ہم آٹھ تھے کہ اگر پہلے ٹھیک معلوم ہو جاتا تو جم کر مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ہم سمجھے ان کے عقب میں بڑی جمعیت ہوگی۔ دوڑے چلے گئے۔ سچ یہ ہے کہ بھاگنے والے زیادہ ہوں تو بھی کم تعداد پیچھا کرنے والوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مشہور ہے۔

صف مغلوب راہوئے سند است

(بہ تصحیح) خان قلی نے کہا ہم اس طرح نہیں چل سکتے۔ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ دو گھوڑے چن لیں اور آپ میرزا قلی کو کلتاش ایک ایک گھوڑا کو قتل لے کر تیز تیز نکل جائیں۔ شاید بچ جائیں۔ یہ اچھا مشورہ تھا، کیوں کہ سب مل بھی مقابلہ تو نہ کر سکتے۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ ہم دو ان سے بہت آگے نکل جائیں۔ جیسا اس نے کہا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ دشمن کے راستے دو کو پیدل کر جاؤں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایک کر کے خود ہی گرتے چلے گئے۔

میرا گھوڑا تھک چلا تھا۔ خان قلی اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اسے میرے حوالے کیا۔ میں اچھل کے اس کے گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ میرے گھوڑے پر۔ اسی وقت دشمن نے ہمارے دو اور آدمیوں کو جو پیچھے رہ گئے تھے، گرا لیا۔ خان قلی بھی پیچھے چھوٹ گیا۔ اسے مدد دینے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ ہم جو باقی رہے جس قدر تیز ہو سکتا تھا، گھوڑے دوڑاتے چلے جاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی مضطرب ہو گئے۔ ناصر دوست بیک بھی لڑکھڑا کر رک رہا۔ میرا گھوڑا بھی تھکنے لگا۔ قاسم بیک کے بیٹے نے اپنا گھوڑا مجھے دیا، میرے پہ خود سوار ہو گیا۔ خواجہ حسینی ننگڑا تھا ان نے ٹیکوں کا رخ کیا اب میں اور میرزا کو کلتاش رہ گئے اور ہمارے گھوڑے بھی سرپٹ نہ دوڑ سکتے تھے۔ پوسیا ہو گئے اور اس کا اور بھی ست چلنے لگا۔ میں نے اس سے کہا ”تجھ سے الگ ہو کر کہاں جا سکتا ہوں۔ ہمارا مرنا جینا ساتھ ہوگا، جیسا بھی ہو۔ چلا آ۔ میں اسے مڑ مڑ کے دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کہا ”میرے گھوڑے میں دم نہیں رہا۔ تم میرے ساتھ رکو گے تو خود بھی نہیں بچ سکتے۔ بہتر ہے کہ بڑھے جاؤ۔ شاید سلامت رہ جاؤ۔“ میری عجیب حالت ہوئی آخر وہ بھی پیچھے چھوٹا اور میں تنہا رہ گیا۔

دشمن کے بھی اب دو ہی آدمی نظر آرہے تھے۔ ایک (یہ تصحیح مترجم) بابائے سیرانی دوسرا بندہ علی۔ میرے گھوڑے کے مضطرب ہونے سے وہ نزدیک تر آرہے تھے۔ پہاڑ ابھی کوس بھر دور تھا۔ سامنے ہی چٹانوں کا ایک ٹکڑا نظر پڑا۔ میں نے سوچا گھوڑا تھک چکا ہے۔ پہاڑ ابھی فاصلے پر ہے، اب کیا کیا جائے؟ میرے ترکش میں کم سے کم بیس تیر تھے۔ خیال آیا اس ٹیکرے پر اتر جاؤں اور یہاں سے جب تک تیر باقی ہیں مقابلہ کروں۔ پھر سوچا کہ پہاڑوں تک پہنچ گیا تو گھوڑا چھوڑ کر تیر کمر بند میں لئے ہوئے اوپر چڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے چڑھنے کی قوت پر بھروسہ تھا۔ اسی خیال سے آگے بڑھے گیا۔

اب گھوڑا دلکی بھی نہ چل سکتا تھا اور پیچھا کرنے والے دونوں سوار تیر کے پر تاب پر آگئے تھے۔ میں تیر بجائے رکھنا چاہتا تھا۔ ان پر نہیں چلایا اور ادھر وہ بھی احتیاطاً ”دور دور ہی سے پیچھا کرتے رہے۔ سورج غروب ہوتے میں پہاڑ کے قریب آگیا۔ یکایک انہوں نے پکار کر کہا ”اس طرح تم کہاں جاؤ گے؟ جہانگیر میرزا کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔ ناصر میرزا بھی قید میں ہے۔“ یہ کلمات سن کر مجھے سخت پریشانی ہوئی اور سمجھا کہ اگر ہم تینوں پکڑے گئے تو یہ نہایت خطرناک بات ہوگی۔ میں نے جواب نہ دیا اور پہاڑ کے پہلو پر چلتا رہا۔

خاصی دور چلنے کے بعد انہوں نے پھر آواز دی اور اس مرتبہ گھوڑوں سے اتر کے ذرا ادب سے بات کی۔ میں نے کوئی توجہ نہ کی اور ایک نلے میں گھس کر اوپر چڑھنے لگا۔ عشا کی نماز کے وقت ایک بڑی چٹان ملی جو خاصے مکان کے برابر تھی۔ اس کے عقب میں ایسے چھجے نکلے ہوئے تھے کہ گھوڑا ان پر نہ چل سکتا تھا۔ اب ان پیچھا کرنے والوں نے گھوڑوں سے اتر کر پھر زیادہ خامانہ ادب کے ساتھ مجھ سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا ”اس اندھیرے میں بغیر راستے کے آپ کہاں جا رہے ہیں اور منشا کیا ہے؟ احمد تبیل آپ کو آپ کے تحت پر بٹھانا چاہتا ہے“ انہوں نے قسم کھائی کہ یہ سچ بات ہے۔ میں نے کہا ”مجھے اطمینان نہیں ہوتا میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اگر تم واقعی میری کوئی خدمت کرنی چاہتے ہو تو ایسا موقع سالہا سال تک نہیں ملے گا۔ تم مجھے وہ راستہ بتا دو جس سے میں خانوں کے پاس جا سکوں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہاری خواہش سے بڑھ کر سلوک کروں گا۔ لیکن یہ نہ کر سکو تو پھر جدھر سے آئے ہو ادھر ہی واپس چلے جاؤ۔ یہ بھی اس وقت میری خدمت ہوگی۔“ انہوں نے کہا کاش کہ خدا ہمیں یہاں نہ لاتا مگر جب آگئے ہیں تو آپ کو ایسی جگہ تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو جہاں آپ جائیں، ساتھ چلیں گے۔

میں نے کہا قسم کھاؤ کہ سچ کہتے ہو، انہوں نے حلفیہ عہد کیا اور مجھے بھی قدرے اعتبار آیا۔ میں نے کہا ”اس نلے کے قریب مجھے بڑا رستہ بتایا گیا تھا مجھے اس پر لے چلو“ ان کے حلف کرنے کے باوجود میں نے ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا بلکہ انہیں آگے رکھا اور خود پیچھے چلا۔ کئی میل چل کر ایک پہاڑی ندی کی گزرگاہ ملی۔ میں نے کہا میدان کا رستہ یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ ذرا ہچکچائے۔ پھر ہٹ کر بولے ”وہ آپ کی شاہراہ تو بہت دور پڑے گی“ حالانکہ ہم اس راستے پر فی الواقع پہنچ گئے تھے۔ مگر انہوں نے مجھ سے اصل بات چھپائی اور پھر ہم آدھی رات تک چلتے رہے۔ ایک اور ندی آئی تب وہ کہنے لگے اوہو ہم سے غلطی ہوئی۔ میدان کو جانے کا راستہ پیچھے چھوٹ گیا“ میں نے کہا، پھر اب کیا کرو گے؟ کہنے لگے غوا کا راستہ ذرا آگے ہے، اس سے چل کر ہم فرکت پہنچ سکتے ہیں۔

چنانچہ پھر چلتے رہے اور تین پہر رات گزر چکی تھی جب ہم کرنان کے نالے پر جو غوا سے آتا ہے پہنچے۔ بابا سیرامی نے کہا۔ آپ یہاں ٹھہریں، میں غوا کی دُندئی کا پتہ لگا کر آتا

ہوں، پھر تھوڑی دیر میں واپس آکر کہنے لگا۔ ”مجھے اس راستے سے کئی آدمی جاتے نظر آئے۔ آگے والا مغلی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس راستے ہم نہیں جا سکتے۔“ یہ بات سن کر میں بہت گھبرایا۔ صبح قریب تھی اور ہم ابھی مطلوبہ سڑک سے بہت دور کھیتوں ہی میں تھے۔ میں نے کہا ”دن کو چھپے رہنے کی کوئی جگہ مجھے بتا دو۔ رات کو گھوڑوں کے دانہ چارہ کھلانے کے بعد بنند کے گھاٹ کی طرف لے چلا وہاں سے دریا اتر کر ہم دوسرے کنارے پر بنند پہنچ جائیں گے۔“ ان میں سے ایک نے کہا ”پھاڑی کے اوپر جانب چھپنے کی جگہ مل سکتی ہے۔“

بندہ علی کرنان میں (سڑکوں کا) داروغہ تھا۔ نئے لگا۔ ”نود کچھ کھائے اور گھوڑوں کو کھلائے بغیر تو ہم سفر کر نہیں سکتے۔ میں کرنان جا کر دیکھتا ہوں کہ کھانے کی کیا چیز مل سکتی ہے۔“ غرض ہم پھر چلتے رہے اور کرنان سے کوئی ایک کوس کے فاصلے پر ٹھہرے۔ بندہ علی ہمیں چھوڑ کر کرنان گیا اور بڑی دیر میں صبح ہوتے جلدی جلدی تین نان لے کر آیا۔ مگر گھوڑوں کے لئے کچھ نہ لایا۔ ہم لپک کر ٹیکرے پر چڑھے ہر ایک نے ایک ایک روٹی جب میں دیائی۔ گھوڑوں کو پانی کے گڑھوں کے قریب باندھ دیا اور خود اوپر الگ الگ ہو بیٹھے کہ ایک دوسرے کو دیکھتا رہے۔

قریب دوپہر احمد قوشچی (باز شکاری) غوا کی راہ پر تین اور آدمیوں کے ساتھ اخی کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ خیال آیا اسے آواز دے کر بلاؤں اور وعدے وعید کر کے اپنے گھوڑے اسے دے دوں جو دن رات چل کر تھک گئے تھے اور دانہ چارہ نہ ملنے سے بالکل بے دم ہو رہے تھے۔ اور ان کے عوض میں اس سے گھوڑے مانگ لوں۔ مگر پھر مذہب ہو گیا اور اس پر مع ہمراہیوں کے اعتماد نہ جما۔ البتہ ہم نے آپس میں رائے کی کہ یہ سوار ضرور کرمان میں رات بسر کریں گے۔ اس وقت ہم اندھیرے میں جا کر ان کے گھوڑے نکال لا سکتے ہیں۔

دوپہر کو گھوڑے پر ایک چمکتی چیز دور سے جاتی ہوئی نظر آئی۔ پہلے تو ہم سمجھ نہ سکے لیکن پھر دیکھا کہ وہ (بہ تصحیح) محمد باقر بیگ تھا۔ وہ اخی میں میرے پاس رہا اور ہمارے شر چھوڑنے پر جو افرا تفری مچی اس میں بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا اور کہیں چھپ جانے کی فکر میں تھا۔ یہ بات باہر کو بعد میں معلوم ہوئی ہو گی۔ وقت کے تو وہ اپنے دو ساتھیوں اور کھوج لگانے والوں کی وجہ سے غلجیان میں پڑا ہوا تھا

”بندہ علی اور بابا سیرامی نے کہا، دو دن سے گھوڑوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نیچے وادی میں چل کر انہیں چرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے چنانچہ ہم سوار ہو کر کچھ نیچے آئے اور گھوڑوں کو چرنے چھوڑ دیا۔ نماز عصر کے قریب ایک سوار اسی ٹیکرے کے نیچے سے گزرتا نظر آیا، جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ غوا کا کھیا قادر بروی ہے۔ میں نے کہا، اسے آواز دو۔ اور ہماری آواز سن کر وہ نیچے ہمارے پاس آگیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرس و غیرہ سے تا امکان استمالت کر کے میں نے کہا ہمیں ایک رسی، درانتی، کلباڑی، دریا سے اترنے کا کوئی سامان مہیا کر دو اور ہمارے اور گھوڑوں کے لئے خوراک اور ممکن ہو تو ایک تازہ دم گھوڑا لا دو۔ قرار پایا کہ نماز عشاء کے وقت تک یہ سب چیزیں اسی جگہ ہمیں مل جائیں۔

”مغرب کے بعد ہمیں ایک سوار کرنان سے غوا کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں نے آواز دی کون ہے؟ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ اصل میں وہی باقر بیگ تھا جو دوپہر کو نظر آیا اور اب اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑ کر، رات ہوتے کسی اور جگہ جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آواز ایسی بدلی کہ گو برسوں میرے پاس رہا تھا، میں بالکل نہ پہچان سکا۔ ورنہ اسے روک کر اپنے ساتھ لے لیتا۔ اب تو اس کا ادھر سے گزرتا دیکھ کر الٹی پریشانی پیدا ہوئی۔ میرے دونوں ساتھی قادر بروی کی طرف سے بھی بدگمان ہوئے۔ بندہ علی نے کہا، کرنان کی نواح میں کئی غیر آباد باغ ہیں ہمیں وہاں جا کر قادر بروی کو اطلاع دینی چاہئے کہ اسی جگہ ہم سے آئے۔ یہی قصد کر کے ہم سوار ہو کر کرنان کے نواح تک آئے۔ سردی کا موسم اور بڑی سردی ہو رہی تھی۔ بھیڑ کی کھال کی ایک پرانی پوستیں جس کے اندر اونی استر تھا، وہ میرے لئے کہیں سے لے آئے اور میں نے اسے پہن لیا۔ ارزن (جوار یا باجرہ) کے آٹے کی پکائی ہوئی آتش کا ایک پیالہ بھی مجھے لا کر پلایا جس سے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے پوچھا، ”تم نے قادر بروی کے پاس کسی کو بھیجا؟“ بندہ علی نے جواب میں یقین دلایا کہ آدمی بھیجا ہے۔ حالانکہ ان نمک حرام گنواروں نے تبتل کے پاس اخی قاصد بھیجا تھا۔

ایک پختہ مکان ملا جس میں اندر جا کر ہم نے آگ جلائی، میں تھوڑی دیر سویا۔ یہ مردک خیر خواہی دکھانے کے بہانے کہنے لگے۔ ”جب تک قادر بروی کا جواب نہ آئے ہمیں یہاں سے کہیں جانا نہ چاہئے لیکن یہ مکان کئی مکانوں کے بیچ میں ہے۔ البتہ اس کے باہر کئی باغیچے غیر آباد ہیں اگر ہم ان میں چلے جائیں تو کوئی شبہ تک نہ کر سکے گا“ چنانچہ

آدھی رات کو ہم سوار ہو کر باہر ایک باغ میں گئے۔ بابا سیرامی چھت پر بیٹھ کر تمکبانی کرتا رہا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب وہ کوٹھے سے اتر کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا ”یوسف داروغہ آ رہا ہے“ مجھے بہت تشویش ہوئی۔ میں نے کہا، ”معلوم کرو کیا وہ میرے یہاں ہونے کی خبر پا کر آ رہا ہے؟“

بابا گیا اور کچھ دیر باتیں کر کے واپس آیا اور کہا ”یوسف داروغہ کہتا ہے کہ ایک پیادہ سپاہی نے اخی کے دروازے پر مجھے خبر دی کہ بادشاہ کرنان میں اس جگہ موجود ہے۔ میں نے کسی اور سے یہ بات نہیں کہی بلکہ خود اس پیادے کو دلی خزانچی کی حراست میں دے آیا ہوں۔ (یہ دلی اخی کی جنگ میں گرفتار کر لیا گیا تھا) پھر میں سیدھا یہاں گھوڑے پر چلا آیا۔ اخی کے حکام کو کچھ خبر نہیں ہے۔

میں نے بابا سے پوچھا، اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا ”وہ سب آپ کے نوکر ہیں آپ کو ان کے پاس جانا مناسب ہے۔ وہ سوائے اس کے کہ آپ کو بادشاہ بتائیں اور کیا کر سکتے ہیں“ میں نے کہا، ”انہوں نے تو بغاوت کی۔ مجھ سے لڑتے رہے۔ ان پر میں کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں؟

میری بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خود یوسف آ گیا اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل گر کے پکارا۔ ”میں سچی بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ تبتل کو تو آپ کے یہاں ہونے کی خبر نہیں، مگر بایزید آگاہ ہو گیا ہے اور اسی نے مجھے بھیجا ہے۔“ یہ سن کر عجب اضطراب مجھے ہوا۔ خوف جان سے بدتر کوئی شے دنیا میں نہیں۔ میں نے کہا، ”ٹھیک ٹھیک بات کہہ دے اگر اور بری صورت پیش آنے والی ہے تو میں باوضو ہو جاؤں؟“ یوسف قسمیں کھاتا رہا کہ جو کچھ کہا صحیح ہے۔ لیکن میں نے مطلق اعتنانہ کی۔ جانتا تھا کہ میری حالت کیسی نازک ہے۔ اٹھ کر باغ کے ایک گوشے میں گیا اور سوچنے لگا کہ آدی سو برس چھوڑ ہزار سال زندہ رہے تو بھی انجام کار.....“

اس مقام پر فرغانہ کے مغرور بادشاہ بابر کی داستان ناگماں منقطع ہو گئی ہے اور پھر کہیں دو سال بعد کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اوراق یا تو اس کی آوارہ گردی کے زمانے میں کسی پانی کی طغیانی میں یا آئے دن کی برق و ش بھاگ دوڑ میں ضائع ہوئے اور یا ممکن ہے بھول کر کسی اور صندوق میں حفاظت کی غرض سے رکھے گئے اور پھر یاد نہ رہے۔

بہر حال عجیب موقع پر سلسلہ ٹوٹا ہے۔ اصل ترکی سے فارسی ترک کے کاتب نے حاشیے پر بے اختیار یہ الفاظ ٹانک دیئے ہیں :

”سال کے باقی ماندہ واقعات----- خدا کرے کہ وہ ہاتھ آجائیں۔“

ترکی متن کے ایک اور کاتب نے بابر کو مذکورہ بالا یاس انگیز حالت سے نکالنے میں بظاہر خود طبع آزمائی کی۔ اس کی روایت کی رو سے جب بابر نے یقین کر لیا کہ موت آگئی ہے تو ندی میں جا کر شرعی غسل کیا۔ نماز پڑھی پھر ذرا دیر کو سو گیا تو خواب میں دیکھا آقائے قدسیاں آئے اور انہوں نے اسے نجات دلائی۔ یہ دیکھ کر تازہ قوت آئی اور اس نے تینوں دعا پازوں کو جو اسے گھیرے ہوئے تھے روکے رکھا۔ اتنے میں گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو اس کے دو جاں نثار عسکری باغ کی دیوار توڑ کر آپہنچے۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی اندجان میں جہاں بابر کے دونوں ماموں تھے خواب میں دیکھا تھا کہ اس لمحے بابر پادشاہ کرناں نام کے گاؤں میں ہے۔“ اس طرح کی بروقت نجات پانے یہ قصہ الف لیلہ کے قصوں سے ملتا جلتا ہے اور اسی قدر یقین کے لائق ہے۔ (دونوں نمازیں بھی محض تھکی ہیں۔ بابر کے خان ماموں اندجان میں تھے اور نہ اب اپنی سلامتی کے لئے وہ اس شہر کا رخ کر سکتا تھا پھر اس واقعے کے کئی پریشاں سال گزرنے تک اس نے پادشاہ کا لقب بھی نہیں اختیار کیا تھا۔ مزید برآں بابر نے گوشہ باغ میں غور و فکر کی غرض سے جانے تک جو کیفیت لکھی ہے اس میں اپنے نمک حرام رفیقوں سے ہشت مشمت کرنے کی کسی کوشش کا ذکر نہیں آتا اور نہ وہ ایسے شخص کو قتل کرنے کا خطرہ مول لیتے جو بادشاہ تھا اور زندہ رہنے کی صورت میں انہیں دولت کثیر انعام میں ملنے کی توقع تھی، انگریز مترجم فاضل بیورج نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہر چند الحاقی عبارت ترکی زبان میں ہے لیکن ایسے شخص کی نہیں ہے جو بابر کی طرح سوچتا بھی ہو ترکی زبان میں۔ دوسرے وہ دو مفروضہ بچانے والے جو عین وقت پر آگئے تھے، ان کا اس کی مستند تحریر میں کہیں نام نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ پھر بابر اس دن باغ سے کس طرح بچ کر نکلا۔ وہ آئندہ اوراق میں اس واقعے کا دوبارہ کہیں ذکر نہیں کرتا۔ ان دو سالہ مصائب میں وہ کوئی چھ مرتبہ اسی طرح گھرا، لہذا یہ موقع غیر معمولی نہیں تھا۔ بابر ہمہ اس زمانے کا آخری ایام کی جو کیفیت لکھی ہے، اس میں بعض اشارے مل سکتے ہیں۔ یاد ہو گا کہ تین دن و رات میں وہ صرف تھوڑی دیر کے لئے، وہ بھی بے اختیاری سے سو سکا تھا۔ ان واقعات کو اس نے ضرور بابا سرائی

اور بندہ علی کو پوری طرح قابو میں آجانے کے کچھ دیر بعد ہی تحریر کیا ہوگا۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ محمد باقر بیگ (اس کا مسلح دوست جو چھپتا پھرتا تھا اور خود بابر کے گھیرنے والے اس سے بچتا چاہتے تھے) وہ بہت جلد اس سے آشنا تھا۔

علاوہ انہیں حقیقت میں بابر امداد سے بالکل محروم نہیں ہو گیا تھا جیسا کہ اس نے کمال اضمحلال کی حالت میں خیال کیا۔ فریبی بابا اور بندہ علی نے جو اسے یقین دلایا کہ جمائگیر میرزا بھی پکڑا جا چکا ہے، یہ جھوٹی بات تھی۔ جمائگیر بابر کی باقی ماندہ جمعیت کے ساتھ سیر دریا کے دوسری جانب ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ خان ماموؤں کا جنگی لشکر قریب ہی سرحدی پہاڑیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اور مغول خانہ بدوشوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی ٹولیاں بلا اطلاع دیہات میں گشت لگاتی پھریں۔ فی الواقع ان کے بعض گروہ انہی کے آس پاس اسی زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ بابر کے کرناٹ کے باغ میں چھپنے کی خبر ضرور دریا کے کنارے تک پھیل گئی ہوگی۔

بہر حال وہ بہت جلد چھٹکارا پا کے باقر بیگ کے ہمراہ تاشقند کے رخ چل پڑا تھا۔ یہاں دو ماموؤں سے ملائی ہوا جو شیبانی کے مقابلے میں مغلوں کے آخری دفعہ جم کر لڑنے کی تیاری کر رہے تھے اور انہی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے اگرچہ وہ میدان میں آنے سے بچتے رہے لیکن آخر کار سخت معرکہ پڑا، جس میں فرغانہ اور بابر کے مستقبل کا بھی (جون ۱۵۰۳ء میں) فیصلہ کر دیا۔

یہ شیبانی خان کا کام تھا۔ دوسرے ماخذ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ازبک جنوب میں کوہستان سیاہ کے ان شہروں کو ٹٹول رہے تھے جن پر جاہ طلب خسرو شاہ کا عمل دخل تھا کہ اندجان سے تبتل نے انہیں مدد کے لئے بلایا۔ شیبانی نے فوراً لبیک کہی لیکن وہ سرفرد ہوتا ہوا آیا کہ فرغانہ کے اچھے ہوئے معاملات کا پہلے سے اندازہ کر لے۔ کچھ عرصہ بعد ہم اسے بخند میں جمائگیر میرزا کے مختصر لشکر کو گھیرے میں لیتے دیکھتے ہیں۔ اس میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہ آئی۔ البتہ خانوں کی فوجی تیاریاں اور انہی کے اوپر پہاڑیوں پر قبضہ نہ کر اس نے تامل کیا (بابر بھی اس وقت ماموؤں سے آشنا تھا) پھر یکایک بھڑیئے کا سا وہ کاٹ کے وہ انہیں ایک طرف چھوڑ کر غیر محفوظ تاشقند میں جا پڑا۔ شاہی بیگمات کو گرفتار کر لیا۔ انہیں میں بابر کی ماں کے پہلے ہی بہت کچھ میں جھیل چکی تھی، اور خانوں کی ماں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد ازبک سپہ سالار سرعت سے مشرق کی طرف

مڑا اور کم تعداد مغل فوجوں کو صف بندی کی بھی مہلت نہ دی، بلکہ بلا مبالغہ گرد راہ کے زروں کی طرح انہیں پر آگندہ کر دیا۔ بڑا خان اس معرکے میں اسیر کر لیا گیا۔ چھوٹے نے کسی طرح بچ کر بالاخر اپنے ملک کی راہ لی، جہاں سے دراصل اسے آنا ہی ناسازگار تھا۔ پھر وہ اسی رنج میں جان سے گزر گیا۔ اس ہزیمت آفرین جنگ میں ایک دستہ بابر کے ماتحت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اولاً ارض مغول کی طرف چلا تھا لیکن تھوڑی مدت بعد ہی ہم اسے وادی فرغانہ سے گزرتے دیکھتے ہیں۔

شیبانی کو اپنی قوت قاہرہ کے ساتھ رحم و کرم کے کرشمے بھی دنیا کو دکھانے کا شوق تھا۔ محمود خاں کو اسی غرض سے سلامت رہنے دیا تھا۔ چنانچہ اس کے مداح نظم ”شیبانی نامہ“ کے مصنف کے قول کے مطابق اس نے مغل خان سے کہا کہ ”میں نے تمہیں گرفتار کیا، لیکن قتل نہیں کروں گا۔ میری جوانی کے زمانے میں تم نے ایک بار میری مدد کی تھی۔ میں بھی تم کو رہا کر دوں گا“ لیکن کہاں جانے کے لئے؟ شیبانی کے سوار بچے کچے مغل قبائل کو مشرق میں بہت دور، تیمان شان کے دروں تک، خاقان چین کی سرحدی چوکیوں کے سامنے تک دھکیل چکے تھے۔ ان ویدیائی کے چینی برجوں اور بخارا کا مزارات و مقابر کے درمیان تمام راستوں پر اب ازبکوں کی عملداری تھی۔ کچھ مدت تک جس کا صحیح تعین نہیں ہو سکا، محمود خان صحرائی راستوں پر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ان کا سارا غرور خاک میں مل چکا تھا اسی حال میں اسیرماں کے نام ایک ”نفیس خط“ تاشقند لکھ کر بھیجا۔ وہی تاشقند جہاں عیش و حکومت کے لطف اٹھائے تھے۔ پھر کچھ ایسے سامان ہوئے کہ ویران صحرا چوڑ کر بنجد آنے کی ترغیب ہوئی۔ مگر یہاں اس کے پہرہ داروں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ سب بیٹے بھی ہلاک کر دیئے گئے۔ ان میں وہ بڑا بیٹا بھی قتل ہوا جو مغل جھنڈوں کی سلامی کی رسم ادا ہوتے وقت بابر کے ساتھ سفید فرش پر اسٹادہ تھا۔ شیبانی ان کے قتل کے وقت موجود نہیں تھا لیکن یہ خبر سن کر کچھ کہا تو یہ کہ دشمن کو دوسری بار زندہ چھوڑنا بے وقوفوں کا کام ہے“ حقیقت میں اس نے جدید مقبوضات میں حکمران طبقے یا مرتبے کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑا۔ تبتل نے اخی یا ارشیان کی جنگ میں شیبانی کو تھوڑی کمکی فوج بھیجی تھی لیکن اس کا بھی بہت جلد چپکے سے اور گویا بالا ہی بالا کام تمام کر دیا گیا۔

اب سارا فرغانہ بلکہ دریا پار تک کا علاقہ بلا شرکت شیبانی کے زیر نگیں تھا۔ اس نے اپنی خانہ بدوش قوم کی ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ اور نیم ویران سمرقند میں امیر تیمور کے

تخت پر خود متمکن ہو گیا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑے بڑے تیوری خاندان کے اکثر اکابر کا استیصال کر دیا تھا۔ اس کے تسلط کے ساتھ ملک میں حضرت کی بجائے بدویت بڑے پیمانے پر زراعت کی بجائے چراگاہ اور مذہبی تعلیم و تعلم کی بجائے ازبک سپہ سالاروں کی عسکری ملازمت کو فروغ ہو رہا تھا۔

شیبانی نے آئندہ جمائگیر میرزا کی کچھ فکر نہ کی جس کا کردار کمزور اور جمعیت پر آئندہ ہو چکی تھی۔ البتہ سبک پابا اور خواجہ ابوالکرام کی تلاش و تعاقب کا حکم دیا (علی دوست کا ایک بیٹا زندہ رہ گیا تھا۔ اسے ازبکوں کے کھوجی پہلے ہی پکڑوا چکے تھے) خواجہ بیکار بیٹھنے والا نہ تھا۔ تاشقند کے قید خانے سے نکل بھاگا بھیں بدلا، حتیٰ کہ ڈاڑھی تک منڈوا دی تھی لیکن ضعیفی کے باعث زیادہ دور نہ گیا تھا کہ ایک خبر نے دغا دی۔ شیبانی سے اس مرد بزرگ کا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا آپ کی داڑھ کیا ہوئی۔ فاضل خواجہ نے جواب میں فارسی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ۔

”خدا نے اگر چراغ جلایا تو جو اس کو پھونک مار کر بجھائے گا

وہ اپنی ڈاڑھی کو آگ لگائے گا۔

بابر بچ کر نکل گیا اگرچہ بڑی مشقت اٹھانی پڑی۔ بظاہر ان پہاڑی پگ ڈنڈیوں سے گیا جنہیں خوب جانتا تھا۔ ایک بار پہاڑ کے درے سے مارا مار نکلتا ہوا دیکھا گیا جسے تھوڑی ہی دیر میں برف نے بند کر دیا۔ ایک مدت بعد لکھتا ہے کہ میں نے قریب قریب ایک سال پہاڑیوں میں بڑی تکلیف سے گزارا۔

حیرت ہے کہ شیبانی خان نے عورتوں کے بندی خانے سے جہاں بابر کی بارعب ثانی اس-سن (ایسان) دولت بیگم مرض الموت میں پڑی تھی، بابر کی ماں کو آزاد کر دیا۔ ازبک کمینہ فطرت نہ تھا بلکہ خواتین کے معاملے میں خاصی عالی ظرفی دکھاتا تھا۔ علی بیگ کی ماں، بابر کی بہن خازندہ اور محمود خان کی ایک بیوی کو نکاح میں لا چکا۔ کیا اسے امید تھی کہ بیمار ماں بابر کے ساتھ ہوئی تو اسے ڈھونڈنے میں (جس کی ہلاکت کا خاص طور پر خواہاں تھا) آسانی ہو جائے گی؟ اور یا خازندہ بیگم نے کہہ سن کر اپنی ماں کو رہائی دلوائی؟ اس سوال کا جواب ترک باری کے گم شدہ اوراق کے ساتھ گم ہو گیا۔

زیر نظر سال میں آل تیمور کی اپنی قدیم سلطنت میں خانہ جنگی اور فتح و شکست کے واقعات پر پردہ پڑ گیا تھا۔ عمر شیخ اور اس کے بھائی بھتیجیوں کا پر آشوب مگر خاصا درخشاں دور

ختم ہوا۔ سمرقند برابر پہنچ رہا تھا۔ چند سال میں کچھ اور متروک ہونے پر محض قصہ ماضی بن جانے والا تھا۔

جون ۱۵۰۳ء میں جب کہ سورج برج سلطان میں داخل ہوا ہمارے شیر نے از خود اور خلاف توقع ایک اور فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ کوہستان سفید کے قبائل ایماق میں تھا۔ اس کی ماں اور باقی ماندہ رفیقوں کے اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ یہ اس کے وطن مالوف کی جنوبی سرحد تھی پھر میرے دل میں آئی کہ فرغانہ کو خیرباد کہنا چاہیے جس ملک میں پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ ہو اسے چھوڑ کر کہیں بھی چلے جانا بہتر ہوگا۔

یہ فیصلہ یقیناً بہت گراں گزرا ہوگا۔ دس برس تک برابر سخت جدوجہد کرتا رہا کہ آبائی علاقے میں کہیں ٹھکانا میسر آجائے۔ ان سینن میں بار بار ”میرا ملک۔ میری رعایا“ کے الفاظ زبان پر آتے رہے۔ یہ تصورات دل میں جتے ہوئے اور محو ہونے والے نہ تھے لیکن اب پہلی دفعہ اس نے اپنی دادی، سیردیا قدیم دارالسلطنت سمرقند سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ اس کے مختصر اردو میں جو خاندان یا ان کے نام لیوا باقی رہ گئے تھے، ان کے لئے کہیں نہ کہیں کوئی بجا و مادی تلاش کئے بغیر نہ رہے گا۔ اس طرح مصمم ارادہ کر لیتا بابر کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ پھر اسے کوئی چیز متغیر یا متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ اس استقامت کے ساتھ اقتدار طلبی کا نادر جذبہ بھی وہ شامل کر لیتا تھا۔ اس کے ذہن میں نئی سرزمین بعید کوہستانوں میں صرف پناہ گاہ ہی نہ ہوگی۔ چنانچہ ایک ایسے مقام پر وہ اپنی مہاجرت کے دوران بغیر ٹھہرے جلد آگے بڑھ گیا۔۔۔ بلکہ وہاں بھی کوئی دریا، کوئی شہر ایسا ہوگا جس کے گرد سمرقند جیسے باغ تیار کئے جاسکیں گے۔

پچیس برس بعد اس نے حکومت کرنے کے لئے ایسا ملک پالیا جہاں اس کے سب متوسلین کے اہل و عیال کو بھی پناہ مل گئی اور شہر بنانے کا بھی آغاز کر دیا اگرچہ وہ ایسی جگہ تھی جہاں اسے تعمیر کا کوئی خیال نہ تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس وقت اس نے ملک چھوڑ کر بے نوا ہو جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت وہ اس کے حق میں پلٹ گئی۔ واقع میں بابر کو خدا ہی نے طالع آزمایا تھا۔

کابل کی بادشاہی

دریائے زخار کے پار

”فرغانہ سے نکل کے ہم ولایت حصار کی گرمائی چراگاہوں میں داخل ہوئے۔ یہاں میری عمر ۲۳ سال کی ہوئی اور میں نے پہلی ڈاڑھی استرے سے منڈوائی۔ وہ لوگ جو ابھی تک مجھ سے امید رکھتے تھے، چھوٹے بڑے دو سو سے زیادہ، تین سو سے کم تھے۔ ان میں زیادہ تر بے سواری کے پیدل، چمڑے کے موزے پہنے، لائٹیاں ہاتھ میں، بھیڑ کی کھال کے کوٹ شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ ہماری بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ ہمارے پاس صرف دو خیمے تھے۔ اپنا خیمہ میں نے والدہ کو دے دیا تھا۔ دوسرا جس کی چوبوں پر کسل باندھ لئے تھے، رات کو میرے واسطے نصب کر دیا جاتا تھا۔“

باہر وطن چھوڑ کر مقررہ راستے ہی سے جا رہا تھا، یعنی پہاڑی بیٹیوں سے جو خانہ بدوش ایمان قبائل کے پڑاؤں سے گزرتی تھیں اور وہ رات کے وقت اپنے معزز مگر بے نوا مہمانوں کو کھانا لا دیتے تھے۔ وہی اگلی منزل تک جہاں کوئی پہاڑی ندی مل کھاتی گزرتی، پہنچانے کی غرض سے رہ نما ساتھ کر دیتے تھے۔ افواج کے کوہستانی غائبانہ تاروں نے باہر کا نام اور زوال کا قصہ ایمان قبائل میں پہلے سے پہنچا دیا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے دو خیموں کے لئے پاسبان مقرر کر دیتے تھے۔ کیوں کہ یہ قبائلی عزت کا معاملہ تھا کہ ان کے ایک شبہ مہمانوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ وہی باہر کو نیچے کی وادیوں کی خبریں لا لا کے سناتے تھے۔ بعض نوجوان جنگ آزما اس کے فراری لشکر میں بھی شامل ہو گئے۔ حسب معمول باہر ان بالائی چراگاہوں میں لوگوں کے دل موہ رہا تھا۔ علی ہذا خود اس کا دل نئی زمینوں کی ایک ایک چیز پر متوجہ تھا۔ اس کے وطن کے دریا سیر (سیوں) کے سرچشمے اوپر چھوٹ گئے اور اب وہ آمو (دریائے زخار جیوں) کے منابع سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق کی

جانب بستے ہیں، جہاں لاجوردی پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان بوسی کرتی نظر آتی تھیں۔ اس نے یہ بات بھی ذہن میں محفوظ کی کہ یہاں قدرتی حصار موجود ہے جو ازدست رفتہ وطن کے گویا سر پر چھایا ہوا تھا۔ اسی کو ایماق قبائل کے سردار بدخشاں موسوم کرتے تھے یہ لوگ چمکتے ہوئے کبریٰ نکلڑے بابر کے پڑاؤ کے الاؤ پر لاتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ بدخشاں میں لاجورد، زمرد اور سرخ آتشیں پتھر، یعنی یا قوت کثرت سے ہوتا ہے، البتہ وہ بہ قسم کہتے تھے کہ ”سردیوں میں تلے اور اوپر تین دن تین رات تک سورج نہیں دکھائی دیتا“ یہ بات بھی انہوں نے چپکے سے بتائی کہ ان پہاڑوں کے اندر سے ایک چور راستہ ندی کے کنارے کنارے جو کوہ پانکی کی برفانی ڈھلانون سے بہ کر کاشغر گئی ہے، مشرق میں نکل جاتا ہے۔ اسے سن کر بابر کی رائے ہوئی کہ یہ چھپنے کی بہت محفوظ جگہ ہو سکتی ہے اور اس نے اسے یاد رکھا۔

سردست کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کے وسائل اسے میسر نہ تھے۔ پہلی دفعہ ڈاڑھی منڈانے کی تقریب میں کوئی جلسہ ضیافت ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ اپنی غربت و افلاس میں اس کا خیال تک نہ کر سکا۔ اگرچہ اپنے علاقائی بھائی جمالتگر مرزا کی شادی انہی دنوں کی تو اس رسم کو منانے کا کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا۔ اس بھائی کی مخالفت سے جو چرکے دل کو لگے تھے، انہیں بابر بھول جانے کی کوشش کرتا تھا اور جمالتگر کے چھوٹے موٹے ساز باز کو بھی اپنے ہی تک رکھتا تھا۔ نوجوان شہزادے کو ایسی سازشیں رات کو شراب کے نشے میں سو جھا کرتی تھیں جو وہ غم غلط کرنے کے لئے پینے لگا تھا۔ اس سے بھی چھوٹا بھائی ناصر میرزا بابر کے لئے ایک اور درد سر بن گیا تھا واضح رہے کہ یہ دونوں ازبکوں سے جان بچا کر بھاگے اور بابر کے پاس آگئے تھے۔

خوف انگیز ازبک سواروں کی ٹولیاں فراریوں سے کچھ زیادہ دور نہ تھیں۔ یہ تو ٹھیک معلوم نہیں کہ ان کے قراول پہاڑی بیٹوں میں بابر کا پیچھا کر رہے تھے یا نہیں مگر شیبانی کے صحرائی جنگ آزماؤں میں شکست خوردہ خانوں کے تیس ہزار مغل سپاہی آٹے تھے اور اب یہ مڈی دل جنوب کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔ جنوبی پہاڑوں میں خسرو شاہ کا عمل دخل تھا۔ شیبانی اس کی سرکوبی کی تیاریاں کر رہا تھا جب کہ مغل خانوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ لیکن اب تاشقند کا بندوبست کرنے کے بعد اس نے دوبارہ جنوب کا رخ کیا۔ پہاڑی ایماق ان واقعات پر نظریں لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ اطلاعات بابر کو پہنچائیں۔

حقیقت میں آمو دریا کے بالائی کناروں پر سبھی کی آنکھیں آنے والے طوفان پر لگی تھیں۔ اسی حالت منتظرہ میں طاقت ور ازبک سے پہلے بابر کے آنکھنے کا واقعہ پیش آگیا۔ مگر اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہی ایک ایسا تیموری شہزادہ تھا جو بہادری سے شیبانی کے خلاف لڑا اور سلامت رہ گیا۔ تیز رو آمو کے معبر پر باقی بیگ منتظر ملا۔ وہ یہاں کی چوڑی پٹی کا حاکم اور خسرو شاہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے بڑی تعظیم مکرم سے تیمور کے بے خانماں وارث کا خیر مقدم کیا اور اس کی رفاقت میں رہتے کی پیش کش کی۔ اپنے اخلاص کے ثبوت میں اپنے اور اپنے عمائد کے بال بچوں کو بھی مصلحت اندیش باقی بیگ بابر کی لشکر گاہ میں لے آیا۔ یہ جنوبی لوگ لباس فاخرہ میں ملبوس، درباریوں کے ظرفانہ طرز میں خوب باتیں بناتے تھے۔ بلکہ باقی کے طور طریق دیکھ کر تو بابر کو علی دوست کی یاد تازہ ہو گئی جو اس طرح بے نشان مارا گیا کہ کوئی رونے والا تک اسے نہ ملا۔ باقی نے آتے ہی، اگرچہ تمیز کے ساتھ جمائگیر میزرا کے ہمراہ رہنے پر بھی اعتراض کیا۔ اس نے سعدی کا قول بھی سنایا کہ ”وہ درویش در کھنے بہ خشنود دو پادشاہ در اقلیے نہ گنبد“ بابر کلام سعدی سے واقف تھا۔ اسے پورا قطعہ یاد آیا کہ:

نیم تانے گر خورد مرد خدائے
بذل درویشاں کند نیمے دگر
ہفت اقلیم از گبیرو بادشاہ
ہم چناں در بند اقلیم دگر

تاہم وہ جمائگیر کو چلتا کر دینے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ دریا دریا سفر کر رہے تھے کہ ایک پرانا مگر بے مروت دست تیر علی سلاخ آ ملا۔ معلوم ہوتا ہے وہ اور علی ہذا باقی بیگ اپنی سلامتی اسی میں سمجھے کہ ازبکوں کی آمد آمد پر خسرو شاہ کو چھوڑ کر بابر کے پاس آجائیں۔ مگر سلاخ کی بیہودہ گوئی جسے بابر برداشت کرتا تھا، باقی بیگ کو بہت ناگوار ہوئی اور آخر سلاخ کو رخصت کر دیا گیا۔ اس مرتبہ سلامتی کی تلاش میں وہ ایسا گیا کہ پھر اس کا پتا نہ چلا۔

جنوب میں آگے بڑھے جانے میں خود بابر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے پاس خاصا بڑا لشکر جمع ہو رہا ہے۔ پرانے پرانے مصاحب چلے آ رہے تھے۔ خود خسرو شاہ کے مغل سپاہیوں کی طرف سے ایک پیام بر صیغہ راز میں پیام لایا کہ ”لشکر مغل بادشاہی کے سچے

باب کرے۔ قرنیہ کہتا ہے کہ اسے یارومہ کے شہریوں کو یہ گمان نہ تھا کہ نوجوان قرطاجنی سپہ سالار اس موسم میں الپس سے اپنی فوج گزار لائے گا۔ تاہم تفصل کا فرض تھا کہ اگر وہ آئے تو شمال ہی میں اس کا راستہ روکے۔ چنانچہ وہ پہاڑ کے دروں کی طرف بہ غلٹ روانہ ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ مینی بال ان سے گزر کر پو کی کھلی وادی میں آپہنچا ہے۔ حیرت زدہ ہو کر وہ کیلونندی کی طرف مڑا اور کنارے کنارے ادھر چلا جہاں وہ دریائے پو سے جا ملتی ہے۔ مناسب رائے یہی تھی کہ اپنے تربیت یافتہ جیوش کو لے کر جس قدر جلد ممکن ہو اس چکر دینے والے دشمن سے جا بھڑے اور اس مرتبہ اسے نکل کر نہ جانے دے۔ تفصل کی فوج کے حوصلے بلند تھے۔ صف آخر کے سن رسیدہ سپاہیوں کو اتنا یاد تھا کہ فنیقیوں (Punics) کو ساریہنہ اور کورسکا حوالے کر کے صلح خریدنی پڑی۔ یہ آزمودہ کار کہتے تھے اور باور کرتے تھے کہ فنیقی دست بدست جنگ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ادھر بعض یک صدی سردار (سپوریں) سناتے تھے کہ ہمارے تفصل کی ایک جمعیت رہون کے کنارے مینی بال کے اسی لشکر سے لڑنے گئی تو وہ ہارا اور بھاگ نکلا تھا۔

بایں ہمہ جب لیس بہت احتیاط سے آگے بڑھا۔ رات کے پڑاؤ کو خندقوں سے محفوظ کراتا رہا۔ مگر جب آخری بار شورئی کے لئے فوج کے سرداروں اور عوامی وکلاء یعنی ”تری یونوں“ کو جمع کیا تو تقریر یہ کی کہ ”آپ یہ نہ سمجھیں کہ دشمن کے سپہ سالار نے الپس پار کرنے میں کوئی بڑی دلیری دکھائی ہے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اپنی حکومت کے ڈر سے بڑھا چلا آیا ہے۔ سفر میں اس کے لشکر کا بڑا حصہ مرکب گیا ہے اور جو زندہ آئے وہ بھی سردی اور بھوک سے نیم مرده ہو گئے ہیں۔ ان کے گھوڑوں کی حالت اور بھی خراب ہے۔ اسے رومن قوم کی خوش قسمتی سمجھئے کہ ہمیں اس پر ہر طرح کی فوقیت حاصل ہے“ اس کی بات بے بنیاد نہ تھی۔ اسے ضرور خبریں ملتی رہی تھیں۔ اس نے اپنے رفیقوں سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔

ادھر تو شک نہیں کہ پریشانی مینی بال کو لاحق ہو گی۔ باقاعدہ جیوش سے اس کا پہلے کبھی مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ پھر پوری جمہوریہ رومہ کی قوت تفصل کی پشت پر تھی

جس کی پچھلی مردم شماری میں سات لاکھ ستر ہزار قابل جنگ مرد گئے تھے مہل کر کے بیٹے کے پیچھے اطالیہ میں کوئی بھی مددگار نہ تھا۔ الپس کا راستہ برف نے بند کر دیا تھا اور آگے پائی رین کے روکنے کو بھی رومی سپاہ رہوں پر پہنچ چکی تھی اور طرف سمندر تھا جس سے صرف اس کے دشمن کام لے سکتے تھے۔ چنانچہ اسی ذریعہ مواصلات سے انہیں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ یہی بال کو کسی ساحل سے خبر نہیں پہنچتی تھی۔ اسپین میں وہ قرطاجنہ شہر تک سے نامہ برکبوتروں ورنہ ہر کاروں کے ذریعے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ اب وہ جس جگہ اور جس موسم میں تھا، وہاں نگاہ کام نہ کرتی تھی۔ عجب نہیں کہ اس گر دو پیش میں اس کو سب سے زیادہ تشویش اسی عدم رویت کی وجہ سے ہو رہی ہو۔

ایک اور پریشانی کا سبب یہ تھا کہ ان کے متوقع حلیف یعنی غال آکر نہیں ملے بلکہ انہیں شبہ تھا کہ ان کے بعض گروہ رومی صفوں میں ابھر کر لڑنے آئے ہیں۔ یہی بال کے دو سن رسیدہ سپہ سالار پرٹ اور مہربال شاید واپسی کا مشورہ دیتے تھے۔ اس نے ان سے کہا ”ایک بات یقینی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم واپس نہیں جاسکتے“

اہل لشکر سے عام خطاب کرنے کی بجائے اس نے انہیں ایک تماشا دکھانے کا انتظام کیا۔ ایک بڑے سے نشیبی میدان کے چاروں طرف سپاہی جمع ہو گئے تو قیدیوں کی ایک جماعت وسط میدان میں لائی گئی۔ یہ بھی غال قوم کے لوگ تھے جو پہلے مزاحم ہوئے اور پکڑے گئے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے، میلے کچیلے، بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے اعلیٰ درجے کے ہتھیار، ڈھالیں اور چھتر جسے وہ بہت پسند کرتے تھے، ڈال کر یہی بال کی طرف سے پیش کش کی گئی کہ کوئی سے دو قیدی جو خوشی سے آمادہ ہوں، یہ ہتھیار لے کر باہم لڑیں، جو زندہ سلامت رہے ہتھیار اور آزادی اس کی ہو جائے گی۔ یہ سن کر سبھی قیدی قسمت آزمائی کے لئے تیار ہوئے مگر ان میں سے صرف دو کو مقابلے کا موقع دیا گیا اور قرطاجنی دیکھ رہے تھے کہ پوری طرح ہتھیار سجنے کے بعد دونوں کس اعتماد و ناز کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ انہیں احساس تھا کہ پورے مجمع کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی ہیں۔ پورے جوش اور بے جگری سے لڑے یہاں

تک کہ ایک مہلک زخم کھا کر گرا۔ مگر مرتے مرتے بھی اس جوان مرد کی حالت قیدیوں سے خوب تر نظر آتی تھی۔

ہزار ہا دیکھنے والے اس پر معنی تمثیل کا مطلب سمجھ گئے۔ ان کے سامنے بھی فتح کی شادمانی اور انعام تھا یا بہادرانہ موت۔

رات کو ہر الاؤ کے گرد سپاہیوں کو سرداروں نے سپہ سالار کا پیام سنایا کہ ”آج کے دن سے تمام قوموں کو قرطاجنہ والوں کے برابر حقوق و مراعات حاصل ہوں گے۔ تمام غلام جو اپنے آقاؤں کے ساتھ آئے ہیں، آزاد کر دیے جائیں گے اور ان کی قیمت آقاؤں کو بیٹی بال ادا کرے گا۔

یہ اہم اقدام زیر دستوں کے جن میں نقد بشارت اور جملہ گروہوں میں وحدت کا باعث ہوا۔ اس نے انہیں مزید انعام کا امیدوار بنایا اور جلد ہی یہ توقع اس اعلان سے پوری ہوئی کہ بیٹی بال قول دیتا ہے کہ اطالیہ میں فتح پانے کے بعد جو لوگ بھی چاہیں، انہیں وطن جانے کی اجازت ہوگی۔“

قریب ہی ایک صبح کو، کہ ابھی تک کمندی کے کناروں پر چھائی ہوئی تھی فریقین جنگ ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ قواعد دان رومی جیوش از خود پھیل کر لڑنے کے لئے آگے بڑھے بازوؤں پر محافظ رسالے آڑ کیے ہوئے تھے۔ وہ قرطاجنہ کے مدہم نظر آنے والے لشکر کی طرف بڑھے لیکن کچھ زیادہ دور نہیں جاسکے تھے کہ دور دونوں سروں پر قلعیری اور بربر سوار نمودار ہوئے اور جھلڑ کا جھلڑ رومی بازوؤں کے رسالے روندتا ہوا گزر گیا اور اسی ایک جھپٹے پر لڑائی ختم ہو گئی۔ رومی سواروں کی تعداد بہت کم تھی۔ افریقہ والوں کی یورش نے ان کی صفیں توڑ دیں۔ دراصل وہ افریقی اور اسپینی آزمودہ کا رشتہ سواروں کے مقابلے میں محض اسپ سوار سپاہی تھے۔ انہی میں قنصل جب لیس تھا جو زخمی ہو کر گرا اور کہا جاتا ہے کہ اس کے نوجوان بیٹے اور کسی غلام نے اسے بچا کر نکالا۔ تاہم وہ سخت زخمی ہو گیا۔ سوار فوج کی تیز و تند یورش کے بعد نومیہ (موجودہ جنوبی تیونس) کے پیادے بڑھے اور لمبا چکر دے کر رومی جیوش کو گھیرنا شروع کیا جو اپنی جگہ پر ٹھہرے رہ گئے تھے۔ اس عقبی حملے کو روکنے کے لئے رومیوں

کی پچھلی صفیں مڑ کر دشمن کے مقابل آئیں کہ اپنے لمبے برچھوں سے انہیں روکیں۔ مگر حملہ آور افریقی صرف سامنے سے گزرے چلے گئے اور دور ہی سے سانگیں (چھوٹی برچھیاں) پھینک کر ماریں۔ یہ خطرناک صورت دیکھ کر پب یس یا اس کے نائب نے بروقت حکم دیا کہ رومی جیوش پسپا ہو کر اپنے پڑاؤ پر جائیں جسے رات کو خندقیں کھود کر محفوظ کیا گیا تھا۔ بازو کے رسالوں کی حفاظت سے محروم ہونے کے بعد پسپائی ہی مناسب تھی اور رومی پیوستہ صفوں میں اپنے زخمی اٹھا کر واپس ہوئے۔ افریقہ والے دور سے پیچھے پیچھے آتے رہے جیسے تماشائی کسی نئی چیز کو دیکھتے ہیں۔ مورچہ بند پڑاؤ پر انہوں نے حملے کا اقدام بھی نہیں کیا۔

سکینو ندی کی یہ آویزش کچھ عجیب سا معرکہ تھی۔ (ظاہراً کامیابی کے باوجود) مینی بال نے اپنی فوجوں کو مزید جنگ کرنے سے روک لیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومی جیوش کے طریق جنگ اور نقل و حرکت کا اچھی طرح مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر غالباً اس کے جاسوسوں کے ناظم کرٹلو اور تجربہ کار غل سردار بھی اسے تفصیلات بتا رہے تھے اور اہل رومہ کے فوجی احکام جو بوق اور طبل بجا کر دئے جاتے تھے، ان کا مطلب سمجھاتے تھے

غل سردار کہتے تھے کہ رومی جیش تائی بر کے قبیلوں کو جنگ کے دیوتا کا دیا ہوا عطیہ ہے جس میں تمام نوجوان رومی ایک مدت کے لئے ضرور شامل ہوتے ہیں۔ اور انہیں سخت اور پیہم تربیت سے جنگی قواعد کا اس قدر پابند اور عادی بنایا جاتا ہے کہ حکم سن کر وہ از خود اور بے اختیار تعمیل کرنے لگیں۔ ہر جیش کے بڑے پرچم پر سونے یا چاندی کا عقاب بنا ہوتا ہے اور یہ سب سے چیدہ جماعت ایک ہزار ("کوہورت") لے کر چلتی ہے وہ ہمیشہ صف اول کے دست راست پر ہوتی ہے اور دوسرے سب کو ہورت جن کے اپنے جھنڈے الگ الگ بھی ہوتے ہیں، اس بڑے عقاب جھنڈے پر برابر نظر لگائے رہتے ہیں۔ نوآموز سپاہی آخری کوہورت سے ترقی کر کے چند سال میں چیدہ کوہورت تک پہنچ سکتے ہیں اور دس جوانوں کی سربراہی سے بڑھتے بڑھتے "سپورٹین" یعنی ہزاری سردار کے لائق رشک مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں۔ کوہورت میں

جنگی جوان ساڑھے بانسو، مقررہ جگہ پر کھڑے کیے جاتے ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح، حکم پر نقل و حرکت کرتے ہیں ”پرنسپ“ یعنی صف اول کے سپاہی سب سے قوی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے دوسری صف میں کم قوت کے ”ہس تتی“ یعنی نیزہ بردار اور سب سے پیچھے پرانے آزمودہ کار ”تری اری“ تیسری صف میں رکھے جاتے ہیں۔ ان کا کام ضرورت کے وقت مدد دینا ہے انہی کی ایک ردیف یا محفوظ فوج بھی ہر جیش کے لیے الگ رکھی جاتی ہے۔ ہر جیش میں ساڑھے چھ ہزار پیادہ سپاہیوں کے علاوہ قریب چار سو سوار اور مزید نیم مسلح سوار بھی ہوتے ہیں جن سے دشمن کو پریشان کرنے یا تعاقب میں دوڑانے کی خدمت کی جاتی ہے جیش کے بازوؤں پر اس کے مقرر تعداد کے ماسوا اطالوی حلیفوں کے دستے شامل کر لیے جاتے ہیں جو جسمانی اعتبار سے قوی تر لیکن رومی جیوش کی سخت تربیت سے عاری ہوتے ہیں۔

یعنی بال سمجھ گیا کہ یہی سخت تربیت اور انضباط رومہ کی جنگی قوت کا راز ہے۔ جیوش کو پابند کر دیا جاتا ہے کہ کبھی اپنی جمعیت یا پوستہ صف کو نہ چھوڑیں۔ نہ فرار ہوں نہ تعاقب میں دوڑیں۔ ان کے تمام سپاہی ایک ہی نمونے کے اسلحہ سے مسلح ہوتے ہیں اور خندق کھودنے کے اوزار اپنی سفری پوشش اور خوراک پیٹھ پر لاد کر چلتے ہیں۔ وہ خود اپنے پڑاؤ بناتے اور ایک ہی طرح کوچ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ آٹالے کی گاڑیوں میں تختہ پل یا چوبی برج بنانے کے شہتیر سلمان اوزار اور پتھریا برچھے پھینکنے کی بمبختیش رہتی ہیں۔ اور اس طرح ایک رومی لشکر مورچہ بند ہو کر محصور ہونے یا محاصرہ کرنے کے تمام ضروری آلات اور ساز و سامان سے لیس ہوتا ہے۔

اہل رومہ کی جنگی تنظیم ظاہراً ہر اعتبار سے مکمل تھی لیکن قرطاجنی سپہ سالار نے فوراً بھانپ لیا کہ رومی جیش کے سپاہی صرف وہی کام کر سکتے ہیں جس کی انہیں تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی ساری نقل و حرکت اپنے سرداروں کے حکم پر ہوتی ہے اب اگر یہی فوجی حکام دھوکے میں ڈال دیے جائیں یا بالکل کسی نئی صورت سے ان کا سابقہ پڑ جائے تو وہ کیا کریں گے۔ اور پھر یہ پوری کل کس طرح چلے گی؟

دوسری تفصل ثانی پیرئیس کی امنگیں

کینو ندی پر مہینی بال نے چند فائدے اٹھائے رہوں پر اس کے نومدی سپاہیوں کی چند ٹولیوں نے رومیوں سے زک پائی تھی۔ کینو کے معرکے نے ان کارومیوں سے لڑنے کا حوصلہ بحال کر دیا۔ رومی جیوش کے طور طریق کے تین دن کے مشاہدے میں اسے بخوبی علم حاصل ہو گیا۔ تیسری سب سے اہم بات یہ کہ غال قبیلوں میں حملہ آوروں کی توقیر بہت بڑھ گئی۔ وادی پو کے ان باشندوں کے کئی وفود نے پوری دلچسپی سے رومی پرچموں کو قرطاجنی لشکر کے سامنے سے پسپا ہوتے مشاہدہ کیا چنانچہ اسی رات کوئی ہزار دو ہزار غال جو رومیوں کے ساتھ ہو کر لڑنے آئے تھے، رومی پڑاؤ چھوڑ کر سرداروں کو مار کے قیمتی گھوڑے چرا کر نکل بھاگے اور اپنی جنگی خدمات مہینی بال کو پیش کیں۔ اس نے ان کی زرنفد، شراب اور گوشت سے خاطر مدارات کی مگر تجویز کی کہ بہتر ہے کہ وہ اپنی بستیوں میں جا کر لوگوں کو سمجھائیں کہ وہ بھی رومیوں کو اپنی سرزمین سے دفع کرنے کا حوصلہ کریں اور مال غنیمت اور ناموری پائیں۔ چند زیادہ ذہین غالوں کو اس نے اپنے پاس روکا کہ چپکے سے پھر رومیوں میں جا لیں اور ابھی تک جو غال سپاہی رومی لشکر میں رہ گئے تھے انہیں اپنے ساتھیوں کا حال سنائیں اور رومی لشکر کی خبریں آکر اسے بتا جایا کریں۔ اس طرح اس نے گویا ایک جاسوسی محکمے کی بنیاد قائم کی۔

کینو کے چند روز بعد ہی بو ای قوم کے وکیل اس کے پاس حاضر ہوئے اور خیر مقدم کی لمبی لمبی تقریروں کے ساتھ تین رومی قیدی پیش کیے جو رومہ کے معزز حکام (”پری ٹورین“) طبقے کے تھے۔ مہینی بال نے بڑی تہذیب اور تواضع سے شکریہ ادا کیا لیکن کہا کہ یہ قیدی انہی کے پاس رہیں تو بہتر ہے تاکہ وہ اپنے غال اسیروں کے معاوضے میں انہیں واپس دے سکیں۔ خود اس کے افریقی بھی مذکورہ معرکے میں کچھ قیدی پکڑ کر لائے، وہ زیادہ تر اطالوی حلیف ریاستوں کے سپاہی تھے جو اپنے بالادست رومہ کے لشکر میں بھرتی کر لیے گئے تھے۔ انہیں مہینی بال نے بغیر کسی فدیے کے آزاد کر دیا کہ اپنے اپنے وطن میں واپس جا کر جو کچھ دیکھا تھا لوگوں کو سنائیں (یہ پہلا گروہ

تھا جس نے اہل قرطاجنہ کی غیر متوقع رحم دلی سے آزادی حاصل کی۔ آئندہ اور بہت سے اطالوی قیدیوں کو اسی طرح آزاد کیا گیا اور ان کی جماعت کثیر مختلف اضلاع میں حملہ آوروں کی تعریف اور ان کے مقصد کے تبلیغ کرنے لگی)

قوم غال کے اکابر ابھی اپنے اپنے علاقوں میں تو یہی بحث مباحثہ کرتے رہے کہ ہمیں بال کا نیا طریق جنگ خوفناک رومی جیوش کے مقابلے میں کس حد تک کامیاب ہو گا لیکن یہ اطلاع مستعدی سے اسے ضرور پہنچاتے رہے کہ ایک دوسرا رومی لشکر جنوب سے بڑھ رہا ہے۔ اس پر قرطاجنہ والوں نے کوئی گھبراہٹ نہیں دکھائی۔ اطمینان سے ان کھیتوں سے دانہ چارہ لاتے رہے جنہیں رومہ کے آبادکاروں نے کاشت کیا تھا۔ بہت سے رسد کے ذخیرے بھی رومی چوکیوں سے انہوں نے چھین لیے اور بعض جگہ ان کے محافظوں کو ترغیب دی کہ حفاظت میں اپنی جان دینے کی بجائے غلہ وغیرہ بلا مزاحمت حوالے کر دیں۔

رومہ کا دوسرا قنصل حسب آئین عوامی جماعتوں نے منتخب کیا تھا۔ اس کا نام ٹائی بیرئیس سم پروتیس لوگس اور شہرت وجاہ کا آرزو مند تھا عجب نہیں کہ اپنے عالی خاندان ہم سفیر چب لیس سے احساس کمتری کا بھی شکار ہو کیونکہ چبلیس کے خاندان کو قدیم اعزاز اور کم سے کم ایک جلوس فتح نکلنے کا امتیاز مل چکا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ سم پروتیس خاص قرطاجنہ پر مہم لے جانے پر مامور کیا گیا تھا۔ صقلیہ پہنچ کر اس نے بعض ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں۔ یعنی جزیرہ مالٹا (ملیتہ) پر قابض ہو گیا اور ساحل افریقہ پر چھاپے مارے۔ کامیابی نے اسے نازاں کر دیا، اور حکم ملتے ہی اب کئی کئی منزلیں طے کرتا ہوا وہ شمال کی طرف چلا کہ جس قدر جلد ہو سکے قرطاجنی حملہ آوروں سے جنگ کرے جو اپنے وطن سے اتنی دور نکل آئے تھے۔ وادی پو کی سب سے اگلی چوکیوں میں پلانیتہ کے پڑاؤ پر اسے اپنا ساتھی قنصل چب لیس ملا جس نے زخمی ہو کر وہاں پناہ لی تھی۔ وہ اچھا مستحکم مقام تھا۔ نام کے لفظی معنی ”خوش گوار“ ہیں اگرچہ اس وقت پناہ گزینوں کے ہجوم اور پہلے جیوش کی آشفٹہ خاطری سے جو کینو سے پسا ہو کر یہاں آئے، پڑاؤ کی فضا کچھ خوش گوار نہیں رہی تھی۔ دوسرے زخمی

جب لئیس صاحب فراش اور میدان جنگ میں نکلنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ حقیقت میں مریض نظر آتا تھا۔ بار بار بال اڑی ہوئی چند یا پر ہاتھ پھیرتا اور کتا رہتا کہ ہماری یہ فوجیں آزمودہ کار نہیں ہیں۔ یہ ابھی سرحد کے مورچہ بند مقامات کی صرف حفاظت کرتی رہیں تو بہتر ہے تاآنکہ سال نو کی بھرتی سے تازہ ملک ہمیں مل جائے۔ غل قبائل کی طرف سے بھی اسے بہت ناگواری تھی۔ اصل بات جو اندر ہی اندر اس کے دل میں غلش کر رہی تھی جب لئیس نے بتانی مناسب نہ سمجھی۔ وہ یہ کہ کیمینو کی جھڑپ میں اسے گھوڑے سے پورے جسم کو دھکا دیکر گرایا گیا تھا۔ اور اس نے گرتے گرتے جیسے عجیب شہ سواروں کو زرعہ کرتے دیکھا ایسے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

عالی سم پر وینس کو بیمار قنصل کی دلیلیں سن کر بڑی جھجھکھاٹ ہوئی کہنے لگا کیسے غضب کی بات ہے کہ جمہوریہ عالیہ رومہ کے دونوں قنصل جمع ہیں۔ جیوش کے جنگ آزما 14 ہزار اور لاطینی کھلانے والے امدادی سپاہی 22 ہزار۔ مزید برآں شمالی سرحد کے سارے محافظ دستے حاضر ہیں۔ پھر بھی وہ قلعہ بند بیٹھے ہیں جب کہ گردوپیش کے کھیتوں میں افریقی سوار بے غل و غش گھوڑے چراتے پھراتے ہیں۔ یہ سب کچھ خاص اطالیہ میں ہو رہا ہے سم پروتیس بگڑ بگڑ کر کہتا تھا کہ یہ طرز عمل رومہ کی روایات کے سراسر خلاف ہے۔

اس نے منہ سے تو نہیں کہا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ عدول شتوی (دسمبر) کے نئے انتخاب سر پر تھے جب کہ دوسرے قنصل ان کی جگہ لینے کو چنے جاتے۔

سوائے اس صورت کے کہ موجودہ قنصلوں میں سے کوئی ساقیتی حملہ آوروں پر فیصلہ کن فتح حاصل کر لیتا۔ اور اس طرح سوچتے سوچتے اسے یہ بھی یقین ہوا کہ اس وقت خاندانی قنصل تو بیمار پڑا ہے۔ لہذا فوج کی سپہ سالاری تنہا اس کے ہاتھ میں اور فتح بھی اسی کے نصیب میں آئے گی۔ لہذا جب لئیس کا صحت یاب ہونے اور انتخابات سے پیشتر ہی اگر وہ میدان مارے تو گو اسے انتخاب کے وقت اصالتاً ”رومہ کے ”کولینا پھانک“ پر تنہا جانا پڑے گا تاہم قرطاجنی مہینی بال پر اس کی فتح کی خبریں آگے آگے پہنچ جائیں گی اور عوامی مجالس یقیناً بالاتفاق اسے دوبارہ منتخب کرنے پر زور دیں گی۔ بخلاف

اس کے اگر وہ بھی جاڑوں بھر اپنے مورچوں کے پیچھے دبا ہوا بیٹھا رہا تو اس قابل شرم طرز عمل کے بعد ہرگز دوبارہ منتخب نہ ہو سکے گا۔

اب اتنا تو ہوا کہ ساری مجتمعہ فوج پلاستیہ کے پرہجوم پڑاؤ سے آگے بڑھائی گئی اور تھوڑی دور چل کر تربیہ ندی کے کنارے اس نے خندقیں کھود کر ایک آرام دہ لشکر گاہ تیار کر لی۔ یہاں جب لیس سے، جو ایک پیدائشی سپاہی مگر زخم کی وجہ سے ابھی کمزور تھا، سم پروتیس سپہ سالاری لینے کا موقع ڈھونڈنے لگا حالانکہ اسے جنگ کی چنداں واقفیت یا مہارت بھی نہ تھی۔

اتفاق سے یہ موقع جلد ہی ہاتھ آگیا۔ رومی طلائے کے ایک دستے کی نوادیہ والوں سے جو قریب ہی گھوڑے چرا رہے تھے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اپنے ہتھیار بند رسالے کی پناہ لینے پیچھے ہٹے۔ رومی سوار طلائے کی مدد کے لیے باہر نکلے، ساتھ ہی پروتیس دو جیش لے کر لشکر گاہ سے باہر نکل آیا۔ لیکن قرطاجنی ندی کے سیلابی قطعات کے پار تک ہٹ گئے تھے لہذا لڑائی کی نوبت نہ آئی اور سم پروتیس کو جو لڑائی کے لیے نکلا تھا، یقین ہو گیا کہ چلاک ”عدول شتوی“ بارش اور زمہری موسم کے ساتھ آیا۔ رومی لشکر گاہ کی گزر گاہوں میں کیچڑ ہی کیچڑ پھیل گئی۔ قنصل مذکور جنمھلا رہا تھا کہ موسم جنگ کا موقع ہی نہ آنے دے گا کہ اتنے میں رات کے پچھلے حصے میں اس کے ماتحت سرداروں نے اسے سوتے سے جگایا اور یہ خوشخبری سنائی کہ افریقی سوار لشکر گاہ کے ایک دروازے تک ترک تاز کر رہے ہیں۔ سم پروتیس جنگ کا موقع ملنے کی خوشی میں اور شاید اس لیے کہ سوتے سے ایکا اکی جگایا گیا تھا، یہ سوچنا بھی بھول گیا کہ دشمن کے ایسے ناوقت آنے کا سب کیا ہو سکتا ہے؟ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ بازوؤں کے رسالے کو سوار ہو کر فوراً باہر نکلنے اور تمام جیوش کے سپاہیوں کو ہتھیار سنبھال کر لشکر گاہ کی سڑکوں پر صفیں باندھنے کا حکم دیا اور خود چلا کہ پرچموں کے ٹھیک سے ٹھیک اٹھائے جانے کا معائنہ کرے۔

اس کی خس پوش قیام گاہ کے باہر مشطوں کی روشنی میں برف کی چھال چمک رہی تھی۔

برف باری میں جنگ

رومی مصنف ایک عرصہ بعد لکھتے ہیں کہ "بہنی بال" کو "بکھی اطمینان نہیں ہوا کہ میں نے اپنے آدمیوں کو تیار کرنے کا پورا اہتمام کر لیا ہے۔"

مگر تربیہ ندی کے کنارے جاڑے کی اس رات کے معرکے کا ہم اسے پہلے سے اہتمام کرتا دیکھتے ہیں۔ اسے رومی لشکر گاہ کی خبریں جاسوسوں سے مل رہی تھیں غالباً "سم پروینس کی قابلیت کا بھی اس نے کچھ انداز لگا لیا تھا۔ معرکہ پڑنے سے یقیناً کئی روز قبل ندی کے اپنی طرف کے کناروں کا اس نے تفصیلی معائنہ کیا۔ سم پروینس کو اس کنارے کی بالکل واقفیت نہ تھی جس کے ایک جانب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک جاتا تھا۔ ان پر جھاڑیاں تھیں اور کہیں وسط میں ایک نالہ یا گھاٹی چھپی ہوئی تھی۔ اس معائنے میں ایک نوجوان سردار ماگو بہنی بال کے ہم رکاب تھا۔ اسے گھاٹی دکھا کر اس نے کہا کہ دس آدمی انتخاب کرو جو ہر طرح کی سختی جھیل سکتے ہوں۔ پھر وہ اپنے مختلف گروہوں سے سو سو جوان اسی طرح کے قابل اعتماد چن لیں۔ یہ چیدہ ایک ہزار ماگو کی قیادت میں گھاٹی میں متعین کیے جائیں گے جسے ماگو نے تسلیم کیا کہ گھات لگانے کی بہت اچھی جگہ ہے۔

بہنی بال کی عادت تھی کہ کسی سخت آزمائش کے وقت ہنسی مذاق کیا کرتا تھا کتنے لگا "ہاں" بڑی وجہ یہ کہ یہاں کوئی تمہیں جھانکنے نہیں آئے گا۔" پھر اس نے نوجوان سردار کو خاص خاص ہدایات دیں۔

گھاٹی سے قرطاجنی لشکر گاہ تک کیچڑ بھرا میدان ڈھال کے اوپر جا کر خشک پڑا تھا۔ یہاں اس نے کم گہرائی کی کھائی کھدوائی اور اس کے اوپر کنارے پر اچھی مضبوط منڈیر بنوائی جو دور سے نظر نہ آتی تھی۔ بہنی بال نے بچپن سے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا تھا کہ "زمین کو ایسا بنا دو کہ تمہاری طرف سے لڑے۔" پہلے یہ بات پر ہوس (وائی اپی رس) کہتا تھا لیکن ہلکے نے فی الواقع اریکس کے پہاڑ کو حصین بنا کر دکھا دیا تھا۔ مگر یہاں بھیگے میدان اور بارش سے بہتی ہوئی ندی کی دھاروں کے سوا کوئی کار آمد چیز

نہیں نظر آتی تھی۔ جنگ سے ماقبل رات کو وہ اپنے مخلوط لشکر کے مختلف سرداروں سے باتیں کرتا۔ ان کی سنتا، کبھی کبھی اپنی رائے سناتا مگر جس بات کی دھن لگی تھی، اس میں فرق نہ آنے دیتا تھا۔

اس رات پانچ سو نو مدیہ کے سوار بندی کی طرف اور ماگو اپنے چیدہ ایک ہزار جوانوں کے ساتھ گھائی کو روانہ ہو چکا تھا۔ یعنی بال نے ماتحت سرداروں سے کہا ”کل اطالوی شہروں کے راستے کھل جائیں گے۔ کیا تم واقعی جانتے ہو کہ وہ دولت و مال سے لبریز ہیں۔ یہاں سب خیالی کہانیاں ہیں؟“

سن رسیدہ سرداروں نے کہا کہ ہم اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ یعنی بال نے کہا ”تو پھر اپنے جوانوں کو بھی یہی سمجھا دو۔“

وہ اس کا مطلب سمجھ گئے کہ یعنی بال کا جو خیال بھی، وہ چاہتا ہے کہ اس کے سپاہی جنگ سے انعام پانے کا یقین کر لیں۔ اس رات اہل کر کے بیٹے نے بدترین موسم میں جنگ کے دیوتا کے جیوش (یعنی سپاہ رومہ) سے لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جیوش جس کی صفیں حکم کے ساتھ کل کے پیوں کی طرح حرکت کرنے لگتی تھیں..... میدان جنگ کو اس نے ان کے لیے خاصا دشوار اور اپنی فوج کے لیے مفید طلب بنا لیا تھا۔ الاؤ جلا کر گرمی میں ہتھیار باندھنے سے پہلے قرطاجنبہ والوں نے سارے بدن پر ٹھہرے محفوظ رہنے کے لئے تیل ملا۔ تیل کے بڑے بڑے مرتبان اس غرض کے لیے رکھے تھے۔ پھر پچھلے پہر ہی پیالیوں میں گوشت کا شوربا اور ابلے جو پیٹ بھر کے کھائے اور سحر کی پہلی روشنی کے ساتھ فلاخن انداز میدان میں نکل آئے۔ ابیری اور لبیائی پیادے سر سے پاؤں تک اوپچی بنے کھدی ہوئی کھائی تک بڑھے اور وہاں بکری کے اون کے لبادے اوڑھ لیے۔ چمڑے کی پوش چڑھے ہاتھیوں پر مہاوت اور سانگ پھینکنے والے سوار تھے۔ وہ سونڈیں ہلاتے، جھومتے جھامتے مسلح رسالوں کے بازوؤں پر آگئے۔ قرطاجنی گھوڑے ان عظیم الجثہ جانوروں کی بو کے عادی تھے، وہ ان کے آنے سے نہیں بدکے۔

اس کے بعد وہ واقعہ ہوا جسے جنگ تربیہ موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ

اس کا فیصلہ بہت کچھ ان تیاریوں سے یا تیاریاں نہ ہونے سے طلوع آفتاب سے پہلے ہی ہو چکا تھا..... رومن جیوش جو نومیہ کے سبک پا چھاپے مارنے والوں سے لڑنے نکلے انہیں کئی میل تک اندھیرے میں تعاقب کرنا پڑا۔ سرکیوں کی جھونپڑیوں سے سخت سردی میں مارا مار نکل کر آئے تو ناشتہ کرنے کی بھی مہلت انہیں نہیں ملی۔ بھوکے آرہے تھے اور فقط معمولی واوی میں انہیں ندی کی دھاریں پایاب عبوری کرنی پڑیں تو بعض جگہ بغل بغل تک پانی تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہزاری سرداروں نے صفیں درست کرنے کی غرض سے توقف کیا تو سپاہی بج بستی پانی سے بھیگ کر اکڑے جاتے تھے۔ ادھر ہر طرف سے دشمن کی ٹولیاں چھاپے مار مار کر پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔ اور برف اور اولے کی چھاؤں سے جھٹ پٹے میں راستہ نہ سوجھتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک میل کے قریب اور بڑھے تو بالاخر وہ میدان آگیا جہاں افریقی سپاہ ایک منڈیر کی پناہ لیے ان کے انتظار میں تھی۔ منڈیر کے پیچھے سے ہلیاریوں نے زنانے کے ساتھ سنگ باری کی معلوم نہیں کہ جواب میں یہ رومی جیوش کیا کرے کیونکہ ان کے اقدام سے پہلے ہی بازوؤں پر شکست کا آغاز ہو گیا جہاں بڑھتے ہاتھیوں کو دیکھتے ہی بہت سے رومی گھوڑے بھڑکے اور بھاگے۔ ساتھ ہی اسپین اور افریقہ کے رسالوں نے تیز و تند حملہ کیا اور انہیں پیادہ جیوش کی صفوں میں دھکیل دیا۔ یہ صفیں اس طرح مڑتی چلی گئیں جیسے مٹھی کی انگلیاں ٹوٹی نہیں، مڑ جاتی ہیں۔

رومی شمشیر زنوں کو دن نکلنے نکلنے بھوک اور کچڑ میں پاؤں جما کر لڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ اتنے میں سپہ سالار کے ترم (یا نرسکھے) کی آواز ہی رک گئی جس سے فوج کو احکام دیئے جاتے تھے اور جیوش نے دیکھا کہ ان کو تین طرف دشمن سے سامنا کرنا ہے۔ اسی لمحے ماگو کے ایک ہزار چیدہ سپاہی گھاٹی سے نکلے اور عقب پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹ پڑے۔

ہر دستے کے عمال (مڑی یون) اور نائب سالار پریشان ہو کر چلاتے پھرتے تھے کہ قطاریں بنا کر دشمن کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کی جائے..... یہاں پہنچ کر (رومی) اطلاعات خاموش ہو گئی ہیں۔ بظاہر دس ہزار رومی سپاہی قطاروں میں واپس اپنے لشکر گاہ

تک پہنچ گئے۔ مگر تفصل سم پرونیس کا آدھا لشکر یا اس سے زیادہ برف باری میں بھاگ کر چھپا، یا قید یا ہلاک ہو گیا تھا۔ اطالوی حلیفوں کے قید ہونے والوں کو ہمینی بال نے چھوڑ دیا کہ اپنے گھروں کو جلیئے۔ جیوش کے سپاہی یعنی رومہ کے شہری قیدیوں کو فدیے کے لئے رکھ لیا۔

سم پرونیس نے رومہ کی مجلس اعیان کو جنگ کی بہت مبہم، مشکوک سی کیفیت لکھ کر بھیجی جس میں مختصر طور پر صرف یہ لکھا تھا کہ اہل قرطاجنہ سے جنگ شروع کی گئی تھی لیکن موہم کی ناساز گاری فتح میں مانع آئی۔ خود وہ باقی ماندہ سپاہ کو لے کر تربیہ ندی کے بائیں کنارے سے ہٹا اور پلاستیہ کے قلعہ بند میں آگیا تھا، جہاں اب لوگوں کا پہلا سا ہجوم نہیں تھا۔ پھر جنوری کے مہینے میں (جس کا رئیس رومی عقیدے کے مطابق، جانوس دیوتا ہوتا تھا) ایسے فرض منصبی کے طور پر رومہ آنا پڑا کہ نئے انتخابات کا اتمام کرے۔ اسے دوبارہ منتخب نہیں کیا گیا اور طرفہ تربیہ کہ معرکہ تربیہ کا واحد اعزاز اس کے ہم صفیر زخمی جب یس کو نلیس کے حصے میں آیا ہے۔ اس نے لڑائی کرنے سے تائیداً روکا تھا۔ صاحب فراش ہونے کی وجہ سے جب یس اس کمر شکن شکست کے وقت میدان میں حاضر بھی نہ تھا۔ اس نے شفا یاب ہونے کے بعد اجازت مانگی کہ اپنی سابقہ اسپین کی مہم کی قیادت کرنے بھیجا جائے۔ اس لیے نہیں کہ ”پاگل قرطاجنی“ سے تیسری دفعہ سامنا کرنے سے بچنا چاہتا تھا بلکہ اس لیے کہ سیدھی سمجھ کا جب لئس دل میں یقین رکھتا تھا کہ اسپین کی فتح سے جمہوریہ رومہ کا عقدہ حل ہو جائے گا۔ اس کی برادری کے اعیان مجلس بھی متفق تھے کہ کامیابی اسی ملک کے ہاتھ آئے گی جہاں اب ”پاگل قرطاجنی“ ہمینی بال کو وہ اسی نام سے یاد کرنے لگے تھے..... خود نہیں پہنچ سکتا۔

رومہ میں نیال سال بڑی بدشگونیوں کے ساتھ شروع ہوا۔ کاہنوں کو فوج کے سپاہی ہو کر پلاستیہ میں پناہ لینے کی ساری تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ انہوں نے جدی دیوتاؤں کی صریح ناراضی کی خبریں سنائیں۔ موہوم جہاز آسمان سے گزرتے نظر آئے۔ امید (دیوی) کے مندر پر بجلی گری۔ مرنج دیوتا کی برہمچوں میں آگ لگ گئی۔ مقدس

ندیوں میں خون بہتا دیکھا گیا..... شر کو پاک کرنے کی غرض سے 24 سیر سونے کی بجلی جو پیٹر دیوتا پر چڑھائی گئی۔ چھوٹے دیوی دیوتاؤں کے بتوں کے سامنے دسترخوان چنا گیا۔ مذہبی نذر و نیاز کی رسوم ادا ہو جانے کے بعد سب شہری دوبارہ غور و بحث کئے بیٹھے کہ یہ ہمینی بال کس قسم کا آدمی ہے اور آئندہ کیا کارروائی کے گا۔

وادئ پو میں سرما گزاری

وسط سرما کے دو مہینے قرطاجنہ والوں نے مکانوں میں چھتوں کے نیچے آرام کیا۔ پائی ریں کے دامن سے چلنے کے بعد یہ پہلی تعطیل تھی جس سے وہ لطف اندوز ہوئے میدان جنگ میں جو مال غنیمت، زر نقد، اسلحہ ساز و سامان ہاتھ آیا تھا، اسے تقسیم کیا گیا۔ ایک عرصے کے بعد رومی مصنفوں کو یہ نکتہ سوچا کہ لکھتے ہیں:

”ہمینی بال کبھی مطمئن نہیں ہوا کہ اپنے سپاہیوں کو جانبازی کا پورا پورا انعام دینے کا انتظام کر سکا ہے۔“ پورا پورا لائق لحاظ ہے جس میں انعام کے وعدے سے بھی کچھ زیادہ معنی نکلتے ہیں۔ ساری فوج کو مساوی حقوق اور امتیازات پہلے ہی مل چکے تھے۔ لہذا کا کوئی حمال یا سقہ تک جس نے افریقہ میں اپنے قرطاجنی آقاؤں سے نفرت کرنی سیکھی ہو گی، اب آزاد تھا اور کسی قرطاجنی داروغہ کو دیکھ کر سلامتی دینے کا پابند نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا کام بدستور کرتا رہا لیکن اب اس کی حیثیت دوسری ہو گئی تھی۔ قلعہ گیری سوار جنہیں وطن کے پہاڑ نہیں بھولے تھے، اطالیہ میں بڑے بڑے کھیتوں کے مالک بن گئے اور انہیں لگان پر اٹھا سکتے یا بیچ کر چاندی وصول کر سکتے تھے۔ یہ پہاڑی گنوار خاص کاروباری اور اچھے سوداگروں کی سی قسم کے لوگ ہو گئے تھے۔ اگر عسکری جذبہ یگانگی (Esprit de Corps) کی اصطلاح کسی زمانے میں ایجاد ہوئی تو شاید یہی وقت ہو گا۔ آگے چل کر ذی بصیرت رومی مصنف قرطاجنی لشکر کی یہ صفت بیان کرتے ہیں کہ ”یہ سپاہی اپنے سپہ سالار پر اور دوسری طرف وہ سپہ سالار ان سپاہیوں پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔“

ہمینی بال نے تربیہ میں اپنی فوج سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جسے محال سمجھا جائے۔

اس نے میدان جنگ سے بہترین طریقے پر فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے پیادوں کو صرف رومی جیوش کی اگلی صفیں آگے بڑھنے سے روکنے کا کام سپرد کیا۔ پھر اپنے سواروں سے جو پوری فوج کا ایک تہائی حصہ اور دشمن کے رسالے سے قریب رہ گئے تھے، حملہ کرایا۔ جنگی مہارت میں بھی وہ رومی سواروں پر فوقیت رکھتے تھے اور جب وہ راستے سے مار کر ہٹا دیئے گئے اور افریقی سوار گروہ درگروہ پیادہ جیوش کے بازوؤں پر گرے تو رومی اپنی پیوستہ صفوں کی مقررہ ترتیب قائم نہ رکھ سکے۔ اس نرنے میں آنے کے باوجود جیوش کے سپاہی آسانی سے مرنے والے نہ تھے اور ان کا بڑا حصہ اپنے سب عقبابی پرچم بچا کر لڑتا ہوا نرنے سے نکلا اور اپنی خندق بند لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ یعنی بال ایسا نا سمجھ نہ تھا کہ ان محفوظ مورچوں میں ان پر حملہ کرتا۔ رومی وقائع نویسوں کے الفاظ میں ”جب تک جیتنے کے یقینی مواقع نہ ہوں، وہ جنگ کا خطرہ مول نہیں لیتا تھا۔“

بہر حال تربیہ کے معرکے سے اسے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ”اے روے الپس“ کے غل قبائل اس کے پختہ حلیف بن گئے۔ وادی پو کے تمام اقطاع سے اور مشرق میں وینیتی کی دلدلوں تک سے وہ جوق در جوق اس کے لشکر میں آئے۔ مغرب سے لگوریہ کے وحشی قبائل کے سردار حاضر ہوئے۔ ان کے مرتبے اور سابقہ کارناموں کے مطابق پورے اہتمام سے ان کی سکیم و تواضع کی گئی اور جو ایک دوسرے کے مخالف تھے، انہیں الگ الگ جگہ دی گئی۔ وہ لوگ اس کے دو ماہہ قیام کے اکثر ایام میں اس کی فتح کی مدح میں تقریریں کرتے رہے۔ سم پروینس کے عصا بردار بھاگتے میں ایک گٹھا چھوڑ گئے تھے جس میں اعلیٰ حکام کے ماہی مراتب کے برنجی عصا، اور تبر بندھے ہوئے تھے۔ رومی اقتدار کی یہ نشانیاں خاص طور پر تمام قبائلی کے سرداروں نے معائنہ کیں۔ انہیں شیر کی اس کھال پر ڈال دیا گیا تھا جو چرم موزوں میں ہمینی بال کے پاؤں کے نیچے دبی تھی۔

قبائل کے رئیس زرکار چمکتے دکتے لباس میں آکر اس سے ملتے تو وہ رومہ کے اس نشان عظمت کو ضرور اس کے زیر قدم پڑا دیکھتے تھے۔ ہوائی قوم کے خود پسند انسبری رئیسوں تک نے اقبال مند امیر کے سامنے حلف اطاعت اٹھایا اور قول دیا کہ ان کے

شمشیر زن جہاں وہ جائے گا اس کے ساتھ جائیں گے۔

یہی بال نے ایک ایک کے دل نشین کیا کہ گو وہ ان کی بستیاں اور زمینیں محفوظ رکھنے کا عہد کرتا ہے لیکن ان کا اتحاد اس کی ذات کے ساتھ نہیں، دولت قرطاجنہ کے ساتھ ہوا ہے اور یہ حکومت یا وہ خود ان کی کسی زمین کو لینے کی کوئی ہوس نہیں رکھتے۔ اس کے مقابلے میں، یہی بال نے لاطینی حروف میں ایک پتھر کا کتبہ انہیں دکھایا جسے بعض غال رئیس، سچے کر کے پڑھ سکتے تھے۔ اس پتھر پر یہ سرکاری قانون کندہ کیا ہوا تھا کہ وادی پو کے غال علاقے پر ”اتحادیوں کا قانون“ عائد نہیں ہو گا بلکہ ”زیر نگیں ولایت“ کے قانون (Lex Provinciaes) کا عمل ہو گا جس کا مطلب یہ تھا کہ غال باہمی دفاع کے لیے رومہ کے اتحادی نہیں بنائے جائیں گے بلکہ کورسکا وغیرہ کی طرح وہ اس کے ایک صوبے کی ماتحت رعایا سمجھے جائیں گے۔ ایسے صوبے میں دولت رومہ زمین کی مالک ہو جاتی تھی اور صوبے کے باشندے جنگی قانون کے تحت اس کے زیر حکم آجاتے تھے۔

یہی بال نے ان سے کہا کہ اب تک آپ ٹائی برندی کے لاطینی قبائل کی اپنے علاقے میں دراز دستی کا مقابلہ کرتے رہے، اب وقت آگیا ہے کہ آپ ان کی کشور ستانی کا اور اپنے مغلوب ہونے کے سب قوانین کا خاتمہ کریں۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ وہ رومیوں کی قوت جنگ کو توڑنے میں مدد دیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو رومہ ویسی ہی ایک شہری ریاست رہ جائے گی جیسی آج سے تین صدی پہلے اس وقت تھی جب کہ غال قوم وادی پو میں آن کر آباد ہوئی تھی۔

غال سرداروں نے جوش و خروش سے آمنا صدقہا کہا اور توثیق کی کہ وہ حلف اٹھا کر اس کے حلیف ہوئے ہیں اور جس طرح ان کے مورث اور بطل جلیل۔ برنوس نے قوم کے زمانہ عظمت و اقبال میں رومہ پر چڑھائی کی تھی، وہ بھی اس پر فوج کشی کریں گے۔

بوای قوم کے بھانوں نے جوش انگیز بزور شمشیر فتح کے گیت گائے نوجوان پروہت الاؤ کے گرد گھوم گھوم کر نر سٹکھے بجانے لگے جن کے سرے پر سور کی برنجی تھوڑیاں

مارا گیا تو اس نے عین وسط سرما میں ایک سبک پا جمعیت سے یکایک ان پر حملہ کر دیا۔ ان کا سرمائی پڑاؤ (بہ تصحیح مترجم) وادی حوش میں تھا جہاں سے اتر اتر کے چھاپے مارتے اور اپنے آپ کو خوب محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ باہر لکھتا ہے کہ ”اس جاڑے میں برف اتنی پڑی کہ گھوڑوں کے خوگیر تک آتی تھی۔ طلائیہ کے سوار برف کی زیادتی کے باعث رات بھر گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے (باہر نے پہرہ داروں کے لئے سخت قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی رات کو سو جائے تو اس کے نتھنے چھید دیئے جاتے تھے) حوش کی وادی نئی طرح کی ہے۔ تقریباً“ ایک میل لمبا درہ طے کرنا پڑتا ہے جس کے اوپر اونچی اونچی چٹانیں اور نیچے کے رخ پچاس ساٹھ گز (بہ تصحیح مترجم) گہرائی ہے۔ صرف ایک سوار کے چلنے کا راستہ ہے۔ درے سے گزر کر ہم عصر کی نماز کے وقت تک چلتے رہے اور پڑاؤ کرنے تک کوئی شخص ہمیں راستے میں نہیں ملا۔ ہزارہ کا ایک فریہ لدو اونٹ ہاتھ آیا، اسے لاکر ذبح کیا اور کباب لگائے یہ اتنا بامزہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس میں اور بکری کے کباب میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا، دوسری صبح سوار ہو کر ہزارہ کے قشلاق کی طرف چلے۔ ایک گھڑی گزرنے پر ہراول کا ایک سوار خبر لایا کہ ہزارہ نے ندی (نکاب) کے گھاٹ پر تنگ جگہ میں ٹھنیاں گاڑ کر راستہ روک دیا ہے اور لڑ کر ہمارے آدمیوں کو گزرنے نہیں دیتے۔ برف اتنی گہری پڑی تھی کہ بٹیا کے سوار راستہ چلنا ممکن نہ تھا۔ ندی کے دونوں کنارے بچ بستہ ہو رہے تھے اور اسے وہیں سے عبور کیا جا سکتا تھا جہاں سے بٹیا اسے پار کرتی تھی۔ یہ سن کر میں نے تیزی سے قدم بدھایا۔ دوسرے کنارے کی ڈھلان سے درختوں کی باڑ کے پیچھے سے ہزارہ پیادوں اور سواروں نے تیر برسائے۔ محمد علی نقیب میرا نوجوان سردار جسے لیاقت کی وجہ سے میں نے ترقی دی، باڑ پر بڑھا چلا گیا۔ زرہ پہنے ہوئے نہ تھا۔ اس کے پیٹ میں تیر لگا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ ہم میں سے اکثر جلدی میں بغیر زرہ پہنے آگئے تھے۔ تیر سروں پر سے سنناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہر بار (بہ تصحیح مترجم) یوسف بیگ گھبراتا اور چلا کر مجھ سے کہتا تھا کہ یوں برہنہ تیروں میں کہاں گھسے جاتے ہو؟ میں نے کہا خود نہ کرو، ایسے بہت تیر میرے سر پر سے گزر چکے ہیں۔“

”پھر قاسم بیگ نے جس کے سوار زرہ پوش تھے، دائیں طرف ندی اترنے کی جگہ تلاش کر لی اور پار ہوتے ہی حملہ کیا تو ہزارہ قائم نہ رہ سکے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمارے کچھ آدمیوں نے تیز تعاقب کیا۔ اور ان میں گھس کر کئی کو گھوڑے سے گرایا یا قتل کیا۔

اس کار نمایاں کے صلے میں قاسم بیک کو بخش کا علاقہ دیا گیا..... نقیب (قوریگی) کا منصب قلی بابا کو عنایت ہوا جس نے بڑھ کر جنگ کی تھی۔ سلطان قلی چناق تعاقب میں گیا تھا مگر اونچی برف کی پھسلن کے باعث بٹیا پر چلنا ممکن تھا۔ میں بھی اوروں کے ساتھ چلا۔ ہزارہ کے قشلاق (سمرائی پڑاؤ) کے قریب بھیڑ بکری اور گھوڑوں کے گلے ملے۔ میں نے چار پانچ سو بکریاں اور کوئی بیس گھوڑے گھیرے۔ دو تین ذاتی ملازم بھی میرے ہمراہ تھے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی تاخت میں میں نے شرکت کی۔ ہمارے لشکری صد ہا جانور پکڑ لائے۔ ہزار ہا عورتیں بچے برف پوش ڈھلانوں پر پیادہ پا اوپر چڑھے اور وہیں ٹھہر گئے۔ ہم نے پیچھا کرنے میں تساہل کیا اور دن چھپتا دیکھ کر واپس ہوئے اور انہی خالی جھونپڑیوں میں رات بسر کرنے کے لئے گھوڑوں سے اتر پڑے واقعی ہمارے چار طف برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔“

واپس ہوتے ہوئے لشکر والوں نے ان لوگوں کا سراغ لگا لیا جنہوں نے پہلے سردار (قوریگی) کو مارا تھا۔ یہ ایک کھو میں گھس رہے تھے۔ پتا چل گیا تو دھواں کر کے انہیں باہر نکالا اور قتل کرا دیا۔

ڈنڈے نہ ہوں تو پتھر سہی

ترکمان ہزارہ کو سخت سزا دینے کا مقصد پورا ہو گیا۔ ان پر تاخت کی کہانی پہاڑی پہاڑی ہر جگہ شائع ہوئی۔ آزاد قبائل، مغل، ترک یا افغان سب سمجھ گئے کہ شیر ڈرنے کے قابل فرماں روا ہے۔ بایں ہمہ خود باہر اتنے کثیر مواشی مل جانے کے باوجود اس تاخت سے کچھ بہت مطمئن نہ تھا۔ اس طرح حکومت کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ کسی شیبانی کے برابر بھی کامیاب نہیں ہوا۔

سردی کی طویل راتوں میں وہ اپنے نئے ملک کے حالات روزنامے میں لکھتا رہا۔ موسم کی تعریفیں تو بہت کی تھیں لیکن یہ تحریریں پوستان کے لبادوں میں لپٹ کر ہوا سے تھماتے تیل کے چراغ کی روشنی میں لکھنی ہوتی تھیں۔ اسی تحریر کے وقت اسے غزنین یاد آتا رہا۔ جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے جمائگیر کی جاگیر میں دیا تھا بلکہ وہاں کے اور حالات جیسا کہ لکھتا ہے :

”غزنین بھی کھیتی کرنا بہت محنت کا کام ہے۔ کیونکہ بہتر سے بہتر زمین میں بھی ہر سال نئی مٹی ڈالنی پڑتی ہے..... گردونواح میں ہزارہ اور افغان آباد ہیں۔ کابل کے مقابلے میں

یہاں کی آمدنی کم ہے۔ لوگ صحیح العقیدہ خفی مذہب کے ہیں اور بہت سے تین تین مہینے روزے رکھتے ہیں۔ ان کی عقیقہ عورتیں پوری پردہ نشین ہوتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مشہور لوگوں میں ملا عبدالرحمن ہوئے ہیں جو علم و فضل کے باوصف ہمیشہ طالب العلم رہے۔" سلاطین غزنوی کا بابر بار بار ذکر کرتا ہے۔ "اسی شہر میں سلطان محمود کا مقبرہ ہے جسے روضہ کہتے ہیں اور جس کے باغ کے انگوں سب جگہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ سلطان کے دوسرے جانشینوں کی بھی یہاں قبریں ہیں۔ (بچ میں گزشتہ سال کی وادی سندھ میں اپنی تاخت اور آب ساکن کے راستے واپسی کا ذکر کر کے وہ پھر غزنین کی شوکت رفتہ کو یاد کرتا ہے)۔ اب یہ بہت ادنیٰ شہر رہ گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ہندوستان اور خراسان جیسے ملکوں پر قبضہ ہونے کے باوجود ان بادشاہوں نے اسے پائے تخت منتخب کیا..... سلطان محمود غازی کے وقت میں (تصحیح مترجم) یہاں پانی کے تین چار بند تھے۔ سب سے بڑا جو سلطان نے بنوایا، چالیس پچاس گز کی بلندی پر تقریباً "تین سو گز عریض تھا۔ ضرورت کے لائق یہاں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ اب ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔"

جہاں غزنین میں آب رسانی کا انتظام درست کرنے کی فکر تھی، وہاں سلطان کے عظیم کاموں کو بھی برابر یاد کرتا تھا جو ملت اسلام کا آخری سچا مسلمان بادشاہ گزرا ہے کہ دنیا کی اس پوری اقلیم پر فرماں روائی کی..... پھر وہ شاہ بزرگ ملک شاہ جس کی عمر خام جیسے فاضل حیات داں نے ملازمت کی.... اور سلطان سنجر، ترکوں کا بہترین فرماں روا، دین دار متقی۔ ایک طرف فارسی بولنے والوں کی بستیوں کا محافظ اور دوسری طرف وحشی خانہ بدوشوں کے ریلے روکنے والا۔ یونس خاں والنی تاشقند اور بہت سے رشتہ دار چھوٹے چھوٹے رئیسوں کے خاتے سے پہلے سنجر ہی ان بزرگ سلاطین کا آخری وارث تھا۔ بعد میں تو "ہماری دنیا پارہ پارہ ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن غارت گر ہو گئے اور مزروعہ زمینوں پر تو بھی گدھوں کی طرح گرتے تھے۔" اس سلسلے میں بابر کا اپنا تصور یہی رہا کہ ملت اسلامی کا واحد بادشاہ ہونا چاہئے جو مساجد و مدارس اور مشتاقان علم کا سرپرست ہو۔ اس کا لقب اہمیت نہیں رکھتا۔ قدیم زمانے میں ایسے صاحب قوت شخص کو بادشاہ یا شہنشاہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بابر قدحار جاتے میں بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی پورا تندرست نہ ہوا تھا کہ کابل میں سخت زلزلہ آیا۔ اس آفت ارضی کو اس نے کوئی بدشگونی نہیں سمجھا بلکہ بڑی دلچسپی سے کیفیت

دیکھی اور قلم بند کی ہے :

”یہ ایسا زلزلہ تھا کہ قلعوں کی بہت سی فصیلیں پہاڑوں کی چوٹیاں، شہروں اور دیہات بھی کے بہت سے مکانات زور سے ہلے اور زمین پر آ رہے۔ مکانوں اور بیوت کے منہدم ہونے سے بہت لوگ دب کر مر گئے۔ ہمدان (ترک فارسی : لمغان) کے سارے گھر مسمار اور ستر اسی بھلے آدمی نیچے دب گئے۔ اس کے اور بک توت کے درمیان ایک قطعہ زمین تیر کے پر تاب کے مساوی چوڑا، اکھڑ کر اس قدر دور جا پڑا۔ چشمے پھٹ گئے۔ جگہ جگہ کوئیں بن گئے۔ استرغ سے میدان تک ۳۰، ۴۰ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ زمین جا بہ جا ہتھی کے برابر اونچی اور کہیں کہیں اسی قدر نیچی دھنس گئی، جگہ جگہ سے ایسی پھٹ گئی (بہ تصحیح) کہ اس میں کوئی نہ جا سکتا تھا۔ زلزلے کے وقت پہاڑ کی چوٹیوں پر گرد کا بادل چھا گیا تھا۔ نور اللہ ظہورچی میرے پاس بیٹھا ساز بجا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ساز تھے، ایسا بے قابو ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ جمائگیر مرزا الغ بیگ کے بنائے ہوئے ایک مکان میں اوپر جھروکے پر تھا زمین نے ہلنا شروع کیا تو وہ نیچے کود پڑا۔ شکر ہے چوٹ نہیں آئی۔ لیکن یہ جھروکہ بھی اس کے ایک نوکر کے اوپر گرا۔ خدا کی قدرت تھی کہ اسے بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ اس روز ۳۳ مرتبہ زلزلہ آیا اور آئندہ مہینہ بھر تک زمین روزانہ دو تین مرتبہ جنبش میں آتی رہی۔ میں نے امرا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ قلعہ کابل کے شکاف اور دراڑوں کی مرمت کریں۔ ان کی محنت اور ہنرمندی سے ۲۰، ۳۰ دن میں پوری مرمت اور درستی ہو گئی۔“

زلزلے اور اپنی بیماری کے باوجود اگلی بہار میں شیر نے اپنی گشت جاری رکھی حتیٰ کہ پاکی میں ڈال کر لایا گیا اور بحالی صحت کی غرض سے کابل آ کر اپنے نئے چار باغ میں مقیم ہوا۔ یہاں دنبل پر چیرا لگا اور مسلسل دیئے گئے۔ اسی میں بعض بری خبریں آئیں۔ دریائے سندھ کی تاخت سے واپسی میں اسے بتایا گیا تھا کہ ناصر میرزا اس کا ساتھ چھوڑ کر چل دیا۔ یہ شہزادہ اپنی جمیعت لے کر دروں کے پار شمال کو گیا اور حیلہ یہ کیا کہ ازبکوں سے لڑنے جاتا ہوں۔ کوچ کرتا ہوا حصار بدخشاں تک چلا گیا۔ اب اسی طور سے جمائگیر میرزا نے ہزارہ قبائل کے علاقے سے مغرب کی راہ لی۔ بعض دوست دار قبائل کو ملایا جو ازبکوں کی طرح تاخت تاراج کر رہے تھے اور ہرات کی جانب چل دیا۔ اتنی بات بابر کو پہلے معلوم ہوئی تھی کہ اس کے دو درباری اسے بابر کے خلاف ورغلا تے تھے۔ وہ آسانی سے لوگوں کے کسے میں

آ جاتا تھا۔ بابر نے قاسم بیگ کو غزنیں بھیجا کہ جہانگیر کو مدد دے اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر رکھے۔ اس نے واپس آ کر چار باغ میں خبر دی کہ بہکانے والوں کی سرگوشیوں کا مجھ سے اسناد نہ ہو سکا۔ وہ لوگ ذرا ذرا سی بات کو کچھ سے کچھ بنا کر جہانگیر کو آشفستہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً شہزادے نے بیئر پر باز چھوڑا۔ وہ زمین پر گری اور باز اور سے جھپٹا۔ لوگ پکارے پکڑ لیا یا رہ گیا؟ قاسم بیگ کے منہ سے نکلا ”نچہ مار چکا ہے اب گرفت سے جانے دے گا۔“ جہانگیر سن کے پریشان ہوا اور ندیموں نے یقین دلایا کہ شکار، آپ ہیں جسے قاسم گرفت سے جانے نہ دے گا۔

بابر کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ اسی غلجان کے زمانے میں فوری توجہ کے قابل دوسری خبریں ملیں۔ یعنی ازبکوں کا سایہ پھر ان ملکوں پر اس طرح پڑتا نظر آیا جیسے دانہ چلتی بیہوں کے جھلڑ پر شکار دور سے گرتا دکھائی دیتا ہے۔ شیبانی خاں سال بھر تک بعید شمال میں اس شہر کا محاصرہ کئے رہا جس نے امیر تیمور کے زمانے سے اب تک بڑے بڑے حملوں کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ قدیم حصار آمو کے دہانے پر جہاں وہ بری سمندر، بحیرہ ارال میں گرتا ہے، ریگستان اور مزروعہ اقطاع، یعنی صحرائی غارت گروں اور جنوبی وادی کے زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان واقع تھا۔ دور دور کے سوداگر یہاں آتے اور بڑے بڑے اہل علم یہاں ٹھکانا بناتے تھے۔ ترک اسے ارغچہ کہتے تھے، عربوں میں خوارزم معروف تھا۔ یہ نامی شہر دغا کے ذریعے شیبانی خاں کے ہاتھ آ گیا۔ ادھر سے فراغت پا کر ازبک سمرقند کو پلٹے جیسے بھیڑیا اپنے بھٹ میں واپس آتا ہے اور اب خوارزم، اندجان، سمرقند، قندز کی فتوحات کے بل پر، آل تیمور کے آخری نشان عظمت، ہرات پر فوج کشی کی تیاریاں کیں۔ وہاں سے معمر بادشاہ سلطان حسین میرزا نے اپنے بیٹوں کو ہرات طلب کیا اور اسی پرچم کے نیچے آنے کی عمر شیخ میرزا کے بیٹے بابر کو دعوت دی جسے تین مرتبہ مدد دینے سے انکار کر چکا تھا۔ ”خواب بین“ (سلطان علی) کے بیٹے سید افضل نے چار باغ میں یہ پیام آ کر دیا۔

بابر نے اس طلبی پر سوچ بچار تو کی، لیکن وہ شروع سے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ لکھتا ہے کہ ”ہمیں کئی لحاظ سے جانا واجب تھا: ایک بڑا بادشاہ جو تیمور کا جانشین ہے اپنی اولاد اور امرا کو طلب کرے تو شیبانی جیسے دشمن کے خلاف میرا جانا ضروری تھا۔ دوسرے پاؤں پاؤں جائیں تو مجھے سر کے بل جانا چاہئے۔ دوسروں کے ہاتھ میں ڈنڈے ہوں تو میں پتھر ہی لے کے جاؤں۔ پھر جہانگیر میرزا بگڑ گیا تھا، لازم ہوا کہ یا تو اسے منایا جائے اور یا اس کی

دشمنی کا تدارک کیا جائے۔“

بایں ہمہ اس یادگار سال (۱۵۰۶ء) کے موسم بہار میں بابر کو جانچ تول کر ہی قدم اٹھانا تھا۔ اسے اپنے سازشی وزیر باقی بیک سے تھوڑے دن پہلے نجات ملی اور جمائگیر میرزا کا دفع ہو جانا بھی غنیمت معلوم ہوا ہو گا۔ اس کی نئی بے تمیز رعایا میں فی الجملہ نظرو انضباط پیدا ہو گیا تھا اور تھوڑی بہت اجناس خوردنی مل گئی تھیں۔ قزاق مزاج قبائل کچھ عرصے کے لئے تو ضرور قابو میں آ گئے تھے مگر دوسری طرف، ان دروں کے پار، جو سارے جاڑے مسدود رہتے تھے، پانچ سو میل دور ہرات جانا اور فوج کو ساتھ لے جانا، خطرے سے خالی نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ بازوؤں پر ازبک لگے ہوئے تھے اور صرف یہی میدانی فوج تھی جس پر بابر اعتماد کر سکتا تھا۔ (یہ بھی ظاہر ہے کہ ان خطروں کا سارا بوجھ بابر کو اٹھانا تھا) لیکن جمائگیر سے وہ دست بردار نہ ہو سکتا تھا۔ بوڑھے چچا کی استمداد کی درخواست کو رد نہ کر سکتا تھا اور نہ آوازہ جنگ سننے کے بعد اس سے میدان میں نکلے بغیر رہا جاتا تھا۔ اسے آرزو تھی کہ اپنے دشمن ازبک سے پھر رو در رو مقابلہ کرے۔ چنانچہ کابل و غزنیں کو بعض سن رسیدہ سرداروں کی نگرانی میں دے کر وہ خوشی خوشی اور دراصل سخت مصیبت جھیلے، مغرب کی طرف چل پڑا۔

سفر خراسان

بابر نے جنوب کا کاروانی راستہ قدھار ہو کے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے سیدھا مغرب کا رخ کیا۔ شر کے ۱۰ ہزار فیٹ طولانی درے سے نکل کر کوتل دندان شکن اور بد مزاج ہزارہ قوم کے علاقے کی طرف گھوم گیا۔ کچھ ازبک جو قریب ہیں آ گئے تھے، انہیں قاسم بیک نے مار کے دھکیل دیا۔ حسب معمول وہ چیدہ فوج اور تھوڑے سامان کے ساتھ تیز رفتاری سے راستے کے پہاڑی قبائل کو مرعوب کرتا ہوا جا رہا تھا۔ جمائگیر میرزا نے ایماتوں سے سپاہی بھرتی کرنے چاہے تھے اور بامیان کی پہاڑی پر بابر نے اسے جا لیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے پیچھے آنے والوں کو دیکھنے پلٹ کر آیا تھا۔ بابر کا علم اور اثلا پہچان کر اٹے پاؤں پھرا اور اپنی لشکرگاہ کے خیمے تک چھوڑ کر چند رفیقوں سمیت جانب مغرب پہاڑیوں میں گھس گیا۔

بابر لکھتا ہے کہ ”ان دنوں ملک بھر میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے جو

کچھ زبردستی لے سکتا، لوٹ لیتا تھا۔ میرے آدمیوں نے بھی زمیں داروں اور خانہ بدوش ٹولیوں میں اسی طرح کی لوٹ مار کیا۔

شمال مغرب میں تین دن کی مسافت پر آمو کے پار شیبانی خاں سرحدی شہر بلخ کا (باختر کی حسین وادی کے وسط میں) محاصرہ کر رہا تھا۔ باہر بڑھے چلا گیا۔ رات کی فرصت میں سلطان حسین میرزا کی زندگی کے واقعات لکھتا رہا۔ پھر ہرات سے اس کی (مرنے کی) خبر آئی تو ان یادداشتوں پر نظر ثانی کر کے دوبارہ مرتب کیا۔ آل تیمور کے آخری فرماں روا کا یہ ایک یادگار مرگ نامہ (دفینہ) ہے۔

”سلطان حسین میرزا با۔ قرا ۸۴۲ ہجری (۱۴۳۸ء) میں یہ مقام ہری (ہرات) پیدا ہوا۔ اس کی ماں دلشاد بیگم (۴۴) بھی امیر تیمور کی پوتی (پروتی) تھی اس طرح وہ نجیب الطرفین، خاندانی بادشاہ تھا۔ اس کی آنکھیں بھی ہوئی جسم کی ساخت شیر جیسی یعنی سینہ چوڑا، کمر پتلی تھی۔ بڑھاپے میں بھی جب کہ سر کے بال سفید ہو گئے تھے، سرخ و سبز ریشم کا رنگین لباس پہنتا تھا۔ سر پر عموماً ”پوست برہ کی ٹوپی یا چوڑی باڑ کی کلپاک ہوتی لیکن عیدین کے دن تین بیچ دے کے دستار باندھ لیتا اور اس میں سرخاب کے پر کی کلفتی لگا کر نماز کو جاتا تھا۔ ہرات کی بادشاہی اسے ملی تو شروع میں سوچھی کہ اپنے نام کی بجائے دوازدہ امام کے ناموں کا خطبہ پڑھوائے۔ لیکن میر علی شیر اور بعض دیگر اشخاص نے اس ارادے سے باز رکھا اور پھر سب ضروری کام وہ اہل سنت والجماعت کے طریق پر کرانے لگا۔ وجع المفاصل کی وجہ سے نماز میں رکوع نہ کر سکتا تھا۔ باتوئی، خوش طبع، زود حس آدمی تھا اور اسی مزاج کے مطابق گفتگو تھی۔ شریعت کا نہایت پابند تھا اور ایک مرتبہ اس کے بیٹے نے کسی کو مار ڈالا تو اس نے بیٹے کو مقتول کئے ورثا کے حوالے کر کے قاضی کی عدالت میں بھیج دیا۔ تخت نشینی کے ۶۷ سال تک شراب سے بچتا رہا، لیکن پھر اس عادت بد میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظہر سے پہلے نہ پیتا تھا لیکن ظہر کے بعد روزانہ پینے لگا۔ اور اسی طرح اس کے بیٹوں اور فوج والوں نے بچی شروع کی اور عیاشی اور بدکاری کرنے لگے۔

حسین میرزا جری اور بہادر آدمی تھا۔ بارہا خود تلوار لے کے میدان جنگ میں لڑا اور شمشیر زنی میں کوئی تیموری شہزادہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا۔ اسے شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور اپنے تخلص حسینی سے دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے اکثر اشعار کچھ برے نہیں ہیں لیکن پورا دیوان ایک ہی بحر میں لکھا ہے اتنے بڑے ملک کا فرماں روا ہونے کے باوجود ادنیٰ

آدمیوں کی طرح لڑائی کے مینڈھے پالتا، کبوتر اڑاتا، مرغ لڑایا کرتا تھا۔ اپنی چپاولی جنگ کے زمانے میں رودگرگاں (بحر خزر کے قریب ایک ندی) کو تیر کے پار ہوا اور ایک ازبک کلزی کو اچھی مار لگائی۔ سلطان (بہ قسح) ابوسعید میرزا نے تین ہزار سپاہی اس پر شجوں مارنے کے لئے بھیجے تھے وہ صرف ساٹھ جوانوں سے ان پر جا پڑا اور ان کی خوب خبر لی۔ یہ اس کا سب سے نمایاں جنگی کارنامہ تھا..... اس کی حکومت خراسان میں تھی جس کے مشرق میں بلخ، مغرب میں (بہ قسح مترجم) سہام و دامغان، شمال میں خوارزم، جنوب میں قندھار و سیستان ہیں۔ ہرات جیسا شہر اس کے ہاتھ آگیا تو پھر دن رات عیش و عشرت کے سوا اسے کوئی کام نہ رہا۔ اسی طرح اس کے ملازمین لہو و لعب اور خرافات میں مشغول ہو گئے۔ یہی سبب ہوا کہ اس نے جنگ آرائی کی مشقت اور فوج کشی کی زحمت اٹھانی چھوڑ دی اور نتیجہ ”اس کی مملکت اور فوجی جمعیت میں برابر کی ہوتی گئی، کوئی اضافہ نہ ہوا۔“

یہ سطور لکھتے وقت بابر کو ضرور یہ تلخ بات یاد آئی ہوگی کہ اس کے چچا نے وادی آمو میں بابر سے اس وقت بھی تعاون نہیں کیا جب کہ حکومت خراسان میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی۔ مگر حسین میرزا کی خامیاں گنوانے کے ساتھ وہ اس کے بہادرانہ کارناموں کی جو خود بابر کے کاموں سے مشابہ تھے، ستائش میں کمی نہیں کرتا۔ اور میرزا کے تذکرے کو اس کی جملہ آل اولاد، بارہ لڑکیوں کے حالات سے جو زندہ تھیں، پھر اس کے عمائد دربار اور اہل علم و فن کے ذکر سے طول دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کی بد مزاج بیوی (بیکہ سلطان) کی نسبت اپنی رائے بھی شامل کر دی ہے :

”اس کی پہلی بیوی..... بد بلیغ الزمان کی ماں تھی (بد بلیغ الزمان سب سے بڑا بیٹا تھا اگرچہ سب سے چاہتا مظفر تھا) وہ مزاج کی ایسی خراب تھی کہ حسین میرزا کو نہایت آزار دیتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ تنگ آکر اسے طلاق دی اور چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے سوا چارہ کیا تھا۔ میرزا حق پر تھا۔ بقول سعدی ۔

”زن بد در سرائے مرد کو

ہم دریں عالم است دوزخ او“

معلوم نہیں یہ کلمات لکھتے وقت بابر کو عائشہ یا اپنی کوئی اور بیوی یاد آئی؟ عورت کے متعلق یہ ترش ترین الفاظ ہیں جو اس کے قلم سے نکلے۔ اس کے ساتھ تو سوائے ایک کے

اور کسی عورت نے بے وفائی نہیں کی۔ یہ بھی واضح رہے کہ حسین میرزا کا یہ حیات نامہ آل تیمور پر بابر کی الوداعی تحریر ہے۔ ان شہزادوں کی نسبت جو دیں دار، خونی، شرابی، فنون لطیفہ کے دل واہ، منصب شاہی کے آرزو مند اور ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے تھے، یہ اس کی آخری تحریر تھی۔ بابر پہاڑوں کے حصار سے بچ در دریا کی وادی میں ادھر جا رہا تھا۔ جہاں اسے چچا سے مل جانا تھا مگر اسے دیر ہو گئی اور ”ذی الحجہ (مئی) کے مہینے میں سلطان حسین میرزا شیبانی خاں سے مقابلے کے لئے فوج لے کر باب آہنی کے مقام تک آیا تھا کہ عالم بقا کی طرف رخصت ہوا۔“ پھر بھی بابر نے ہرات کا سفر جاری رکھا۔

باب چہارم

شراب دل

شیر کی مہمانی ہوتی ہے

۱۵۰۶ء کی خزاں کے اواخر میں بابر ہرات کے لشکروں کے مقام تک پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سارا میدان زر و نفت کا تھان معلوم ہوتا تھا۔ دریائے مرغاب کے کناروں پر ایک سے ایک قیمتی خیموں کا سلسلہ چلا جاتا تھا۔ ان کی گہما گہمی دیکھ کر کسی جشن کا گمان ہوتا تھا۔ جس طرح انگلستان کے ایک نوجوان بادشاہ پر ایک اور تاریخی میدان میں گزری تھی، بابر اپنے چار طرف یہ شان و شوکت دیکھ کر جو خود اس کے ادنیٰ ساز و سامان پر طعنہ زن تھی، دنگ رہ گیا۔ وہ سالہا سال مشقت انگیز میدانی معرکے جھیل کر آ رہا تھا لہذا عظیم شامیانوں کے نیچے عیش و طرب کے درباروں میں داخل ہونا اور بھی عجیب معلوم ہوتا تھا اور اس کا پہلا تاثر یہ ہوا کہ یہاں سخت پریشان ہنگامہ گرم ہے۔

اس نے دور دراز مقامات، مقدس مشہد اور قدیم مرو کے امرا کے پرچم لہراتے دیکھے۔ وحشی ترکمان سرداروں کے سیاہ لبادے مشاہدہ کئے اور اپنے بھائی جہانگیر میرزا کو بھی دیکھا کہ خوف زدہ سارونکا بیٹھا ہے۔ نوکروں کا ہجوم تھا۔ نقیب بابر کی آمد کی نوید پکارتے پھرتے تھے۔ ملاقات کے آداب طے کئے جا رہے تھے کہ مرحوم حسین میرزا کے فرزند اکبر کے سامنے وہ کہاں تک بڑھے گا اور کس جگہ آداب بجالائے گا۔ اس کے گرد مجمع اتنا ہو گیا تھا کہ بعض درباریوں کے پاؤں کئی قدم تک اوپر ہی اٹھتے رہے اور بعض جو باہر جانا چاہتے تھے بالا ہی بالا اندر لے آئے گئے (بابر کی نظر اس تلاطم میں بھی ایک ایک بات دیکھ رہی تھی) شاہی قالینوں پر چل کر وہ بارگاہ کے اندر آیا جس میں پردے کھینچ کر کئی گوشے امرا کے لئے تیار کئے گئے تھے اور حسب مراتب ان کے لئے الگ الگ دسترخوان پر شربت، برف، فواکہ پنے تھے۔ بابر قاسم بیگ کی معیت میں اس جگہ جسے وہ شاہی ”دیوان خانہ“ کہتا ہے، صدر

کی طرف بڑھا جہاں مرحوم بادشاہ کے فرزند اس کے منتظر تھے :-
یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پہلے میں جھکوں گا اور پھر بڑا شہزادہ تعظیماً "مسند کے کنارے
تک بڑھے گا۔ میں نے آداب کیا اور بے توقف آگے چلا مگر اس شہزادے (بدیع الزمان
"مترجم") نے اٹھنے میں ذرا دیر لگائی۔ قاسم بیگ دیکھ رہا تھا۔ میری توقیر میں ہی اس کی
عزت تھی۔ اس نے میرا پنکا کھینچا۔ میں سمجھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تاکہ ٹھیک جگہ پر
ہی ملاقات ہو ہر چند یہ کوئی جلسہ نہ تھا مگر ملازمین طرح طرح کے کباب اور مشروبات
سونے چاندی کے پیالوں میں لائے۔

ہمارے بزرگ چنگیز خانی آداب و عادات کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے درباروں،
ضیافتوں اور نشست و برخاست کے طریقوں میں کوئی بات ان پرانے آداب کے خلاف نہ
کی جاتی تھی۔ یہ قاعدے کوئی قرآن حدیث کے احکام نہ تھے کہ جس کی پابندی فرض ہو۔
تاہم جن لوگوں کو ورثے میں ملے انہیں برتنے میں کچھ برائی نہیں۔ بلکہ ہر شخص کو ایسے
ضابطوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ البتہ باپ دادا کی کوئی رسم بری ہو تو اولاد پر لازم ہے کہ اسے
بدل دے۔"

چنگیز خاں اعظم کے قواعد پر باہر کی اپنے دل سے یہ باتیں اس کے ذہنی خلیجان کی عجیب
طرح غمازی کرتی ہیں۔ چنگیزی قوانین پر خود اس نے کبھی عمل نہیں کیا۔ بلکہ لڑکپن سے
قانون شریعت ہی کا پابند رہا اپنے مرحوم ماموؤں کے ہاں خاص مغلی طرز کا فوجی مظاہرہ اور
قدیم رسوم دیکھ کر وہ منغض ہو گیا تھا۔ لیکن اب اپنے عم زاد شہزادوں کی پر تکلف "صحبت"
میں بھی بیگانگی سی محسوس کرنے لگا۔ صحرائی پڑاؤں میں نیم فاقہ کشی کی زندگی، مغل خانہ
بدوشوں کا اصلی ورثہ تھا جو اسے ملا۔ علی ہذا شکار اور میدان جنگ میں وہ مغول ہی کے سخت
آئین کو ذہن میں رکھتا تھا۔ ہرات کے شہزادوں کو ظاہر ہے کہ یہ چیزیں یاد نہ تھیں۔

دوسری ملاقات میں بڑے بھائی بدیع الزماں نے تعظیم کرنے میں کچھ کمی کی تو باہر نے
فوراً ناگواری ظاہر کی۔ سن رسیدہ حسین میرزا کی وفات کے بعد وہ اپنے خیال میں باقی ماندہ
تمام تیموریوں کی سرداری کا حق دار ہو گیا تھا۔ اس نے بلا تاخیر اپنے دو امیروں کو میزان کے
پاس بھیج کر یہ پیام دیا : باہر اگرچہ عمر میں چھوٹا ہے (وہ اس وقت ۲۳ سال کا تھا) لیکن
سمرقند کے لئے دو دفعہ لڑا اور اپنے بزرگوں کا تحت واپس لے چکا ہے۔ خاندان کی خاطر
بیرونی دشمن سے اس کی معرکہ آرائیاں موجب اعزاز و امتیاز ہوئی ہیں۔ چنانچہ پھر بدیع

الزمان خاطر تواضع سے پیش آیا اور دھوم دھام سے اس کی دعوت کی صورت میں اس کا اظہار کیا۔ بابر اعتراف کرتا ہے کہ یہ مجلس فی الواقع نہایت آراستہ اور پر تکلف تھی۔ نماز ظہر کے بعد سے شروع ہوئی۔ میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا..... اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تو انہوں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شراب کے ساتھ ہر قسم کی گزک، مرغ اور قاز کے کباب خوانوں میں لگائے گئے۔ ایک بار میرزا مظفر حسین کی محفل شراب میں دریائے مرغاب کے کنارے جانا ہوا۔ حسین علی جلّار اور میر بدر بھی وہاں موجود تھے۔ بدر نے چھک کر پی تو پھر خوب ناچا۔ یہ ناچ اسی کی ایجاد تھا۔

شیر کو یہ راگ رنگ کے جلے پسند آئے۔ اپنی عمر میں ایسے ماہرانہ رقص نہ دیکھے تھے نہ موسیقی کی یہ الحان سنی تھی۔ شراب کے دور میں الگ بیٹھے بیٹھے اس کا بھی جی لپچایا کہ اس ممنوع مشروب سے لطف اندوز ہو اور اس کے ہیجان انگیز خواص پر غور کرنے لگا۔۔۔۔۔ کھانے میں قاز کو کاٹنے میں اس سے غلطی ہوئی تو بدیع الزمان نے ازراہ تواضع چھری لے کر سبک دستی سے خود قاشیں تراش دیں۔

ان لطف اندوزیوں کے باوجود بابر شکوک سے خالی نہ تھا۔ ملک خراسان کے یہ والی تین مہینے سے مجتمع ہو رہے تھے۔ مگر ایک دوسرے کی ضیافتوں کے سوائے کوئی کام ان سے بن نہ آیا تھا۔ بدیع الزمان اور مظفر دونوں کی صحبت خوشگوار اور وہ دعوتیں کھلائی خوب جانتے تھے لیکن جنگ کی تیاری بالکل نہیں کی۔ حقیقت میں وہ تدابیر حرب سے ناواقف اور جنگ یا مصائب سے نا آشنا تھے۔ وہ جلے اور ضیافتیں ہی کرتے رہے، وہاں شیبانی خان کے سامنے بلخ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ازبک سواروں کی تاختیں مرغاب کی نواح میں میرزاؤں کے لشکر گاہ سے چالیس میل فاصلے پر ہونے لگیں۔ ان صاحبوں سے اتنا بھی انتظام نہ ہو سکا کہ ایک رسالہ بھیج کر ان غارتخو کو بھگا دیتے۔ بابر نے اس کام کی اجازت چاہی تھی مگر میزبان میرزاؤں نے غالباً اس خوف سے انکار کر دیا کہ بابر کی جنگی شہرت میں اضافہ ہو گا۔ (۳۵)

شیبانی کو ہرات کے لشکروں کا پورا علم تھا، ادھر جاڑا سر پر آگیا۔ لہذا وہ چپ چاپ اپنے مضبوط حصار سرقد میں چلا آیا۔ اس دانش مند فاتح نے کاپوا (یورپ) کے جاڑے کی سرگزشت تو کبھی نہ سنی ہوگی لیکن اس کی عین خوشی تھی کہ برفانی طوفانوں کا موسم ان اتحادی لشکروں کو پرانندہ کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس بھیج دے۔ باہمی مشاورۃ

سے میرزاؤں نے یہی فیصلہ بھی کیا۔ انہوں نے باہر سے بھی اپنے لشکر سمیت ہرات چلنے اور کچھ روز وہاں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔

باہر نے حسب معمول دل میں مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اگر برف نے درے نہ روک دیئے ہوں اور کوئی بغاوت بھی سد راہ نہ ہو تو بھی کابل ایک مہینے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ دوسری طرف اندیشہ تھا کہ وہاں اس کے رشتہ داروں نے کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دیا ہو اور بیرونی اضلاع میں اسے اپنی نئی رعایا، ترک، مغل، افغان، ہزارہ نیز سرحد کے جرائم پیشہ وحشی قبائل کے فسادات کا خطرہ تھا۔ ”نظر برائیں میں نے میرزاؤں سے معذرت کی مگر انہوں نے کوئی عذر نہ سنا۔ گھوڑوں پر سوار میرے خیموں میں آئے اور مصر ہوئے کہ سردیاں یہیں گزاروں۔۔۔۔۔ شاہی رتبے کے لوگ بذات خود ٹھہرنے کی درخواست کریں تو پھر انکار کرنا محال ہو گیا۔ دوسرے شہر ہرات کو جس نے سلطان حسین میرزا کے زمانے میں وہ ترقی کی کہ آباد دنیا میں بے نظیر ہو گیا، اسے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔“

ارباب علم و فضل

اگر نکولو کیا ولی ہرات آتا، جہاں اس کے کسی ہم عصر فرنگی کے قدم نہیں پہنچے، تو وہ یہ اجتماع ضدین دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ عین سیاسی زوال کے زمانے میں وہاں علم و فن کا عروج ہو رہا ہے حقیقت میں ہری رود کے کنارے کا یہ شہر ایشیا کا فلورنس تھا۔ معلومات کے جویا باہر نے بیس دن یہاں پھر کر اپنی پیاس بجھائی۔

ہرات اور دوسرے شہروں میں ایک فرق تھا کہ تیموری محاربات کے بعد یہ ازسرنو تعمیر ہوا اور سو برس تک یہاں (اگرچہ مخدوش) امن امان قائم رہا اور اسی لئے حسین میرزا با-تقرا کے عہد میں پندرہویں صدی عیسوی کی ”نفست تیموریہ“ کا یہی شہر مرکز بن گیا۔ اس کے جنگی استحکامات سے بڑھ کر ادبیات نے شہرت پائی۔ قریب ہی ایک پارسی آتش کدے اور ایک نستوری کلیسا کے آثار تھے۔ بارونق منڈی کے سرے پر بڑی مسجد جامع بلند تھی۔ شاہی محل شہر کے باہر لہلہاتے باغوں۔ تانستانوں رہٹ کے کنوؤں کے سلسلے میں ایک ٹیکرے کے اوپر بنا ہوا تھا۔ باہر کے ذہن میں نئے نئے مقبرے بھی بڑے بڑے علما اور ذی شان مشاہیر کی یادگار تھے۔ اس حرکت اور توانائی کے دور میں علم صرف کتابی معلومات حاصل کر لینے کا نام نہ تھا بلکہ معبود حقیقی سے تعلق کی معرفت اور حقیقت کی تلاش کو علم کہتے تھے۔

صوفی درویشوں کے مرشد کبیر مولانا رومیؒ نے ایک عاشق صادق اور (بہ تصحیح مترجم) موسیٰؒ کے قصے میں اللہ تعالیٰ کا قول تحریر کیا ہے کہ میں ظاہری الفاظ اور قال کو نہیں دیکھتا۔ دل کی سچی تڑپ چاہتا ہوں۔“ دوسری جگہ سالک روحانی وارفتگی میں پکارتا ہے کہ میں جماد کی صورت میں تھا، مرکز نبات ہوا۔ نبات سے حیوان اور پھر انسان بنا۔ جب مروں گا تو آئندہ ملکوتی زندگی پاؤں گا اور ملکوتی کے آگے وہ مرتبہ پا جاؤں گا جسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ یعنی فنا، فنا فی اللہ۔“ (۴۶)

اس تصوف میں مسیحی عقائد کا سراغ ملتا ہے۔ عمر شیخ میرزا حضرت رومی کے یہ اشعار پڑھ کر جھومتا تھا مگر سمجھتا نہیں تھا۔ خود بابر جامیؒ کا گرویدہ رہا جنہوں نے سنی عقائد تصوف کی زبان میں بیان کئے ہیں۔ ان کا بابر کے درود سے پانچ ہی سال پہلے ہرات میں انتقال ہوا تھا۔ وہ اپنی نوبت پر قطب الاقطاب خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے کسب فیض کرتے ہیں جو بابر کے بھی روحانی مرشد تھے۔ اپنی تلاش و جستجو میں جامیؒ نے ”ہفت اورنگ“ اور مثنوی ”یوسف زلیخا“ کی تمثیلات اور افسانے کے پیرائے میں اپنے افکار بیان کئے ہیں۔ بابر انہیں تعریف سے مستغنی بنا کر محض تبرکاً ان کا نام نامی اپنی کتاب میں لایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے ہرات کے مصور پرانی روایات سے، جو اسلامی ملکوں میں ہمیشہ بہت قوی رہیں، آزاد ہو گئے تھے۔ وہاں کے نقاشوں نے اس حد تک جسارت کی کہ عالم آخرت کی تصویر میں فرشتوں کی صورتیں بنائیں جو کنارے کی نیلگوں فضا میں آتشیں دکھائی گئی ہیں۔ حالانکہ چہروں کی تصویر راجح العقیدہ مسلمانوں میں مدت دراز سے ممنوع تھی۔ انہی میں ہزاد تھا جسے زمانہ حاضرہ میں اول درجے کا مصور مانا گیا ہے وہ تاثری تصاویر میں مرقع نگاری کی طرح باریکی سے نقاشی کرتا ہے۔ پس منظر کی زمین ہمیشہ خاص معیار کی ہوتی ہے جس میں قدرتی اشکال ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے گھوڑوں کی حیرت انگیز تصویریں بنائی ہیں اور ان کے رنگ، قرمزی، سیاہ، سفید تک پس منظر کے عین مناسب دیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے ہزاد کی استادہ میں یوآن اور منگ خاندانوں کے چینی فن سے استفادے کا دخل ہو۔ اکثر اوقات یہ نقاشیاں صرف کسی کتاب کی آرائش کے لئے کی جاتی تھیں۔ کیونکہ ہرات کے نگار خانوں میں جو مجلدات تیار ہوئے ان میں نقاشی، تذهیب اور خطاطی تینوں فنون کے باکمال اساتذہ کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ایک ایک کتاب کی تیاری میں اکثر کئی سال لگ جاتے تھے۔ خصوصاً کلام اللہ کو جمیل ترین شکل میں پیش کرنے کے لئے قرآن مجید کا

ہر نسخہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا جاتا تھا۔ پھر تاریخ کی کتابیں تھیں، جو اسلامی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہیں جیسے علی یردی کا ”ظفر نامہ“ امیر تیمور میر خواند کی ”رونتہ الصفا“ جس کا تکرار اس کے پوتے خواند میر نے لکھا اور وہ ان دنوں حیات تھا۔ مزید برآں موسیقی میں نئی نئی الحان ”نقوش“ نکالی جاتی تھیں، فن تعمیر کے استاد نئے نئے اسالیب سوچتے۔ کوزہ گر عجیب عجیب صنایاں کر رہے تھے۔

یورپ میں لفظ ”ہسٹری“ (تاریخ) ابھی تک پوری طرح رائج بھی نہیں ہوا تھا جب کہ خراسان میں عالمی افکار کے لوگ اس موضوع پر کام کر رہے تھے۔ خود فرماں روا، سلطان حسین میرزا ہر قسم کے علم و فن کا ذوق رکھتا تھا۔ اگرچہ بابر یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی تصنیفات میں کچھ کمی رہ جاتی تھی۔ وہ بطور خاص حسین میرزا کے شہرہ آفاق وزیر علی شیر نوائی کے نو تعمیر مقبرے پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھی۔ میر علی شیر تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کرنی چاہتا تھا، مجبوراً وزارت پر آمادہ ہوا تو بھی نقاشی، ترتیب وقائع اور خصوصیت سے مذہبی رنگ کی شاعری کے لئے وقت نکال کر، وزارت میں تصنیع اوقات کی تلافی کر لیتا تھا۔ اس نے بیش تر اپنی ملکی زبان ترکی میں، نوائی تخلص سے شعر کہے اور اسے فارسی پر ترجیح دی۔ یہ رہنمایانہ اقدام وہی امتیاز رکھتا ہے جیسا یورپ کے احیائے علوم کے ابتدائی دور میں لاطینی کی بجائے عام لومبارڈی زبان میں تصنیف کرنے کو حاصل ہوا۔ بابر کو اس بات سے بہت ہی قوی دلچسپی تھی کیونکہ وہ خود بھی اپنی کتاب، چغتائی ترکی میں لکھ رہا تھا۔ اگرچہ شعر گوئی کے لئے ترکی اور فارسی دونوں سے کام لیتا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ ”واقع میں علی شیر بے نظیر شخص تھا وہ سلطان حسین میرزا کا وزیر اتنا نہ تھا جتنا اس کا مصاحب وہم نشین تھا۔ ترکی زبان میں اتنا کچھ اور ایسا اچھا کسی نے نہیں لکھا جتنا اس نے تصنیف کیا۔ فارسی میں پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اس میں بعض اشعار برے نہیں ہیں۔ اگرچہ اکثر ادنیٰ درجے کے ہیں۔ مولانا جامی کی طرز پر ایک انشا کی کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں کچھ خطوط اوروں کے جمع کئے اور کچھ خود لکھے ہیں تاکہ ہر قسم کے پڑھنے والوں کو اپنی ضرورت کے مطابق خط کا نمونہ مل جائے۔ اس نے آزاد رہ کر مجرد زندگی بسر کی۔ بیوی بچے آل اولاد کچھ نہ تھی“ (شاید رہبانیت پسند تھا) ہرات کی گردشیں لگانے میں بابر کو ایک لطیفہ بہت پسند آیا۔ جس میں علی شیر پر چوٹ تھی۔ ہرات کے ایک معمولی شاعر (ملا) بنائی کو علی شیر طعنے دیا کرتا تھا کہ وہ موسیقی نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ یہ امیر ہرات سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس

فرصت میں بنائی نے موسیقی کے رموز تک سیکھے بلکہ خود نئی لحنیں (نقش) بھی نکالیں۔ علی شیر واپس آیا تو بنائی نے خود اپنا تیار کیا ہوا گیت اس خوبی سے سنایا کہ وہ دنگ رہ گیا۔ پھر بھی ان میں چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔ ”ایک روز شطرنج کھیلتے میں علی شیر نے ٹانگ پھیلائی تو وہ بنائی کے کولے کو چھو گئی۔ (حسب معمول یہ لوگ قالین پر چار زانو بیٹھے تھے) علی شیر نے ازراہ تمسخر کہا ”ہرات میں بڑی آفت یہ ہے کہ ٹانگ بھی پھیلاؤ تو کسی شاعر کی کون میں جا لگے گی۔“ بنائی نے کہا ”اور پیچھے کھینچو تو بھی اسی مقام پر پہنچے گی۔“

”زبان طعن کی تیزی کی بدولت بنائی کو ہرات سے نکلنا پڑا۔ ان دنوں علی شیر نے بہت سی نئی چیزیں ایجاد کی تھیں اور دوسروں کی ایجاد کی سرپرستی کرتا تھا۔ پھر بہت لوگوں نے ازخود کوئی نئی بات یا وضع نکالی تو شہرت کے لئے اسے ”علی شیر“ کہنے لگتے تھے۔ اس کی بے سوچے سمجھے تقلید کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ کان میں درد ہونے کے باعث اس نے سر کے گرد رومال لپیٹ لیا تھا۔ لوگوں نے خواہی خواہی اسی طرح رومال لپیٹنا شروع کر دیا اور اسے تازہ ترین ”علی شیر“ طرز مشہور کر دیا۔ بنائی جب ہرات سے جانے لگا تو ایک خاص وضع کا پالان سواری کے گدھے کے لئے بنوایا اور (اس پر سوار ہو کر) کہا سب سے نیا ”علی شیر“ یہ ہے! چنانچہ ”علی شیر“ پالان ہر جگہ مروج ہو گیا۔“

صبح کے اوقات میں بابر ہرات کی عمارات کی اچھی طرح سیر اور تحقیقات کرتا پھرتا تھا۔ مدارس، مقابر، خانقاہیں، کاریزیں، مچھلیوں کے تالاب، رصد گاہیں۔ اگرچہ ان کی ایسی مفصل کیفیت نہیں لکھی جیسی سمرقند کے مشہور مقامات کی۔ اپنی قیام گاہ صرف علی شیر کا سابقہ مکان تحریر کیا ہے۔ اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبان و علم و فن، یا وہ درویش ہیں جنہیں ان کی سیاحت کے دوران ٹھہرا کر مہمان رکھا جاتا تھا یا عمدہ حافظے کے لوگ جنہیں ماضی کی روایات رواں تھیں اور آخر میں ”علوم دنیا“ کے جاننے والے کیونکہ اعلیٰ علوم دین کی تعبیر و تشریح کی شاخوں سے مختص تھے۔ بہر حال، بابر کا بہت دل چاہتا تھا کہ علم و فضل کی انہی صحبتوں میں زندگی گزار دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بطور بادشاہ کے جو دو بادشاہ بھائیوں کا مہمان تھا، اسے اپنا قیام کچھ بہت اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ ان بھائیوں میں بڑا بدیع الزمان قتلون مزاج اور مظفر کے مقابلے میں اپنی کمتری کا بھی احساس رکھتا تھا۔ مظفر، سلطان حسین میرزا کی چیتی اور چھائی ہوئی بیوی خدیجہ بیگم کے بطن سے زیادہ ہرول عزیز شہزادہ تھا۔ ادھر بابر کو اپنے مرگسار، بے چین بھائی جہانگیر کی بھی دیکھ بھال رکھنی پڑتی تھی۔ شکی مزاج ہراتی

درباریوں میں پھونک پھونک کے قدم اٹھاتا ہوتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ ان جلسوں میں شراب پینے کو بہت جی چاہئے لگا تھا۔ لکھتا ہے کہ :

”مظفر حسین میرزا نے باغ سفید میں میری دعوت کی۔ کھانا ختم ہوا اور دسترخوان بڑھایا جا چکا تو خدمتہ بیگم ہم دونوں کو بارہ دری میں جس کا نام طرب خانہ تھا، لے گئی۔ باغ کے وسط میں یہ چھوٹا سا مکان بہت پر فضا بنا ہوا ہے۔ ایوان کے ہر پہلو کی دیوار پر ابو سعید میرزا نے اپنے محاربات کی تصویریں بنوائی ہیں (ابو سعید آخری تیوری فرماں روا تھا جس کے زمانے تک زوال پذیر سلطنت کا کچھ نہ کچھ حلیہ باقی تھا) طرب خانہ میں بزم شراب آراستہ ہوئی۔ شمالی شہ نشین کی ایک مسند پر میں اور مظفر میرزا، دوسری پر سلطان مسعود اور جمائگیر بیٹھے۔ مہمان ہونے کی وجہ سے مجھے میرزا نے صدر میں بٹھایا۔ ساقیوں نے جام بھر بھر کے حاضرین کو دیئے اور کبھی نے مئے ناب کو آب حیات کی طرح پینا شروع کیا۔ جب سرور گٹھا تو وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ مجھے بھی شریک دور کیا جائے۔ میں نے اس وقت تک شراب نہیں پی تھی۔ اور اچھی طرح مخمور ہونے کی کیفیت سے واقف نہ تھا۔ اس جلسے میں سخت آرزو مند ہوا کہ یہ ندی پار کی جائے۔ لڑکپن میں کبھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ کبھی خود میرے والد نے کہا بھی تو میں نے عذر کیا اور اس گناہ سے محفوظ رہا۔ والد کی وفات کے بعد خواجہ قاضی کی خبر گیری کی وجہ سے محترز رہا۔ مشتبہ کھانے تک سے پرہیز کرتا تھا کجا کہ شراب حرام کو ہاتھ لگاتا؟ بعد میں جوانی کی خواہش نفسانی مجھے اس طرف ترغیب دینے لگی۔ لیکن کسی دوسرے نے پلانے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ میری دلی خواہش کسی پر ظاہر نہیں ہوئی تھی، اب اس محفل میں آیا کہ شاہزادے سر ہو رہے ہیں، ہرات جیسے شہر میں نہ پیوں گا تو اور کہاں پیوں گا؟ چنانچہ یہ سوچ کر قصد کر لیا کہ جب دونوں شاہزادے مل کر تقاضا کریں گے تو اپنی شروع کر دوں گا۔

اس جلسے کے گویوں میں حافظ حاجی نے خوب گایا۔ ہرات کے لوگ دھیمے سروں میں نزاکت سے گاتے ہیں۔ جمائگیر میرزا کے ہمراہ بھی ایک سرقد کا گویا میرجان نامی تھا جو ہمیشہ اونچی، سامعہ خراش آواز سے گاتا اور بے سرا ہو جاتا تھا۔ جمائگیر نے نشے میں گرما کر اسے گانے کا حکم دیا۔ وہ گایا تو سہی مگر بہت بے مزہ بے ڈھنگا گایا۔ سننے والوں میں کسی نے تو کان بند کر لئے کسی نے ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن اہل خراسان تمیز وار لوگ ہیں اور جمائگیر میرزا کے پاس خاطر سے کسی نے اسے گانے سے روکنے کی جسارت نہیں کی۔

نماز مغرب کے بعد ہم طرب خانہ سے اٹھ کر مظفر میرزا کے سرمائی مکان میں آئے۔ یہاں اس کا کوکہ یوسف علی نشہ شراب کی مستی میں کھڑے ہو کے ناپنے لگا۔ فن داں تھا، اچھا ناچا۔ مظفر میرزا نے تلوار کی مرصع پٹی، برہ پوشتین اور ایک قب چاقی مجھے عنایت کیا۔ جانک نے گانا سنایا اور مظفر میرزا کے دو غلام چھوٹا چاند (کچک مہ) اور بڑا چاند (کد مہ) متوالے بن کر فحش نقلیں کرنے لگے رات گئے تک محفل گرم رہی رات کو میں اسی مکان میں سویا۔

قام بیگ نے جو سنا کہ مجھ سے شراب پینے پر اصرار کیا گیا تھا تو مظفر میرزا کے پاس آدمی بھیج کر صاف صاف لفظوں میں تنبیہ کی۔ لیکن اب بڑے بھائی بدیع الزماں نے اس دعوت کی خبر سن کر باغ میں میری، مصاحبوں اور فوجی سرداروں سمیت دعوت کی۔ یہاں جو لوگ میرے سامنے بیٹھے وہ میرے لحاظ سے علانیہ شراب نہ پیتے تھے۔ کبھی میری توجہ ہٹا کر کبھی ہاتھ کی آڑ لے کر چسکی لگا لیتے۔ حالانکہ یہاں میری طرف سے انہیں اجازت تھی کیونکہ دعوت ایسے شخص کی طرف سے تھی جسے میں اپنا برادر بزرگ سمجھتا تھا۔

ہمارا شیر ہرات میں شراب خانہ خراب سے تو بچ گیا لیکن ایک عورت کی زد سے نہ بچ سکا۔ بڑی شنراویوں سے ایک دفعہ ملنے آیا تو وہاں اس کی ایک چھوٹی عم زاد بہن معصومہ سلطان بھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی (بہ تصحیح مترجم) بابر کی طبیعت ادھر مائل ہوئی اور اس نے بڑی بیگم کو اس سے شادی کا پیغام بھیجا، قرار پایا کہ بابر کے جانے کے بعد لڑکی اپنی ماں کے ساتھ کابل بھیج دی جائے گی۔

بیس دن تک شبانہ روز سیر اور عیش و عشرت کے جلسوں کا لطف اٹھانے کے بعد، بابر نے پھر ایک دم رائے قائم کی :

”یہ لوگ مجھ سے کہتے تھے، قشلاق (سراگزاری) یہاں کرو لیکن میرے یا میرے ساتھیوں کے لئے قشلاق کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا نہ کسی مکان کا انتظام کیا۔ ادھر سردی شروع ہو گئی۔ میرے اور کابل کے درمیان پہاڑوں پر برف گرنے لگی۔ کابل کی طرف سے مجھے فکر بڑھنے لگا مگر زبان سے کہہ نہ سکا لہذا سرمائی مقام (قشلاق) کی تلاش کا حیلہ کر کے ہرات سے چل پڑا“ (یہ ۲۴- دسمبر ۱۵۰۶ء کا دن تھا) اس طرح کوچ کرنے کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے کچھ اہل لشکر بکھر گئے۔ بعض لوگ تو تھوڑے وقفے سے چل کر آئے، بعض نے ہرات کے عیش کدوں سے نکلنا پسند نہ کیا۔

طوفان شدت پر تھا

تقدیر کی خرابی سے قاسم بیگ مشرق میں دروں کے غلط راستے سے لے چلا۔ سن رسیدہ قاسم اور نوجوان باہر میں اب نہایت عزیزانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ قاسم بیگ نے مصائب میں صرف ایک دفعہ ساتھ چھوڑا اور خسرو شاہ کی پناہ لی جسے بعد میں باہر نے بے تامل معاف کر دیا۔ لکھتا ہے کہ وہ ”نہایت وفادار، بہادر، راسخ العقیدہ دین دار مسلمان تھا۔ مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اگرچہ اسے لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا لیکن بہت ذہین، حاضر جواب خوش طبع شخص تھا۔“ اس کی رہنمائی میں اب کے قدھار کا بہت پھیر کا راستہ جو آباد وادیوں میں سے گزرتا تھا، چھوڑ کر سیدھے جنوب کی طرف چلے۔ پہاڑوں پر ویران علاقہ ملا۔ ادھر برف باری شروع ہوئی جو بعض اوقات گھوڑے کی رکابوں تک اونچی پڑتی تھی۔ ایک بوڑھے راہبر کو ساتھ لیا تھا، وہ تازہ برف باری میں بیٹھا بھول گیا۔ لشکر کے سرداروں نے پہاڑ اُگ جلانے کا اندھن پایا وہاں پڑاؤ لگانے کا فیصلہ کیا اور ہر کارے دوڑائے کہ کچھ مقامی لوگوں کو ڈھونڈ کر پکڑ لائیں اور سلمان خوردنی بھی فراہم کریں یہ ٹولیاں تین دن تک واپس نہ آئیں۔ باہر ان کے انتظار میں پڑاؤ سے آگے نہیں بڑھا۔ چوتھے دن ہر کارے واپس آئے اور نہ کوئی رسد لائے نہ کوئی آدمی انہیں مل سکا۔ ناچار اسی بڑھے راہبر کو لے کر لشکر آگے چلا۔ گھوڑے تھک گئے، سواروں کو سخت تکلیف ہوئی اور جتنا چلے اتنے ہی زیادہ اونچے پہاڑ انہیں گھیرنے کو سامنے آتے گئے۔ باہر کو ہرات کا عیش و آرام یاد آیا۔ دل بہلانے کو اس نے گردش تقدیر کے موضوع پر ایک نظم لکھی۔

”ہم ایک ہفتے تک چلتے رہے۔ برف کو کاٹتے، کھودتے ہوئے چل رہے تھے۔ کہ سواروں کے لئے راستہ نکل آئے لیکن کوس ڈیڑھ کوس روزانہ سے زیادہ طے نہ کر سکتے تھے۔ قاسم بیگ اصرار کر کے اس راستے لایا تھا۔ لہذا اب وہ اور اس کے بیٹے برف کاٹنے میں آگے آگے ہوتے تھے۔ دس پندرہ ملازموں کے ساتھ میں بھی برف کاٹتا تھا۔ ہم گھوڑے سے اتر کر بہت آٹھ قدم تک کھدائی کرتے۔ کمر کمر بلکہ کبھی سینے تک برف میں دھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ پندرہ روز راستہ کھودنے میں اگلے تھک جاتے تو پچھلے ان کی جگہ لے کر کھدائی کرتے۔ گھوڑوں کو کھینچ کھینچ کر آگے چلانا پڑتا تھا۔ ان کے پیٹ تک برف ہوتی اور وہ دس پندرہ قدم گھٹ گھٹ کر چلنے میں رہ جاتے۔ بہت سے اچھے اچھے سپاہی

اور سردار کھدائی میں حصہ نہ لیتے تھے۔ جب راستہ صاف ہو جاتا تو سر جھکائے چلے آتے تھے۔ کسی کو تکلیف یا حکم احکام دینے کا وقت نہ تھا۔ ہر شخص کی مرضی پر موقوف تھا کہ ہمت ہو تو خود آئے اور اس کام میں ہاتھ بٹائے۔ تین روز میں اس مقام عذاب سے نکل کر کوئل زریں کے نیچے ایک کھو ("خوال") تک پہنچے جسے یہاں والے "مبارک خوال" موسوم کرتے تھے۔ اس روز طوفان شدید اور زمہری ہوا ایسی تیز چلی کہ ہر شخص کو جان کے لالے پڑ گئے۔ طوفان کی عین شدت میں کھو کے منہ پر پہنچے گھوڑوں سے اترے۔ اب گہری برف اور پتلی سی بٹیا پر ایک ہی آدمی چل سکتا تھا۔ گھوڑوں کے لئے یہ دور بھی خطرہ۔ پھر سال کا سب سے چھوٹا دن کہ تھوڑی ہی دیر میں شام ہو گئی۔ مغرب کے وقت اندھیرا ہونے تک لوگ آتے رہے اور پھر کھو میں جہاں تک گئے وہیں اتر پڑے کہ دن نکلنے کا انتظار کریں۔

کھو چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک بیلچے لے کر اتنی جگہ سے برف کاٹی کہ منہ بچھا کر بیٹھ سکوں۔ پھر بھی زمینی تک نہیں صاف کر سکا۔ البتہ ہوا سے بچاؤ ہو گیا۔ کئی آدمیوں نے پکار پکار کر کہا کہ آپ اندر چلے جائیں مگر میرا جی نہ چاہا کہ خود گرم اور محفوظ جگہ میں رہوں اور باقی سب باہر تکلیف اٹھائیں۔ یہ مروت و رفاقت کے خلاف بات تھی۔ جو آدمیوں پر گزرے وہی مجھے سہنا چاہئے۔ فارسی مثل کے مطابق "مرگ بیاباراں عیداست" میں وہیں بیٹھا رہا (بہ تصحیح مترجم) عشا کے وقت اتنی برف پڑی کہ میرے سر، کمر اور کانوں پر کئی کئی انگل جم گئی۔ رات میرے کانوں میں ٹھہر بیٹھ گئی۔

اتنے میں کچھ لوگ جو اندر گھسے تھے، پکارے کہ یہ کھو بہت لمبی اور سب کے لئے اس میں جگہ ہے۔ یہ سن کر میں اٹھا اور منہ اور سر پر سے برف کی تہ جھاڑ کر دوسروں کو آواز دی اور اندر چلا۔ حقیقت میں ساٹھ آدمیوں کی جگہ موجود تھی۔ خشک گوشت، ستو وغیرہ جو چیز کھانے کی کسی کے پاس تھی وہ اس نے پیش کی۔ اس طرح سردی اور زحمت سے بچ کر گرم، آرام کی جگہ پہنچ گئے اور کھانا بھی مل گیا۔ دوسری صبح برف باری اور تیز ہوا رکی اور ہم سویرے سے برف کاٹتے چلے کہ اوپر درے تک پہنچ جائیں۔ صبح راستہ جو بھول گئے تھے، پہاڑ کے گرد سے پھیر کھا کے درے تک آتا تھا جسے کوئل زریں کہتے ہیں۔ اسے اختیار کرنے کی بجائے ہم سیدھے گھاٹی کی تللی سے چلے اور درے کے دہانے تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ دن چھپ گیا۔ جہاں تھے، رات وہیں گھاٹی کے حلق میں گزار دی۔ سردی قیامت کی

تھی۔ بڑی تکلیف اٹھائی (بہ الفحج مترجم) کہ بیگ اور آہی کے دونوں پاؤں اور سیون رک ترکمان کے دونوں ہاتھوں کو جاڑا مار گیا۔ فجر ہوتے ہی ہم خدا پر بھروسہ کر کے آگے چلے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اصلی راستہ یہ نہیں ہے۔ اونچی اونچی سلامی دار چٹانوں پر چڑھنا پڑا اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھانے گرے۔ بارے عشاء کی نماز کے وقت سے کچھ پہلے گھائی سے باہر نکل آئے۔ یہاں کے کسی بونے بوڑھے کی یاد میں اتنی گہری برف کے زمانے میں کوئی شخص اس درے سے نہیں پار ہوا تھا۔ بلکہ اس بات کا کوئی دل میں خیال تک نہ لا سکتا تھا۔ ہر چند برف نے ان چند روز میں سخت آزار دیا پھر بھی اسی اونچی برف کی بدولت ہم پار نکلنے کے بھی قابل ہوئے۔ کیونکہ وہ اتنی اونچی نہ ہوتی تو بغیر راستے کے ان ڈھلانوں پر نہ چڑھ سکتے تھے اور نہ گہرے گڑھوں کو عبور کرنا ممکن ہوتا۔

نماز عشاء کے وقت ہم موضع یک اولانگ آ کے گھوڑوں سے اترے۔ گاؤں والوں نے ہمیں پہاڑ سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً اپنے گرم گھر ہمارے لئے خالی کئے۔ پھر بکریاں پکائیں۔ گھوڑوں کو دانہ گھانس کھلایا۔ آگ کے لئے ایندھن اور اپلوں کا ڈھیر لگا دیا۔ دل کھول کے مہمان داری کی۔ اس خوفناک سردی اور برف سے بچ کر گاؤں کے گرم مکانوں میں آنے اور اچھی غذا اور آرام پانے کا مزہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں سخت مشقت اور مصیبت کے بعد ایسی راحت نصیب ہوئی ہو۔ اس گاؤں میں ہم نے فراغت و مسرت سے ایک دن قیام کیا۔ دوسرے دن عید رمضان تھی۔ پھر بامیان کے راستے درہ شہر (?) کو پار کر کے جھگدگ (یا بنگلگ) کے قریب منزل کی۔

بابر کی جمعیت اب کابل کے مغرب میں شارع عام یا کتنا چاہئے کہ ٹھیک بٹیا پر آگئی تھی۔ جیسا اس نے لکھا، برف کے تودوں نے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر انہیں طوفان سے سلامت نکل آنے میں مدد دی۔ یعنی ان تودوں کو کاٹنے، کھودنے کی محنت نے جسم کی حرارت قائم رکھی اور زمین کے گڑھوں کو بھی پاٹ دیا۔ یہ لوگ ایسے جفاکش سوار تھے کہ برف کے طوفانوں میں، برف کاٹ کاٹ کر ایسے گوشے بنا لیتے تھے جس میں آڑ لے کر تھوڑی بہت نیند بھی لے لیتے اور وہ اور ان کے جانور کئی کئی دن برائے نام خوراک ہی پر چلتے رہتے اور برف چبا کر پیاس بجھا لیتے تھے۔ البتہ پالا مار جانے کا خوف تھا باہر اپنے بھائی جنانگیر کی کمزوریاں بیان کرنے میں ہمیشہ سکوت سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے یہ تحریر نہیں کیا کہ وہ بیمار ہوا اور پاکی میں لایا جا رہا تھا۔ پھر آرام کی جگہ اسے چھوڑ کر باہر

کو جلد کابل جانا پڑا۔ لیکن جمائیر کچھ روز بعد اسی قیام میں فوت ہو گیا۔
 کھلا راستہ غور بند کی چوڑی گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ بابر کے قراول کو معلوم ہوا کہ
 ان کے آگے ہزارہ کے ایک گروہ کا پڑاؤ ہے اور وہ لوگ مسافروں پر چھاپے مارتے ہیں۔
 بظاہر یہ لوگ اپنے قشلاق چھوڑ کر قزاقی کے لئے ادھر آ گئے تھے۔ انہیں گمان بھی نہ ہو
 سکتا تھا کہ ان کا بادشاہ اور اس کے جنگ آزمودہ سردار بلند دروں سے اتر کر آ رہے ہیں
 جنہیں برف سے مسدود سمجھا جاتا تھا۔ ”ترکمان ہزارہ بیوی بچوں سمیت ہمارے راستے میں
 سراگزاری (قشلاق) کر رہے تھے۔ دوسری صبح ہم ان کے ڈیروں اور مویشی خانوں میں گھسے
 اور خود بھی کچھ لوٹ مار کی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کے بھاگے۔ ڈیرے، خیمے اور سب سامان
 چھوڑ گئے۔ اتنے میں آگے سے خبر آئی کہ ہزارہ تیر اندازوں نے ایک تنگ مقام روک رکھا
 ہے کسی کو گزرنے نہیں دیتے۔ میں بہ غلت آگے بڑھا۔ ایسی کوئی تنگ گھاٹی نہ تھی مگر
 ایک ٹکڑے پر کچھ ہزارہ ہوشیار ہوئے بیٹھے تیر چلا رہے تھے۔ میں نے ملازمین کو تنبیہ کی
 اور کہا کہ ایسے موقع پر نوکر کام آنے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ ہر جگہ آقا
 کو بھڑا دیں۔ پھر سب کے آگے ہو لیا۔ ہزارے جلدی سے نکل بھاگے۔ ان کی چند بکریاں
 میں نے بھی گھیریں ۱۳، ۱۵ لیرے جوان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ میں انہیں اگلی منزل
 پر عذاب دے کر قتل کرا دینا چاہتا تھا کہ دوسرے رہزموں کو سبق ہو۔ لیکن قاسم بیگ کا
 ادھر سے گزر ہوا اور اس نے بے موقع رحم کھا کے انہیں جانے دیا۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا
 پڑا اور باقی سب قیدیوں کو رہائی دے دی۔ انہی ہزارہ پر تاختوں میں (کابل سے) ہمیں خبریں
 ملیں۔“

بے وفا اقربا اور وفادار سپاہی

بابر کو ہرات میں جو اندیشے تھے وہ اس کے اپنے کل (کابل) میں پیش آئے۔ دروں
 کے پار غیر حاضری میں یہ افواہ کابل میں اڑ گئی یا عہد آ بنا کر مشترک کی گئی کہ ہرات کے دونوں
 شہزادوں نے اسے (بابر کو) قید کر لیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر بابر کے دو خطاب یافتہ عزیزوں نے
 اجیر مغلوں کی، جو لوٹ مار کے ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے، ایک جمعیت تیار کر لی
 اور قلعہ کابل کا محاصرہ کرنے بڑھ رہے تھے جس کی حفاظت کے لئے وہ تھوڑے سے سپاہی
 چھوڑ گیا تھا۔ حسب معمول جس وقت وہ اپنے سیر سپاٹوں میں مصروف تھا، یہاں اس کا تخت

شاہی ہتھیا لینے کی سازش ہو رہی تھی۔ بابر کے لئے یہ غیر متوقع نہ ہو تو بھی حق یہ ہے ایسی سازشوں کا قلع قمع کرنا اسے کبھی نہ آیا۔ سازش کا سب سے ناگوار پہلو یہ تھا کہ وہ ان عزیزوں نے پکائی جنہیں سمرقند اور تاشقند کی تباہیوں سے نجات دلا کر بابر نے پناہ دی تھی۔ اہل سازش کے پس پشت ایک عورت کا چھپا چھپا چہرہ تھا۔ یہ یونس خاں کی آخری اور بارعب بیوی شاہ بیگم اور اس کی بیٹی چغتای بیگم بابر کی سوتیلی خالہ تھیں۔ اسی کے بیٹے خان میرزا (بہ تصحیح مترجم) لاغری کو بابر کی بجائے تخت کاہل کا انہوں نے حق دار بنایا۔ ان کی تائید نہیں تو کم سے کم چشم پوشی کرنے میں بابر کا سرالی عزیز حسین دوغلات شامل تھا۔ خان میرزا چار باغ کے ٹکڑے سے باغیوں کو حکم دے رہا تھا۔ قلعے میں صرف دو چھوٹے درجے کے سردار، ایک قورچی (سلاخ دار) اور ایک عالم (ملا بابا) تھے جنہوں نے مدافعت کی تیاری کی۔

ضرورت کے وقت بے تحاشا کام کرنا بابر کی عادت میں داخل تھا۔ اس کے خبر کے سنتے ہی ہزارہ کا پیچھا چھوڑ کر وہ فوراً جتنے آدمی سامنے تھے، انہی کو لے کر کابل چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح یکایک اس کا آپڑنا دشمن کے ہاتھ پاؤں پھلا دے گا کیونکہ انہیں اس کی آمد کا علم نہ تھا۔ اسی خیال سے بابر نے جھوکوں مول لینے میں مضائقہ نہیں کیا۔ لیکن کوئی شک نہیں کہ اپنے عزیزوں کی بے وفائی سے اسے دلی صدمہ ہوا۔ اگلے واقعات بھی کچھ اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی شخص ایک منحوس خواب دیکھ رہا ہو۔

”میں نے قاسم بیگ کے نوکر کو قلعے کے سرداروں کے پاس بھیجا، اپنے آنے اور آئندہ منصوبے کی سب کیفیت سے انہیں اطلاع دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم غور بند گھاٹی کے سرے سے نکلتے ہی دشمن پر ایک دم جا پڑیں گے۔ کوہ منار سے گزرتے ہی آگ جلا کے تمہیں خبر دے دیں گے۔ ادھر سے تم قلعے کے پرانے برج پر آگ جلاتا تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ تمہیں خبر ہو گئی ہے۔ ہم ادھر سے براہ راست حملہ کریں گے۔ تم اندر سے نکل کر حملہ کرنا۔ جس قدر ہو سکے اس میں کمی نہ کرنا۔ دوسرے دن فجر سے چل کر ہم ایک گاؤں میں اترے۔ اگلی صبح چل کر غور بند کے نالے سے گزرے اور پل پر گھوڑوں کو پانی پلایا۔ ظہر کے وقت سستا کر آگے چلے تو جس قدر بڑھے، زیادہ بھری برف پڑی ہوئی ملی پھر سردی اتنی شدید کہ پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔ کوہ منار سے گزر کر ہم نے ڈھلان پر گھوڑوں سے اتر کر آگ جلا کر بدن تپا۔ مقررہ نشانی کی آگ جلانے کا ابھی وقت نہیں تھا

مگر ٹھنڈ نے ہمیں عاجز کر دیا تھا..... اس پہاڑی اور کابل کے درمیان گھوڑوں کے گھنٹوں کے گھنٹوں تک برف تھی اور کنارے اتنے سخت و سخت بنے کہ بٹیا چھوڑ کر بھی نہیں چل سکتے تھے۔ صرف ایک کے پیچھے ایک سوار چل رہا تھا، بارے بلا اطلاع ہوئے کابل تک آ گئے اور قلعے کے اوپر آگ چمکتی دیکھ کر سمجھ گئے کہ ہمارے سردار انتظار کر رہے ہیں..... ان دنوں الگ بیک کے باغیچے میں ایک لنگر خانہ بنا ہوا تھا۔ درخت وغیرہ تو باقی نہیں رہے تھے۔ البتہ احاطے کی دیوار سلامت تھی۔ خان میرزا اسی میں مقیم تھا۔ میں ایک گھرے ہوئے راستے سے ادھر چلا۔ ابھی اس کے عقبی قبرستان تک گیا تھا کہ سامنے سے چار سوار واپس آئے۔ یہ باغیچے میں پہلے دوڑ گئے تھے۔ خان میرزا خوف زدہ ہو کے نکل گیا۔ ان چاروں نے تیر و تلوار کے زخم کھائے۔ جواب میں ہاتھ چلائے اور پسپا ہو کے میرے پاس آئے۔ یہاں ہمارے اور سوار بھی جمع ہو گئے۔ بھیڑ کی وجہ سے آگے جانا یا پیچھے پلٹنا محال ہو گیا۔ میں نے قریب والوں سے کہا۔ گھوڑوں سے اترو اور اندر گھس جاؤ۔ میرے کتاب دار محمد علی اور اس کے چند ساتھیوں نے فوراً حملہ کیا جس سے دشمن بھاگ نکلے۔ ہمارے قلعے کے آدمیوں نے پینچنے میں دیر لگائی۔ مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ واپسی میں دوست نامی پیادہ نے میں ترقی دے کر کابل میں چھوڑ گیا تھا، پل پر ملا۔ ننگی تلوار لے کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بلیہ (زرہ) پہن رکھا تھا لیکن سر پر دو بلند (فولادی خود) نہ تھا۔ شاید سردی اور برف باری نے میری صوت بدل دی تھی۔ اور یا گھبراہٹ کی وجہ سے اس نے مجھے نہ پہچانا۔ میں چلایا ”ہے دوست“ ہے دوست“ لیکن اس نے میرے کھلے بازو پر تلوار ماری۔ محض خدا کی رحمت سے میں بال بال بچ گیا۔

۱۔ یہاں سے ہم حسین میرزا دوغلات کی تلاش میں بہشت باغ گئے مگر وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا۔ باغ کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں سات آٹھ آدمی لڑنے کے لئے کھڑے تھے۔ میں نے گھوڑا ڈنپایا تو وہ پلٹ کر بھاگے۔ ایک کے میں نے جھپٹ کر تلوار ماری اور وہ اس طرح سر کے بل گرا کہ میں سمجھا اس کا سراڑ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خان میرزا کاکوک تھا اور میری تلوار اس کے شانے پر پڑی تھی۔

حسین میرزا کے مکان کے دروازے پر ایک مغل نے چھت کی کمین گاہ سے میرے چہرے کا نشانہ باندھ کر کمان کھینچی۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ پہلے میرا نوکر تھا۔ لوگ چلائے ”ہائیں“ ہائیں۔ بادشاہ۔ بادشاہ!“ اس نے شت بدل کر تیر پھینکا اور بھاگا۔ تیر مارنے کا

موقع بھی کیا تھا۔ میرزا اور اس کے سردار بھگا دیئے یا پکڑ لئے جا چکے تھے۔ ہمیں لوگ گلے میں رسی ڈال کر سلطان سبخر برلاس کو میرے پاس لائے۔ میں نے اسے بڑی جاگیر دی تھی۔ مگر یہ بھی بغاوت میں شریک ہو گیا وہ مضطربانہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ”میرا کیا قصور ہے۔ میرا کیا قصور ہے؟“ میں نے کہا ”تمہارا صاف قصور یہ ہے کہ اس ٹولی کی چشم پوشی سے تمہیں بری رہنا چاہئے تھا!“ مگر چونکہ وہ شاہ بیگم کا بھانجا تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا ”اسے ذلیل کر کے اس طرح کشاں کشاں نہ لاؤ۔ اسے موت کی سزا نہیں دی گئی ہے۔“

قلعہ کے ایک سردار کو تھوڑے سے عسکریوں کے ساتھ خان میرزا کی تلاش میں بھیج کر، خود میں شاہ بیگم اور مہر نگار (چغتائی) خانم سے ملنے چلا۔ وہ باغ بہشت میں ایک خیمے کے اندر ٹھہری ہوئی تھیں۔ شہر کے بلوائی چاروں طرف لوٹ مار مچاتے پھرتے تھے۔ میں نے اپنے آدمی بھیجے کہ ان شہدوں کو بھگا کر دفع کریں۔

شاہ بیگم اور خانم ایک ہی خیمے میں بیٹھی تھیں۔ میں حسب معمول فاصلے سے تعظیماً گھوڑے سے اتر ا اور اسی طرح ادب آداب سے ملا جیسے پہلے ملحوظ رکھتا تھا۔ باتیں کرنے لگا۔ مگر وہ بہت گھبرائی ہوئی، شرمندہ تھیں۔ مجھ سے انہوں نے خیر و عافیت تک نہ پوچھی اور نہ کوئی معقول عذر معذرت کر سکیں۔ (بغاوت کے سرغنہ کی یہ ثانی اور ماں یہ معقول حیلہ پیش کر سکتی تھیں کہ باہر کے ہرات میں قید کر لئے جانے کی خبر سن کر ہم نے ایک ممتاز تیموری شہزادہ کو نیاپا“ حکومت کابل سنبھالے رکھنے کی کوشش کرائی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ تیز عقل عورتیں اور باہر خوب سمجھتے تھے کہ واقعہ یہ نہ تھا) مجھے ان سے ایسی بے وفائی کی توقع نہ تھی۔ جو لوگ کھلے بندوں بغاوت پر اتر آئے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو شاہ بیگم اور خانم کی نصیحت پر کان نہ دھرتا۔ خان میرزا شاہ بیگم کا سگا نواسہ تھا اور روزانہ ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ بغاوت کے ساتھ نہ تھیں تو کم از کم اپنے آپ کو بالکل الگ رکھ سکتی تھیں۔ پہلے بھی جب تقدیر نے دو مرتبہ مجھے ملک و وطن، حکومت و لشکر سے محروم کیا، میں اور میری ماں ان سے مدد کے طالب ہوئے انہوں (شاہ بیگم) نے کوئی مہربانی ہم پر نہ کی۔ ایک کھیت اور بیلوں کی جوٹ تک عنایت نہ کی کہ اسی سے گزارہ کر لیتے۔ کیا میری ماں یونس خاں کی بیٹی نہ تھی؟ کیا میں اس کا نواسہ نہ تھا؟۔۔۔۔۔ (اس کے مقابلے میں) جب یہ معزز بیگم میرے پاس آئیں تو میں نے انہیں کابل کی ایک بڑی جاگیر مغان حوالے کی۔۔۔۔۔ یہ باتیں شکایت کے طور پر نہیں، محض اظہار حقیقت کے طور پر لکھی گئی ہے۔

ان سے اپنی مدح و ستائش کرنا بھی مقصود نہیں ہے، جو کچھ گزرا اس کا ٹھیک ٹھیک بیان ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر واقعے کی حقیقت معلوم ہو جائے اور صداقت سے اسے تحریر کر دیا جائے۔ اس سے اپنے یگانے اور بیگانے سبھی کا اچھا یا برا حال جو پیش آیا لکھ دیا گیا ہے۔ امید ہے پڑھنے والے یہ عذر قبول کریں گے اور مجھ پر سخت احتساب نہ فرمائیں گے۔“

ان کلمات کو پڑھنے سے پہلے ناظرین سوچتے ہوں گے کہ بابر نے اپنی عجیب ترک میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک یقین کے لائق ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر معاملے میں جو کچھ اس نے تحریر کیا وہ فی الواقع بے کم و کاست اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ یہاں اس نے ہمیں بتایا۔ جملہ واقعات جس طرح اسے یاد تھے (اور بے شبہ وہ نہایت عمدہ حافظہ رکھتا تھا) ٹھیک اسی طرح قلم بند کر دیئے ہیں۔ اپنے مختلف عزیزوں اور امیروں کی (مثلاً سمرقند کے سلطان علی کی) جو تصویریں اس کے قلم نے کھینچی ہیں، ان میں اپنی مخالفت کرنے والوں کی اکثر معاندانہ جھوکی ہے۔ تنہا وہ دشمن یعنی شیبانی خاں، جس سے وہ خائف تھا۔ اس کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔ نیز ایسے چند خفت آمیز واقعات کو، جیسے بہن (خانزادہ) کا اسی شیبانی کے حوالہ کر دینا، قلم اندازہ کر گیا ہے۔ بایں ہمہ خود اپنی تصویر، اچھی یا بری، سچی، ہو ہو اتاری ہے۔ اس قصد مصمم کی بدولت کہ ”جو کچھ گزرا اسے بے کم و کاست تحریر کروں گا۔“ واقعی ایک بے نظیر دستاویز تیار ہوئی، اور یہ ایک پوری زندگی کی داستان اس شخص کے قلم کی لکھی ہوئی جو سب سے بہتر اسے جان سکتا تھا اور اس کی جزئیات بیان کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ بابر اگر چاہتا تو خان میرزا کی ماں اور نانی سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھتا جس میں خود اس کی تعریف کا رنگ ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سالہا سال کے بعد یہی واقعہ حسین میرزا کے بیٹے حیدر میرزا دوغلات نے اپنی ”تاریخ رشیدی“ میں تحریر کیا ہے وہ زیادہ رنگین فارسی میں لکھتا اور بابر کو شہنشاہ (بادشاہ، مترجم) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ :

”بادشاہ حسب معمول تپاک سے ملا۔ بغیر تلخی یا ناگواری ظاہر کئے، بے تکلف خوشی خوشی سوتیلی نانی کے پاس آیا اگرچہ اس نے ترک محبت کی اور دوسرے نواسے کو بادشاہ بنایا تھا۔ شاہ بیگم گھبرا گئی اور اسے کچھ کہتے بن نہ آئی۔ بادشاہ جھک کر آداب بجا لایا اور فرزندانہ محبت سے گلے مل کر کہنے لگا۔ ”اگر ماں کی شفقت کسی دوسرے بچے پر زیادہ ہو تو

بھی ایک بچے کو برا ماننے کا حق نہیں ہے۔ ماں کا حق ہر حال میں اولاد پر قائم رہتا ہے۔“ پھر کہنے لگا ”مجھے تمام رات نیند نہیں آئی۔ طویل سفر کر کے چلا آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کے اپنا سر شاہ بیگم کی آغوش میں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں جیسے سونا چاہتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ بیگم کو ہر طرح مطمئن کر دے۔ ابھی مشکل سے آنکھ جھپکی ہو گی کہ اس کی خالہ مہرنگار بیگم آئی۔ بادشاہ فوراً اٹھا اور اس عزیز خالہ سے پورے تپاک سے گلے ملا۔ بیگم نے کہا ”تمہاری بیویاں اور گھر والے تمہیں دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ میں شکر ادا کرتی ہوں کہ خدا نے تم سے ملایا۔ اب تم اٹھو اور قلعے میں اپنے گھر والوں میں جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتی ہوں“ (اور واقع میں وہ بھی ایک خاص غرض سے وہاں جا رہی تھی)

پھر بادشاہ قلعے میں آیا۔ جملہ خدام اور امرا خدا کی رحمت و کرم پر شکرانہ بجا لائے اب شاہ بیگم خان چہرزا اور میرے باپ (حسین میرزا) کو بادشاہ کے سامنے لائی۔ وہ قریب آئے تو بادشاہ انہیں لینے آیا۔ بیگم نے کہا ”جان، مادر میں اپنے گنہگار بیٹے اور تمہارے بدنصیب بھائی کو لائی ہوں۔ ان کے حق میں نم کیا کہتے ہو؟“ بادشاہ نے میرے باپ کو دیکھا تو حسب عادت تعظیم سے یہ عجلت بغل گیر ہوا۔ مسکراتا اور خیر و عافیت وغیرہ پوچھتا رہا۔ پھر اسی طرح خان میرزا سے بغل گیر ہوا اور محبت و نگو خواہی کا ثبوت دینے میں کمی نہ کی۔ یہ جملہ مراسم نہایت نرمی سے ادا ہوئے، کسی ٹکنا، یا قنصع کا شائبہ تک ان میں نہیں آیا۔ لیکن بادشاہ عنایت و شرافت کے صیقل سے ان کی شرمندگی کے داغ مٹانے کی جتنی بھی کوشش کرتا تھا، وہ شرم کے داغ جو ان کے آئینہ اعمال پر لگے تھے، دور نہ ہو سکتے تھے۔ میرے باپ اور خان میرزا نے قدحار جانے کی اجازت مانگی۔ شاہ بیگم اور خانم کو بادشاہ نے منت سماجت کر کے اپنے پاس روک لیا۔“

باہر نے ان سازش کے دو سرغنوں کے متعلق نتلف کیفیت بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”حسین میرزا، مہرنگار بیگم (بہ تعجی مترجم) کے توشک خانے کی رضائیوں میں چھپا ہوا ملا اور اپنے کرتوت کی سزا میں ٹکڑے ٹکڑے کئے جانے کے قابل تھا مگر باہر کی نظر میں اس کا بڑا گناہ یہ ہے کہ (یہاں سے چھوٹ کر) شیبانی خاں کے پاس گیا اور اس سے باہر کی برائیاں کیں۔ خان میرزا، حسب تحریر باہر، پہاڑیوں کے نیچے پکڑا گیا اور ایسا بے حواس تھا کہ باہر کے سامنے آتے میں دو دفعہ لڑکھڑا کر گرا۔ اسے شربت دیا تو وہ بھی جب تک باہر نے خود نہ پیا، اس نے (زہر دیئے جانے کے خوف سے) نہیں پیا۔“

حقیقت یہ ہے کہ بابر کہ باطرح عالی حوصلہ تھا، اس موقع پر ان لوگوں کے ساتھ زیادہ تر اس لئے رحم و کرم سے پیش آیا کہ شاہ بیگم اور خانم کا پاس خاطر منظور تھا۔ جمائگیر کے بعد اس کے قریبی رشتہ دار بہت کم رہ گئے تھے۔ بہترین مصلحت اسی میں تھی کہ عدم موجودگی میں جو سازش کابل میں ہوئی اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ تاہم ان کنبے والوں کی غداری کا اسے دلی ملال ہوا۔

دورہ ہرات کا خاتمہ

اگرچہ ممکن ہے بابر نے سوتیلی نانی اور خالہ کو یہ غمال کے طور پر کابل میں رکھا ہو لیکن کوئی شک نہیں کہ قطع نظر اس سازش کے، وہ ان سے بڑی محبت کرتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ سازش کا سارا الزام ان دو رشتہ داروں کو دیتا ہے اور یہ بھی خوب جانتا ہے کہ انہیں شہ دینے والیاں یہ عورتیں تھیں، پھر بھی اپنی پریشانیوں کے سلسلے میں ان عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ یہ صرف آئین مرواگی نہیں بلکہ وہ سگی نانی (ایسان دولت بیگم) اور اپنی ماں کا غم نہیں بھولا تھا اور شاہ بیگم اور مہر نگار بیگم اس کے مختصر محل سرا میں ان مرنے والیوں کی خالی جگہ پر کرتی تھیں۔

ترک و مغول نسل کی بیوہ خواتین کا نوجوانوں میں بڑا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ وحشی مزاج چنگیز خانی تک ”التون ارک“ یعنی شاہی حرم سرا کی دایوں، نانیوں کا مشورہ مان لیتے تھے اس زمانے میں بھی جب کہ ایک عالم پر ان کی فرماں روائی تھی۔ شاہ بیگم اپنے رسوخ سے کام لیتا جانتی تھی۔ تھوڑے ہی دن میں اس نے اپنے بد نصیب نواسے خان میرزا کے لئے خاصا محفوظ منصب حاصل کر لیا۔ اس کی پر مغز دلیل یہ تھی کہ ”میرے بزرگوں نے تین ہزار برس بدخشاں میں بادشاہی کی۔ میں عورت ذات زمام حکومت ہاتھ میں نہیں لے سکتی، میرا نواسہ لے سکتا ہے۔ اس کا سلسلہ اولاد بدخشاں میں صاحب عزت و توقیر رہے گا۔“ چنانچہ یہ پہاڑی نشین (بدخشاں) انہیں دے دیا گیا۔ مگر مغلوں کی شکست میں حسین میرزا نے شیبانی سے نامہ و پیام کز کے اپنی تباہی اپنے ہاتھوں کرائی۔ یہی موقع تھا جب اس نے بابر کو آل تیمور کے شاہ دشمن شیبانی کے سامنے مطعون کیا مگر ازبک نے اسے بھی قتل کرا ڈالا۔ اس قتل پر بابر نے بے تامل یہ فقرہ جڑا کہ تقدیر نے اسے اپنی بد گوئی کی سزا دی۔

چند روز قلعہ کابل میں جشن اور جلے ہوتے رہے۔ نوجوان شہزادی معصومہ بیگم بدرتے کے ساتھ ہرات سے آئی۔ وہاں کے پر شکوہ دربار میں وہ بابر کو دیکھ کر شیدا ہو گئی تھی۔ بابر نے اسے عقد زوجیت میں لیا اگرچہ شادی سادگی سے ہوئی تاہم شاہ بیگم کی پروقار شرکت نے تقریب کو اس گھٹیا قلعے میں یادگار چیز بنا دیا۔ خود بابر معلوم ہوتا ہے بہت شاد ہوا۔ اسی موقع پر حسب معمول گشت لگاتے ہوئے۔ اس نے اپنے سواروں کو افغانوں پر جھپٹے دیکھا تو دور سے بھانگتوں پر تیر چلا چلا کر انہیں روکا۔ اسے بڑے مزے لے کر بیان کرتا ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ سواروں کو سرپٹ دوڑاتے میں روک لینا کچھ آسان نہیں ہے۔ اسی طرح لطف کے ساتھ ایک موٹے گور خر کو گھیر کر شکار کرنے کی کیفیت لکھی ہے اور بہ تفصیل کہ اس کی پسلیاں ایک گز سے زیادہ ناپیں۔

یہ عیش و نشاط تھوڑے دن میں ختم ہوئے۔ ہرات کی دلہن کی پہلی ہی زچگی میں موت واقع ہو گئی مگر مولود جو لڑکی تھی سلامت رہی۔ بابر کے حکم سے اسے بھی ماں کا نام معصومہ بیگم دیا گیا۔ اس نے اسی قدر بیان کیا ہے۔ لیکن اس نام کی یاد تازہ رکھنے ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس نوجوان بیوی کو کس قدر چاہتا تھا۔

مذکورہ بالا زچگی (بلکہ شادی) سے بھی پہلے، موسم بہار کو کونہیں پھوٹنے کے بعد جب راستے کھلے تو ہرات کے واقعہ ہائلہ کی خبر پہنچی۔ بظاہر بابر کا خود کوئی معقول فوج لے کر ہرات واپس جانا محال تھا۔ وہاں کے دعوتیں کھانے کھلانے والے شہزادوں نے بھی غالباً بلاوے کا کوئی پیام اسے نہیں بھیجا۔ صرف ایک آزمودہ کار سپاہی، یعنی قندھار کا حاکم فوج لے کے اپنے ہراتی سلاطین سے آملا اور انہیں مشورہ دیا کہ چھوٹا بھائی مظفر قلعے کو مورچہ بند کر کے یہاں رہے اور بڑا باہر کو ہستانی علاقوں میں گشت لگا کر قبائل سے جتنے جوان مل سکیں بھرتی کرے اور خوفناک ازبکوں کے ہرات کا محاصرہ کرنے میں رکاوٹ ڈالے۔ جیسا کہ بابر نے بعد میں لکھا، یہ بہت اچھا مشورہ تھا۔ لیکن تیموریوں کے آخری گڑھ کے شریک بادشاہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ جس وقت شیبانی پورے لشکر کے ساتھ ان کے خلاف بڑھا تو انہوں نے پھر اسی مرغاب ندی کے کنارے دل کشا چراگاہ میں خیمے ڈالے، جہاں بابر گذشتہ سال ان سے آکر ملاقات ہوا تھا۔ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ تھا اور بقول بابر ”نہ ہرات کو مستحکم کرنے پر متفق ہوئے نہ میدان میں لڑنے پر۔ بس خیمہ گاہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا ہے، بھروسہ کر لیا۔ خیالی خطبی

لوگ تھے اور اس طرح کام کر رہے تھے جیسے کوئی خواب میں ہو۔“

شیبانی کے چالیس ہزار ازبکوں نے اس خواب کو بہت جلد باطل کر دیا۔ جب وہ ان بھائیوں کے پڑاؤ کے مقابل پہنچا تو بہادر والئی قدہار کے سوا کوئی سامنے نہ ٹھیرا۔ یہ بہادر سردار اپنے چند صد جنگ آزماؤں کے ساتھ ہمیں کھیت رہا۔ رہے اصلی حریف، یعنی مظفر و بدیع الزمان تو ”وہ فقط بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنی ماں، بہن، جو رو بچوں تک کو ازبکوں کا اسیر بننے کے لئے چھوڑ گئے۔“ مظفر کا تو پھر پتا نہیں چلا۔ بدیع الزمان نے خراسان سے نکل کر ایران کی پناہ لی۔ ان کا مال اسباب اہل و عیال ایک پہاڑی قلعے میں تھے۔ اسے جملہ غنائم کے ساتھ لینے میں ازبکوں کو دو ہفتے لگے۔ شہر آفاق ہرات پر قبضہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے شیبانی نے غنہ و کرم سے کام لیا۔ مظفر میرزا کی ایک بیوی کو اپنے حوالہ عقد میں لے آیا مگر کوئی قتل عام یا غارت گری شہر میں نہ ہونے دی بلکہ جو اہل علم وہیں رہ گئے تھے، اور خواندہ میر مورخ ان میں شامل ہے، ان کی حفاظت کی بلکہ ان کی صحبت سے مستفید ہوا۔ جلا وطن ظریف شاعر بنائی بھی اس کے پاس رہا۔ لیکن بابر جسے ان واقعات کا سخت رنج تھا، اس روادارانہ قبضے کو بھی تعصب کی عینک سے دیکھتا ہے :-

”شیبانی نہ صرف شہزادوں کے اہل و عیال بلکہ سبھی کے ساتھ بری طرح پیش آیا ایک شہزادی کو بطور مال غنیمت اپنے بخشی کو دے دیا۔ سارے شعرا پر آئندہ بنائی کا تسلط قائم کرایا (جس نے ضرور شاعرانہ انتقام لیا ہو گا)۔ ہر چند ان پڑھ تھا مگر تفسیر قرآن میں ہرات کے دو مشہور عالموں کو سبق سکھانے کی جسارت کی۔ (۳۷) قلم لے کر مشہد کے ملا کی خوش نویسی (قطعات۔ مترجم) میں اور ہزار کی تصاویر میں اصلاح کی! بے مزہ شعر لکھے اور چوک کی مسجد میں منبر پر چڑھ کر پڑھے کہ لوگ داد دیں۔ وہ فجر کے وقت اٹھتا اور پانچ وقت کی نماز کا پابند، نیز قرآن کی قرات پڑھنے میں خاصا کمال رکھتا تھا، بایں ہمہ ایسی لغو اور (بہ تصحیح مترجم) بے ادبی کی حرکتیں اس سے سرزد ہوئیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ ازبک سردار اعظم نہایت دین دار اور اپنے سنت و الجماعت عقائد میں پختہ تھا۔ آل تیور کو جو اس کے ہاتھ پڑا، بے شبہ اس نے قتل کرایا۔ ورنہ وہ رحم دل آدمی تھا۔ اس کے راسخ العقیدہ سنی ہونے ہی کے باعث ہم دیکھیں گے کہ آئندہ تقدیر کی ستم ظریفی نے بابر کو سخت پریشانی میں ڈالا۔ دوسرے، ایسی کسی کمزوری یا عیب کی وجہ سے نہیں، بلکہ فی الواقع شیبانی خاں کی غیر معمولی قابلیت، تنظیم، سلطنت کی بے باک حوصلہ

مندى وہ اوصاف تھے جن سے بابر اتنا خائف تھا کہ اور کسی سے اتنا خائف نہ تھا۔ تیمور کے خانوادے میں وہی آخری فعال شہزادہ رہ گیا تھا اور اس سے اپنے سخت خطرے میں ہونے کی حقیقت کو وہ خوب سمجھتا تھا۔

۱۵۰۷ء کے وسط گرما میں کچھ مدت اسے شیبانی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ازبکوں کا سیلاب ایران کی جانب پھیلتا معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ مشہد میں جمع ہو رہے تھے۔ لیکن خود شیبانی جنوب کی طرف حرکت میں تھا۔ اس نے یہ غلطی نہیں کی کہ پہاڑوں کے دشوار گزار دروں سے جس طرح ہو سکے گزر کر کابل کا راستہ لیتا۔ جیسی پچھلے جاڑوں میں بابر نے کی تھی۔ بلکہ اس نے وادی کی شاہراہوں سے قندہار کا رخ کیا۔

بے حساب اموال

بابر کو سازشیوں کے جال دکھائی نہ دیتے تھے اور دوسری طرف اتفاقی اسباب نے بھی اسے قندہار کی جانب کھینچنا شروع کیا۔ دراصل وہ اس قسم کی ترنگ میں آیا ہوا تھا۔ جس کے بعد اکثر ٹھوکر کھانی نصیب ہوئی۔ ہرات کے شکست خوردہ لشکر کے بہت سے فراری معصومہ بیگم کے ہم رکاب آئے اور بابر کے لشکر میں بھرتی ہو گئے۔ اور جنگ آزماؤں نے بھی جنہیں ازبکوں کے بوہتے ہوئے تسلط سے بچنے میں کسی سردھرے کی تلاش تھی اس کے اردو کا رخ کیا۔ جیسے پہلے خسرو شاہ کی ولایت میں ہوا تھا، یہاں بھی بہت سے لوگ مایوس ہو کر از خود اسی کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ اس عرصے میں وہ اعلیٰ درجے کا سردار مشہور ہو چکا تھا کہ اپنے آدمیوں کی خبرگیری کرتا ہے۔ رعایا کو مزروعہ اراضی جیسی کچھ بھی ”ارض قاتل“ میں میسر ہو، عنایت کرتا ہے۔ اپنی ذات کے واسطے بہت کم چاہتا ہے۔ کھوہ میں پناہ لینے کی بجائے رفیقوں کے ساتھ طوفان برف و باد میں باہر بیٹھ کر ٹھہرتا رہتا ہے۔ اس کی جواں مردی اور فیاضی پہلے سے معلوم تھی۔ خصوصاً سپاہیوں کے ساتھ۔ اور اس کی اقبال مندی کا بھی لوگ اعتقاد رکھتے تھے۔ نئی فوج میں ترخان، مغول، نیز ”اردوس“ (روسی) نام سنے جا رہے تھے۔ اس معجون مرکب کو گرمیوں میں فوجی تربیت دیتا ہوا خوشی خوشی قندہار کو چل پڑا۔

قندہار، ہرات کے سلطان حسین میرزا با۔قرا کی سلطنت کی ایک ولایت تھا۔ اس کا آخری والی، جیسا کہ بیان ہوا، ازبکوں کی جنگ میں مارا گیا۔ شہر کابل کی پہاڑی حدود کے

جنوب میں رود ہلمند کے کنارے ہندوستان اور مغرب کی کاروانی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کے برج و بارہ اچھے نہ تھے۔ مگر اس کے راستوں پر عرب، ہندی، یہودی سوداگروں کے قافلے برابر چلتے رہتے اور ہندوستان کی قیمتی اجناس۔ نیل، مصالحے۔ شکر، ہاتھی دانت، جواہرات وغیرہ لاتے تھے۔ رئیسوں، بادشاہوں کی باہمی لڑائیوں میں بھی ان قافلوں کو کوئی نہ ستاتا تھا۔ ایک غیر مکتوبہ قانون، پھر شریعت اسلامی کا قطعی قانون ملکیت ان کی حفاظت کا ضامن تھا۔ باہر نے بھی اپنے اہل لشکر کو ایسا قافلہ لوٹنے سے روک دیا اگرچہ سوداگروں سے ایک عشر لے لیا تھا۔ ازبکوں کی طغیانی میں بہت سے فاصلے ہرات یا مشہد نہیں جاسکے اور زیر نظر زمانے میں قدھار کے آس پاس پلٹ آئے تھے۔ مجموعی طور پر شہر سونے کی چڑیا نظر آتا تھا۔

قدھار پر وقت کے وقت شاہ بیگ ارغون اور مقیم جسے باہر نے کابل سے نکالا، متصرف ہو گئے تھے (۳۸) باہر نے باور کر لیا کہ ارغون بھائی اس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں اور حسب معمول شتاب کاری سے ایک دم چل پڑا کہ ان سے مل کر ازبکوں کے مقابلے کی تیاری کی جائے۔ لیکن حقیقت میں انہوں نے ہرات کے فاتح کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ باہر نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو ارغونوں نے کورا جواب دیا اور وہ بھی اس طرح گویا کسی ماتحت کی عرضی کا جواب ہو۔ بر آشفته ہو کر باہر نے کوچ کی رفتار تیز کی۔ اتنے میں ہراول کے سردار نے مطلع کیا کہ ارغونوں کے پاس فوج کی تعداد کہیں زیادہ ہے وہ راستہ روک کر جنگ کے لئے صف بستہ ہیں۔

اس کے بعد باہر کا ایک اور بے تحاشا معرکہ ہوا۔ اس کے سپاہی سخت منزل چل کر آئے اور آدھے کے قریب غلہ، بھیڑ بکری، نیز پانی لینے منتشر ہو گئے تھے۔ مگر ایک ہزار سوار جو گرد تھے وہ انہی کو لے کر قدھار کی صفوں پر بڑھا۔ اس مرتبہ اس کے سپاہی دس دس، پندرہ پندرہ کے پیوستہ جوقوں میں مرتب اور آزمودہ کار سرداروں کی قیادت میں تھے جنہیں معلوم تھا کہ کس طرح لڑنا ہے، علاوہ ازیں اب کے باہر نے بھی مغلوں کی جنگی چال سے کام لیا کہ دائیں بازو کو بہت آگے بڑھا کے اس طرح گھمایا کہ دشمن اس کی پلٹ میں آ گیا۔ لڑائی جم کر ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ یہ تیز پا دائیں بازو والے ارغون کے قلب لشکر میں گھستے چلے آئے اور وہ بکھر کر شہر کی طرف پسا ہوا۔ باہر نے اس موقع پر (بہ تصحیح مترجم) مشہور آیہ کریمہ ”کم من لفتہ، قليلته، غلبت لفتہ، کثیرہ بلخن اللہ“ نقل کی ہے لیکن

قدھار کی یہ جنگ اس نظم کی بدولت جو اس نے نافذ کیا اور بہ حیثیت سپہ سالار اس کی مہارت سے حاصل ہوئی۔ فتح کا ثمر بھی ایسا ملا کہ دیکھا کیجئے۔ اس دولت مند تجارتی شہر کے خزانوں میں بے شمار چاندی کے سکے بھرے تھے انہیں یورپوں میں بھر بھر کر گدھوں اور اونٹوں پر لادا گیا۔ بابر نے مزا لے کر لکھا ہے کہ وہ لڑتا ہوا مقیم کے خزانے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک عزیز پہلے سے وہاں گھوڑے سے کود کر گھس رہا ہے۔ بازاروں، منڈیوں سے قیمتی سامان الگ ہاتھ آیا۔ بابر بالا دوی کے لئے چلا گیا تھا۔ شہر کے دروازے کے باہر سبزہ زار میں پڑاؤ تھا۔ واپسی پر اس کی ہیئت بدل جانے کی کیفیت تحریر کرتا ہے کہ ”میں ذرا دیر سے فرودگاہ میں داخل ہوا تو لشکر گاہ کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ ہر طرف اچھے اچھے گھوڑوں کی قطاریں اونٹ اور خچر لدے پھندے کھڑے تھے۔ بیش قیمت خیمے، شامیانے فرش فروش کے ڈھیر لگے تھے (ارغونوں کے) خزانے سے پارچے کے گٹھے اور چاندی کے سکوں کے بھرے ہوئے تھیلے کثرت سے ملے۔ ہمارے ہر آدمی کے ڈیرے میں خود اس کا حاصل کردہ مال غنیمت تھا۔ بہت سی بھیڑ بکریاں لائی گئی تھیں مگر ان کی طرف کسی کو توجہ نہ تھی۔“

مالا مال ہو جانے والا پڑاؤ جلد ہی اٹھا لیا گیا۔ قاسم بیگ کے اگرچہ پیشانی پر زخم آیا تھا، مگر بابر پر اس نے زور دیا کہ فوراً کابل واپس چلو۔ اس نے حجت کی کہ شکست خوردہ جوق نواحی علاقے میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور ازبک بھی اب زیادہ دور نہ ہوں گے۔ ہمیں کابل کے کوہستانی حصار کی پناہ لینے میں ہرگز تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ غنیمت ہے کہ وفادار قاسم بیگ کی عرض معروض بابر نے مان لی۔ لکھتا ہے کہ ”اموال و خزانے کے بھاری بوجھ لے کر عزت و نام آوری کے ساتھ ہم واپس روانہ ہوئے۔ ان کلمات میں رجائیت کا دخل کم تھا۔ قدھار کی حکومت کے لئے ناصر میرزا کو مقرر کیا گیا کہ اس سے بدتر انتخاب دوسرا نہ ہو سکتا تھا۔ حالانکہ بابر کا یہ علاقائی چھوٹا بھائی محفوظ اور تالیف قلوب کئے ہوئے بدخشاں کو بھی نہ سنبھال سکا تھا۔ چند ہی روز میں اور کابل کے راستے ہی میں یہ تشویش ناک خبر ملی کہ شیبانی نے آکر قدھار کو گھیر لیا ہے۔ اس وقت قاسم بیگ کے انتباہ کا بابر دوبارہ شکر گزار ہوا۔

کابل پہنچتے ہی اعیان و امرا کی مجلس مشاورۃ طلب کی گئی کہ اب کیا کیا جائے؟ قاسم بیگ کی رائے تھی کہ کابل کے مورچے ناقص اور ایک میدان میں وہ سب سے الگ واقع ہے اس کی مدافعت نہ ہو سکے گی۔ ہمیں بدخشاں کے پہاڑوں میں ہٹ جانا چاہئے۔ بابر کو

اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ صورت حال کو اس نے زبانی یا کم سے کم اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ”ہمارے دشمن اور اغیار ازبکوں کا امیر تیمور کی اولاد کے جملہ ممالک پر اب قبضہ ہو چکا ہے۔ ترک و مغول (چغتائی) قبائل جو ادھر ادھر بعید گوشوں میں ہیں، وہ بھی طوعاً و کرہاً ازبکوں سے مل گئے ہیں۔ میں تنہا کابل میں رہ گیا ہوں اور ایسے طاقتور دشمن کے مقابلے میں اتنا کمزور ہوں کہ نہ صلح کی شرائط (حسب مراد) طے کرانے کی گفتگو کے ذرائع رکھتا ہوں اور نہ اتنی جمعیت کہ جم کر لڑ سکوں۔ ایسی طاقت سے بچنے کے واسطے لامحالہ کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہئے کہ ہمارے اور ایسے قوی دشمن کے درمیان کافی فاصلہ حاصل ہو جائے۔ ایسی جگہ بدخشاں اور ہندوستان نظر آتے ہیں۔ انہی دو میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا ہو گا۔“

بابر کی اپنی مرضی ہندوستان جانے کی تھی۔ صورت حال کی جو کیفیت اس نے لکھی وہ بالکل درست تھی۔ مگر ہندوستان کی رائے دینے سے پتا چلتا ہے کہ دس برس میں بابر کتنا بدل گیا تھا۔ کیونکہ پہلے وہ غالباً اسی کو ترجیح دیتا کہ پہاڑوں میں پناہ لے کر موقع کی تاک میں رہے اور جب وقت آئے حملہ کر کے پانسہ پلٹ دے۔ قاسم بیگ کا مشورہ یہی تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس لمحے کابل میں بابر پر شیبانی کا خوف غالب آگیا اور شاید عمر بھر میں یہی ایک موقع تھا جب کہ خوف نے اسے بے تحاشا بھاگنے پر آمادہ کیا۔ مزید خرابی یہ سمجھے کہ اس نے ولایت بدخشاں خان میرزا جیسے بے اعتبار آدمی اور اس کی سازش پسند نانی کے اور خود شر کابل ایک دوسرے عزیز (عم زاد) عبدالرزاق کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ عزیز تھا جو مقیم ارغون کے خزانے پر دوڑ کر اس سے پہلے جا پہنچا تھا۔

ان غلط فیصلوں کا بہت جلد بابر کو خیا زہ بھگتنا پڑا۔ خیبر کی تنگ گھاٹی میں دریا کے کناروں پر جو افغانی قبائل تھے، وہ اس کے مارا مار کوچ کرنے کو سمجھے کہ کابل چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ بدقسمت باقی (چغتائی) پر جو افتاد پڑی تھی، اسی طرح بابر کے لشکروں پر پڑی کہ افغانی لیٹیروں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح لشکر پر جھپٹنا شروع کیا۔ سردیاں سر پر آ رہی تھیں اور اس مختصر فوج کے پاس سامان رسد کی کمی تھی۔ سپاہیوں کو خواہی نخواہی چھاپے مار کر قبائلی بستیوں سے غلہ حاصل کرنا پڑا۔ بابر سچائی سے اقرار کرتا ہے کہ ”ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کدھر جائیں گے، کہاں ٹھہریں گے اور پڑاؤ لگائیں گے بس اوپر نیچے کوچ کر رہے تھے اور نئے نئے مقامات پر خیمے ڈال کر منزل کرتے تھے۔ کان خبروں پر لگے ہوئے

تھے۔

ہندوستان کے گرم میدانوں تک پہنچنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس درے میں جسے پناہ گزینوں نے ”باد تپج“ کا نام دیا، سردی سے ٹھہر گئے۔ ایسی قریب قریب مایوسی کی حالت میں بھی بابر کی ہمت افسردہ نہ ہوئی۔ شاید جنگ چپاولی کی یاد تازہ ہو گئی اور یہ خیال کہ اس سے بھی بدتر زمانہ دیکھ چکا ہے۔

اسی اثنا میں افغانستان کی جنوب مغربی پہاڑیوں سے جو خبریں آئیں، وہ خوش آئند تھیں۔ شیبانی خاں (بہ تصحیح مترجم) کابل ایک طرف، قندھار کے محاصرے سے بھی دست بردار ہو گیا۔ اس کے وسیع الحدود شمالی علاقوں میں ازبکوں کی ایک بغاوت سے خود اس کے اہل و عیال نفعے میں پڑ گئے تھے، اسے ہمارے شیر کی زمین چھوڑ کر ادھر ہٹنا پڑا۔ بابر کا اس اطلاع سے عجیب تاثر یہ ہوا کہ سارا خوف زائل اور اپنی مملکت کی، اگرچہ چھوٹی سی ہو، سلامتی کا اطمینان ہوتے ہی ایک نیا خیال سوچا جس میں تازہ امیدوں کے ساتھ دشمن کو چڑانے کا بھی پہلو تھا۔ لکھتا ہے ”میں نے حکم دیا کہ آئندہ لوگ مجھے ”پادشاہ“ کے لقب سے یاد کریں۔“ یہ لفظ یورپ والوں کے ”ایمپیر“ کے مشابہ ہے یعنی شاہنشاہ، اگرچہ اس میں وہ معنویت نہیں ہے۔ بہر حال کسی تیوری فرماں روانے اسے اپنے لئے نہیں استعمال کیا تھا۔ ان سے بہت پہلے ایشیا کے بڑے خان اسے اپنے القاب میں شامل کر لیتے تھے۔ اس میں دوسرے فرماں رواؤں پر حکمرانی کرنے کا پہلو نکلتا ہے حالانکہ اس وقت بابر ایسی قوت و سلطنت نہ رکھتا تھا۔ واقعاً کوئی ”پادشاہ“ تھا تو فتمند شیبانی خاں اور شاید اسی سے دعویٰ ہمہ سرت جتانے کے لئے بابر نے اسے اختیار کیا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو بھی اسباب سوچے ہوں، آئندہ برابر اس لقب پر قائم رہا۔ انہی دنوں کابل میں اس کے ہاں فرزند پیدا ہوا۔ یہ بچی فال نیک تھی۔ لکھتا ہے ”اس کا نام ہمایوں (مبارک) رکھا گیا۔ ولادت کے چوتھے یا پانچویں دن اس خوشی کا جشن منانے میں چار باغ میں آگیا۔ وہیں چھوٹے بڑے امرا نے نذریں گزاریں۔ چاندی کے اتنے سکوں کا ڈھیر جمع ہو گیا کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جشن بڑی دھوم دھام سے ہوا۔“

(انگلستان کے) رچرڈ کی طرح پھر بابر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

”میں آہنی دروازے تک گیا تھا“

کوہستان میں بہار آگئی تھی۔ خاقانہ ”خواجه سیاراں“ کے آس پاس پھول کھل رہے

تھے۔ قلعے کے شمالی درپچوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آنے لگی تھیں۔ ہمایوں اور اس کی ماں ماہم دونوں زچگی میں بنجر و سلامت رہے۔ سال نو آنے والا تھا۔ ادھر نیا خزانہ دار مقرر ہوا جس کی نگرانی کی بدولت پہلی مرتبہ کابل کا خزانہ معمور تھا۔ غرض خود ساز پادشاہ کو ہر طرف ہر اہی ہر ا نظر آتا تھا اور کوئی بدفالی کی بات سنی نہ چاہتا تھا۔ حقیقت میں ہمارے لئے آج ساڑھے چار سو برس بعد ان خطرات کو دیکھنا آسان ہے جن میں بابر گھرا ہوا تھا۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ جب کابل سے مارا مار روانہ ہوا تو اپنی جبلی فیاضی سے بابر نے کابل کی حکومت عبدالرزاق کے سپرد کر دی تھی جو اس کے رشتے کے چچا اور سابق والئی کابل الغ بیگ کا بیٹا تھا۔ الغ بیگ کی حکومت میں سخت اہتری رہی مگر بہر حال وہ فرماں روا اور اس کا فرزند وراثت کابل کا جائز حق دار تھا۔ قندھار میں بابر نے عین وقت پر پہنچ کر عبدالرزاق کو بھرپور خزانے سے محروم کیا اور صرف ”کسی قدر اسے دے دیا۔ علی ہذا اب خطاب پادشاہ کے ساتھ کابل آکر اس شہر کی حکومت عبدالرزاق سے واپس لے لی۔ انہی وجوہ سے عبدالرزاق نے بے پروا بابر کو نکال باہر کرنے کی سازش پکائی مگر بڑی حزم و احتیاط سے یہ کام کیا۔

بابر کی قلیل سپاہ میں دو ہزار کے قریب مغول کا گروہ تھا جسے عبدالرزاق نے اپنا آلہ کار بننے کے قابل پایا۔ واضح رہے کہ بابر نے فوج کو سختی سے نظم و ضبط کا پابند بنایا تھا اور وہ سپاہیوں کو لوٹ مار کی مطلق اجازت نہ دیتا تھا۔ اہل فوج کو لوٹ مار پسند تھی، خصوصاً تاثریت یافتہ مغلوں کو جنہوں نے مال دار غاصب خسرو شاہ کی ملازمت میں شریک ہونے کے وقت سے اپنا الگ جتھا بنایا اور وہ ابھی تک قائم تھا۔ خان میرزا کی ناکام بغاوت میں بھی اکثر مغل شامل ہو گئے تھے۔ اب ان کے کانوں میں پھر پھونکا جانے لگا کہ عبدالرزاق پادشاہ ہو گیا تو بھرپور خزانے کی تہلیوں کے منہ پھر کھل جائیں گے، بابر کے سخت ضوابط کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اور قندھار سے لے کر بدخشاں تک سارے ممالک سے محاصل وصول کئے جائیں گے۔ فوج کی چھاؤنی شہر کے باہر تھی۔ مغلوں کے سوا دوسرے سپاہی اکثر شہر کے گلی کوچوں میں اہل و عیال میں یا ادھر ادھر منتشر تھے۔ پھر خود بابر ایک افغانی قبیلے کی تادیب نیز رسد رسانی کی تاخت کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اس موقع پر جو کچھ پیش آیا وہ اسی کی زبان سے سنئے :-

”اس بہار میں مہمند افغانوں کی ایک (بہ تصحیح مترجم) بستی پر تاخت کی گئی۔ واپس

آنے کے چند روز بعد معلوم ہوا کہ چند سردار بھاگ جانے کی سوچ رہے ہیں۔ ایک مضبوط جمعیت انہیں پکڑ لانے کے لئے بھیجی گئی اور اس نے انہیں استرغ کے آگے جالیا۔ ان فراریوں کی باغیانہ باتیں جمانگیر میرزا کی زندگی میں سنی گئی تھیں۔ حکم دیا کہ انہیں بازار کے دروازے پر قتل کر دیا جائے۔ وہ رسیوں میں باندھ کر وہاں لے جائے گئے اور سولی پر چڑھائے جانے والے تھے کہ قاسم بیگ نے خلیفہ کو بھیج کر التجا کی کہ ان کی خطا معاف کر دی جائے۔ (خلیفہ نے گذشتہ سال قلعہ کابل کی دفاع میں حصہ لیا اور بابر کی ایک رضاعی بہن سے اس کی شادی ہوئی تھی) قاسم بیگ کی خاطر سے میں نے جان بخشی کر دی مگر انہیں قید میں رکھا۔

اب خسرو شاہ کے (سابق) سپاہیوں اور مغل سرداروں نے ترکمان سے ساز باز کی۔ ان کا سرغنہ سیوندوک تھا۔ (قدھار کے معرکے میں یہ بابر کی طرف سے بہادری سے لڑا تھا) پھر ان سب نے مجھ سے بدخواہی پر کمر باندھی۔ یہ لوگ سنگ تورغان کے مرغزار میں تھے۔ عبدالرزاق دوسری طرف سے افغانی بستی میں آ گیا تھا۔

چند روز پہلے محب علی قوری نے خلیفہ اور ملا بابا سے ان لوگوں کی ملی بھگت کا دو ایک دفعہ ذکر کیا اور انہوں نے مجھ سے اشارۃً کہہ دیا تھا لیکن یقین کے لائق بات نہ تھی۔ میں نے کچھ توجہ نہ کی۔ اب ایک رات چار باغ کی بارہ دری میں بیٹھا تھا کہ موسیٰ خواجہ اور ایک اور آدمی جلدی جلدی میرے پاس آئے اور کان میں کہا کہ ”واقع میں مغل بغاوت کرنے والے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کہ عبدالرزاق میرزا بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے یا نہیں۔ لیکن آج رات کو وہ بغاوت کا آغاز نہیں کریں گے۔“

”پھر بھی میں ٹال گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے زنان خانے کی طرف جو خلوت باغ میں تھا، چلا اور اپنے آدمی (مفسدوں کی ٹولی کے پاس) روانہ کئے لیکن وہ راستے سے لوٹا دیئے گئے اور پہنچ نہ سکے۔ تب میں خود محل سرا کے داروغہ (بہ تصحیح مترجم) غلام سرور کو لے کر خندق کے راستے شہر کی جانب گیا۔ آہنی دروازے تک گیا تھا کہ بازار کی گلی سے خواجہ محمد علی (ہایوں کی ماں ماہم کا بھائی) آتا ہوا ملا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ حمام کی ڈیوڑھی کے قریب

.....

یہاں پہنچ کر ترک کا سلسلہ دوبارہ یکایک ٹوٹ گیا ہے اور پورے گیارہ سال تک کوئی حال لکھا ہوا نہیں ملتا۔ جہاں تک معلوم ہے کسی مخطوطے میں، اصلی ہو یا جعلی، اس خلا کو

بھرا نہیں گیا۔ البتہ دوسرے مورخ، خصوصاً نوجوان میرزا حیدر دوغلات ۱۵۰۸ء کے اس فساد کاہل کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں واضح ہو کہ میرزا حیدر دوسرے سال کاہل پہنچا تھا۔ اس کی عمر گیارہ برس کی تھی مگر اس نے ضرور یعنی شاہدوں سے فساد کے حالات سن کر محفوظ رکھے ہوں گے۔

القصہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر جو حسب عادت بے پروائی سے بغیر مسلح پاسبانوں کے عاجلانہ شہر کے اندر آیا، قریب تھا کہ آہنی دروازے کے اندر گرفتار ہو جائے، مگر کسی طرح بچ کر نکل گیا۔ تاہم اس کو دیکھ کر باغیوں نے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ کرنا ہے فوراً کر گزریں۔ شورش گلی کوچوں میں اتنی پھیل چکی تھی کہ وہ اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ ادھر چھاؤنی کے بازار کو جا کے دیکھا تو وہ لٹ رہا تھا اور وہاں کے جوان مضطربانہ، بغیر کسی سردار و حاکم کے ادھر ادھر منتشر ہو رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باغی مغلوں سے لڑیں یا ان کے ساتھ ہو جائیں۔ بچ کر نکلیں یا شہر میں جا کر بال بچوں کی خبر لیں۔ اس پر آگندہ نفری سے بابر نے پانسو وفادار سپاہیوں کو فراہم کر لیا۔ اگلے دن دوسرے امرا اور سردار آ ملے۔ بظاہر بیرونی چھاؤنی پر بابر کے حامی قابض رہے اور باغیوں کے ہر اقدام کا جواب دیا۔ اب میرزا عبدالرزاق علانیہ بغاوت کا سرغنہ بن کر سامنے آیا اور پتا چلا کہ اس تحریک کے اکسانے میں شکست خوردہ ارغونوں کا حصہ تھا، جو اب دوبارہ قندھار کے حاکم ہو گئے تھے۔

ایک روز وفاداروں کی قلیل جمعیت باغیوں کی پوری فوج کے سامنے صف آرا ہوئی۔ حیدر میرزا لکھتا ہے کہ یہ بابر بادشاہ کے سب سے بڑے معرکوں میں ایک معرکہ تھا جس میں بابر نے عبدالرزاق کو لٹکارا کہ آئے اور تنہا اس کے ساتھ لڑے۔ اس کے محتاط حریف نے انکار کیا اور خود لڑنے نہیں نکلا البتہ باغیوں میں سے پانچ جنگ آزما الگ الگ لڑنے آئے اور بابر نے اس کرشمہ خیز جنگ یک کی میں پانچوں کو مار گرایا یا گھوڑے پر سے گرا لیا۔ ہر چند یہ روایت بعد کا افسانہ شجاعت معلوم ہوتی ہے لیکن حیدر میرزا نے پانچوں مغلوب ہونے والے مبارزین کے نام تحریر کئے ہیں۔ بابر کا ٹیلا پن اور دست بدست جنگ میں صفائی سے اپنے کو بچا لینے کا ہنر بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ ادھر حریفوں کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف اقوام کے نمائندہ تھے اور قیاس کتا ہے کہ ایسی سراسیمگی میں کہ کچھ بنائے نہ بنتی تھی، ہر گروہ نے ایک ایک شہسوار چن کر مقابلے میں بھیجا تھا۔ جملہ قرائن کے

پیش نظر ہم حیدر میرزا کی روایت کو قبول کر سکتے ہیں۔

بابر کا اس طرح جان پر کھیل کر ڈٹ جانا بے اثر نہ رہا۔ اخلاقی طور پر عبدالرزاق میرزا بازی ہار گیا تھا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ پکڑ لیا گیا۔ لیکن حیدر میرزا یقین دلاتا ہے کہ ”اس کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لیا اور رہا کر دیا گیا۔“

وقائع سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرمیوں کے ختم تک کابل میں امن و امان قائم ہو گیا۔ یہی ایام تھے جن میں فتح مند شیبانی خاں نے اپنے ممالک میں نسل تیمور کا بالکل استیصال کر دینے کی ٹھانی۔ اسی تطہیر میں حسین میرزا دوغلات قتل کیا گیا۔ صرف چند لڑکے جن میں حیدر میرزا بھی تھا، بدخشاں کے برفانی پہاڑوں سے گزر کر کابل، دربار بابر کی پناہ میں آ گئے۔ پھر یہی زمانہ ہے جب کہ بادشاہ کا لقب خود چسپاں کر لینے والے بابر کی حکومت کا بیرونی ملکوں کے معاملات میں نام آنا شروع ہوا۔ مغربی ایشیا کے وسیع تر مجادلات کی تشکیل دربار کابل کے گرد ہونے لگی، ایک نیا خانوادہ شاہی ظہور میں آیا اور بابر پر شیبانی کے پستی مارنے کی کوششیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ واقعی یہ تقدیر کا عجیب کرشمہ اور پہلا موقع تھا کہ بابر جو کابل کے کوبستانوں کے غلاف میں دھکا بیٹھا تھا، اسے ان واقعات نے نفع پہنچایا جو خود اس کی دسترس سے باہر تھے۔

باب پنجم

بابر کی جدال اپنی رعایا سے

نیم تاریک بھول بھلیاں (۴۹)

سچا تصوف بند آنکھوں والی سادگی سے آتا ہے۔ سینٹ فرانس کا عشق، سینٹ ٹریسا کی وارفتگی میں کوئی ذہنی نلش نہ تھی۔ یتیم پیغمبر اسلام (صلعم) کا رات کے اندھیرے میں آسمان پر روشنی دیکھ کر شیفتہ ہو جانا بہت سادہ واقعہ تھا۔ ظلمیت میں نور۔۔۔۔۔ ایک تنہا جان اور اس کا واحد خدا۔

لیکن الفاظ، خیالات لاتے ہیں اور اشارات، افکار کی شرح سناتے ہیں۔ پس روحانی عقائد یا تصوف کا بیان کرنا ایک دلکش معمّا بن سکتا ہے۔ ایشیا کے بزرگ صوفیہ میں رومی لکھ سکتا ہے کہ ”عشق آسمان کے نورانی دروازے سے خدا دے رہا ہے۔“ عمر خیام سنانا ہے کہ ”میں وہ شاہیں ہوں جسے آسمان پر چھوڑا گیا ہے کہ قضا و قدر کی لوح کو جھپٹ لاؤں“ اور حافظ خود اپنے فکر کی پیروی میں پکارتا ہے کہ ”اس بلند نگاہ باز کا آشیانہ عشق ہے۔ خدائے عرش کے کنگوروں سے اسے واپس آنے کی صغیر سنائی دیتی ہے۔“

ان شعرا نے اپنے معقّدین کے افکار کی رہنمائی اس وقت شروع کی جب کہ کئی کئی نیم تاریک راہیں ایک دوسرے کو کانتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر شیعہ یا تفریق پسند لوگ مذہب راسخ، سنت والجماعت کے مخالف تھے۔ (۵۰) پیغمبر اسلام (صلعم) نے جو سادہ مذہب منکشف کیا وہ پڑھی جانے والی کتاب (کتاب مثنوی؟ مترجم) میں محفوظ ہوا۔ لیکن معاملات انسانی سے متعلق اس قرآن کی تعبیر کے لئے احادیث قلم بند کی گئیں۔ شریعت نے ضوابط حیات متعین کئے اس خدائے پاک کی مرضی کے مطابق، جو خود دنیا سے بے حساب بعد رکھتا تھا۔ بخلاف اس کے صوفیہ سینٹ فرانس کا ساقیہ، قرب خدا کا رکھتے تھے۔ علیٰ ہذا نظری عیسائیوں کی طرح جن کے گرجے اسلامی ممالک میں جا بہ جا منتشر تھے وہ مسیح

جیسی فطرت کے امام کے ظہور کے بھی معتقد تھے۔ پھر صوفیوں میں اسی قسم کے ”طریقے“ بنے۔ خصوصاً نقش بندیوں میں جیسے سینٹ فرانس کے گداگر درویشوں کا گروہ تیار ہوا تھا۔ ان (مسلم) درویشوں کو کبھی کبھی لوگ ستاتے تو وہ اخفا کا طریق اختیار کر لیتے اور اپنے روحانی مرشدوں کو ”ایشان“ کے رمزی خطاب سے یاد کر کے ان کی پیروی کرتے تھے۔ عالی خیال خواجہ (عبید اللہ) احرارؒ ان عابد زاہد یا صوفی بزرگوں کے مرشد اعلیٰ تھے۔ بابر ان سے کمال عقیدت رکھتا تھا اور ان کے مریدوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ شروع میں جس کام کا ارادہ کرتا تو پہلے ان جہاں گرد درویشوں سے اسے بیان کرتا تھا۔ رہبانیت پسند میر علی شیر علی جسے خلاف طبع ملک داری کے میدان میں آنا پڑا، غالباً ایسا ہی صوفی اور حضرت جامیؒ کا دوست دار تھا۔ بابر بھی یقیناً ان کو بہترین سالک شاعر جانتا تھا۔ سنت والجماعت عقیدہ رکھنے کے باوجود جامیؒ صوفی تصورات کے پیرو ہو گئے تھے۔ ممکن ہے بابر نے بھی اسی قسم کا مذہب اختیار کیا ہو۔ اعمال ظاہری میں وہ شریعت کی پوری پابندی کرتا تھا۔ مگر اس کا بھروسہ ہمیشہ خدائے حاضر و ناظر پر ہوتا۔ اسے ریاکاری نہ آتی تھی لہذا جب وہ کہتا ہے کہ میری زندگی کے واقعات کی مشیت الہی نے تشکیل کی، تو وہ حقیقت میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ البتہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ خدا جانے وہ کس حد تک ظاہری رسوم، طہارت، اکل و شرب اور نماز کو نصرت الہی کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ جو اس کی دلی آرزو کے مطابق دنیا کے جھگڑوں میں بھی اسے تقویت دے گی۔ اس کا ذہن ایچ پیچ نہ جانتا تھا اور وہ بلا قیل و قال رسوم کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ حضرت رومیؒ کی تلقین کہ خدائے قاہر کے حضور میں ایسی ظاہری رسمیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، بابر کے فہم سے بالا تھی۔ ہاں آگے چل کر اس نے دونوں کے بین بین خود ایک صورت نکال لی تھی اور اپنے آپ کو ہنس کر ”درویش بادشاہ“ کہا کرتا تھا۔

لیکن خود کو پادشاہ مقبب کرنے کے بعد دس برس تک اس کی زندگی اپنے سے کم عمر ایک اور شخص کے زیر اثر رہی، بلکہ کہنا چاہئے کہ ڈھلتی رہی۔۔۔۔۔ جو ہر اعتبار سے درویش اور بادشاہ تھا۔ ۱۵۰۱ء میں یہ مجہول الاحوال سانوجوان اسلعل صفوی اور امیر تیمور کی سابقہ سلطنت کے مغربی اقطاع میں شاہ ایران موسوم ہوا تھا۔

ایران (یا فارس) کلمانے والے خطے کا کسی ایسے خیالی منصوبے بنانے والے کے ہاتھ میں آ جانا لائق تعجب بات نہ تھی۔ جس دن سے خاندان کیانی کے کورش (کیخسرو) نے بابل

و نینوا کے سامی دیوتاؤں کا تختہ الٹا اور اپنے پیغمبر زرتشت کے تبلیغی دین کا حلقہ بگوش ہوا، اسی وقت سے ایران تصوف یا بائیت کا گوارہ بن گیا تھا۔ رومہ کے جیوش جس طرف گئے فتح سے ہمکنار ہوئے لیکن نہ فرات کے پار مشرقی مذاہب کے ملکوں کو کبھی مغلوب نہیں کر سکے۔ ظہور اسلام کے بعد یہاں خلافت کا تسلط قائم ہوا تاہم مرور وقت کے ساتھ عباسیوں کی خلافت بغداد ایرانی شیعیت کے مذہبی اثر کے تحت آ گئی۔ تصوف یا بائیت بالطبع پابند مذہب حکومت سے انحراف کرتی ہے خواہ بغاوت کے ذریعے ہو خواہ تبلیغ و دعوت سے۔ باز نشینی سلطنت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھاکہ، سکندریہ، یوروٹلم کے مشرقی کلیسا بغاوت کر رہے ہیں اور راسخ العقیدہ قسطنطنیہ بزور شمشیر انہیں دبانا چاہتا ہے۔ جیٹن جیسے پابند مذہب شنشہاہوں کی مسلح فوجیں باغی راہبوں کو مشرق کی طرف بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن ان کی بغاوت کو فرو نہیں کر سکتیں۔

یہ صحیح ہے کہ سنت والجماعت مذہب کے پابند امیر تیمور نے اپنی قوت بازو سے مشرق کے سرکش ممالک کو قابو میں رکھا تھا لیکن حسین میرزا با-قرا، یا زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ اس کے نکتے بیٹوں کے وقت میں ازبکوں کے خراسان میں ہرات چھین لینے سے تیموری سلطنت کا آخری ٹکڑا بھی تلف ہو گیا۔

مشہد ہاتھ میں آ جانے کے بعد بالکل قدرتی بات تھی کہ شیبانی خاں کے فاتح ازبک مغرب کی ان کاروانی شاہراہوں پر آگے بڑھیں جو بحر خزر اور وسط ایران کے اضلاع کرمان کو جاتی تھیں۔ اس پیش قدمی پر نوارد شاہ اسماعیل نے باضابطہ احتجاج کیا اور لکھا کہ ازبک ان ملاقوں میں گھس آئے جو موروثی حق کی بنا پر میرے ہیں۔ اس دعوے کو سن کر حقیقت پسند شیبانی بھی حیران ہوا ہو گا کہ اس نے ذرا غیر رسمی طور پر پلٹ کر پوچھا ”تمہیں کس وراثت سے یہ حق حاصل ہوا؟“ اور اس کا یہ سوال کرنا کچھ بیجا نہ تھا۔ اسماعیل نام ہی اس وحشت کدے میں سخت اجنبی، پرہیزی معلوم ہوتا تھا۔ اس نام کا ۲۱ سالہ نوجوان کوہستان قاف کی بلندیوں سے اتر کر آیا اور مغربی ایران کے ملوک طوائف کو روندنا چلا جاتا تھا۔ وہ ایک امام کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ دار تھا اور اس کی وادی طرابزون کی باز نشینی شہزادی تھی۔ باپ حیدر شیخ تھا۔ ”کالی بھیڑ“ (قرہ قونیلو) اور ”سفید بھیڑ“ (آق قونیلو) والے ترکمان کی خانہ جنگی میں اسماعیل نے کامیابی حاصل کی۔ شاید اپنے خیالی منصوبوں کی بنا پر کم از کم دشمنوں کی نظر میں وہ ناقابل فہم، نہایت سفاک اور مذہبی مجنون قسم کا آدمی تھا۔ دور دست

پہاڑوں کے نو ترک قبیلے اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور نئے مذہب کے جوش نے ان میں ایسی طاقت بھر دی کہ صفوی ناقابل شکست ہو گیا۔ ان نو قبیلوں کے شہ سوار ”قرل باش“ (سرخ کلاہ) کھلاتے تھے اور ہر طرف ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اپنی ترک تازیوں میں یہ مغل ایل خانوں کے سابقہ پائے تخت تہریز سے خلفائے عباس کے افسانوی شہر بغداد تک کھوند آئے۔ جنوب مشرق میں اصفہان پر حملہ آور ہوئے جو صفوی بادشاہوں کا پائے تخت بننے والا تھا۔ خانوادے کا بانی یہی اسماعیل تھا اور یا اس کے باپ شیخ (صفی الدین۔ مترجم) کو قرار دے سکتے ہیں۔ ازبکوں کی پیش قدمی پر احتجاج کرتے وقت اسماعیل اصفہان ہی میں تھا اور خلاف عادت سکون سے وقت گزار رہا تھا۔ ادھر ازبکوں کے سب سے اگلے قزاق جو اصفہان سے چند میلوں کی مسافت پر لوٹ مار کر رہے تھے۔

ضمناً یہ بھی لائق ذکر ہے کہ یورپ کے بعض سیاست دان کچھ پہلے سے شاہ اسماعیل کی جانب پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے جیسے وہ سفید بھیڑ والے ترکمان اوزون حسن کے نگران رہے۔ یورپ والوں کی اس خاص توجہ کے کئی معقول سبب تھے۔

سن ۱۷۹۹ء کے قریب جب کہ اسماعیل نے اپنی شاہی کا اعلان کیا، وینس کے سفیر تہریز و اصفہان تک چلتے ہوئے آئے کہ اس پنجاب بلب ”جمہوریہ سنہ“ کی بری راستوں سے تھوڑی بہت تجارت کی صورت نکالیں۔ علی ہذا پرنگالی بیڑوں نے جو ہندوستان کی مالا مال بندرگاہوں پر آنے جانے لگے، صفوی سے دوستانہ روابط کے لئے اپنے دند بھیجے، کیونکہ فارس کا ساحل ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ کے یورپی دشمن (SOPHY THE) کا روز افزوں عروج دیکھ کر ادھر مائل ہوئے۔ کیونکہ ترکان آل عثمان اب قسطنطنیہ کو دار الخلافہ بنا کر یورپ میں برابر آگے بڑھ رہے تھے اور ایران کے شیعہ ان سنی ترکوں کے دشمن تھے۔ علاوہ ازیں یورپ کے سوداگروں کی بڑی خواہش تھی کہ صفوی اندرون ایشیا میں انہیں کوئی نیا راستہ فراہم کر دے گا۔

لیکن بالفعل اسماعیل اپنی مملکت میں نیا انتظام قائم کرنے میں مصروف تھا اور سلطان ترکی جیسے زبردست حریف سے الجھتا تھا۔ سلطان بایزید ثانی، سلطان محمد فاتح کا فرزند، باپ کی نسبت بہت نرم خو بادشاہ تھا۔ ہرات کے صاحب ذوق بادشاہ حسین میرزا با۔ قرا کے ساتھ اس کی دوستانہ مراسلت رہی۔ اب شعلہ خو اسماعیل سے بھی ایسے ہی روابط رکھنے میں اسے تامل نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بایزید اپنے دربار کی ادبی زبان فارسی میں خط لکھتا تھا

اور اسماعیل ایران سے اپنی مادری زبان ترکی میں جواب دیا کرتا تھا۔

ازبک فرماں روا شیبانی یورپ سے دور و منقطع تھا۔ البتہ قازان اور استر خاں کے مغل خانوں سے اس کی مراسلت تھی اور یہ خاں ابھی تک موسکو کے ”گرینڈ ڈیوک“ (امیر) پر سلطانی سیادت رکھتے تھے۔ شیبانی کے قلب ایران میں بڑھ آنے سے شاہ اسماعیل کے فانی شیعوں میں سینوں کی طرف سے مذہبی منافرت کی آگ بھی اور زیادہ مشتعل ہوئی اور اس نے ملک ملک میں شدید مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۵۰۹ء میں شیبانی اور شاہ اسماعیل کی لڑائی چھڑنے کے وقت ہی ایک اور نئی طاقت بھی ایشیا میں نمودار ہوئی۔ یہ پرتگیزی تھے جن کے جنگی بیڑے نے دیو (گجرات) کے سامنے مسلمانوں کے ایک بیڑے کو قریب قریب فنا کر دیا۔ یہ بحری سرگرمیاں کابل سے کچھ بہت دور نہ ہوئی تھیں لیکن بابر کو ان کی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہی معرکہ تھا جس میں یورپ کی ساختہ توپ اور توڑے دار بندوقوں نے فیصلہ کن حصہ لیا۔ اس قسم کی توپیں عثمانی ترکوں کی فوج میں کار آمد ثابت ہونے لگی تھیں اور اگرچہ خود سر اسماعیل انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا، مگر آئندہ سنین میں بابر کا ان سے کام لینا مقدر تھا۔

کابل کے اتنے دور، کئے ہوئے ہونے کی وجہ سے شیبانی اور اسماعیل کی جنگ عظیم کی خبریں بھی وہاں جستہ جستہ نامربوط صورت میں آئیں جنہیں افواہ عالم نے مبالغہ آمیز بنا دیا تھا۔

پہلے دونوں طرف سے تحقیر و تمہید کی باتیں ہوئیں۔ شیبانی نے اسماعیل کے پاس اپنی بھیجا، کاسہ گدائی اور عصا تجھے میں ارسال کئے اور یہ پیام کہ اس کے حق میں بہتر ہو گا کہ اپنے باپ کا پیشہ فقر اختیار کرے۔ جواب میں نوجوان صفوی نے سن رسیدہ ازبک کو چر خا اور تھکا بھیجا کہ اگر تلوار کی نوک سے جان چراتا ہے تو اپنی ماں کی سیلیوں میں زندگی گزارے۔ کیونکہ شاہ مشہد کی درگاہ میں حاضری دینے چل پڑا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ شیبانی سے ملاتی ہو گا۔

۱۵۱۰ء کی گرمیوں میں ازبک سردار اپنے مفتوحہ ممالک کی بزور شمشیر حفاظت کے لئے سرحد پر ہی ڈٹا رہا۔ شمال کے نیم صحرائی علاقوں میں قرقق اور جفاکش کرغز کی تاختوں نے بے اطمینانی پھیلا رکھی تھی اور چین کی بڑی شاہراہ پر ارض مغول میں جہاں بابر کا ماموں فرماں روائی کرتا تھا، اب وہاں خان کوچک نے ازبکوں کا قلاوہ اطاعت اتار کر پھینک دیا۔

شیبانی کو شمال اور مشرق میں بڑی بڑی فوجیں بھیجی پڑیں کہ اس کا تسلط بحال کریں۔ میرزا حیدر کا بیان ہے کہ اس کی سپاہ میں تاشقند کے بیس ہزار مغل بھی تھے۔ ان کو شیبانی نے جانے کی اجازت نہ دی کہ کہیں اپنے وطن کے قریب پہنچ کر منحرف نہ ہو جائیں۔

اسماعیل اور اس کے قزلباشوں کی آمد آمد پر شیبانی دریا کے کنارے شہر مرو میں ہٹ آیا اور وہیں اپنے سپہ سالاروں کی طلبی کے لئے ہرکارے روانہ کئے۔ اس وقت تک یہ ازبک تمام حریفوں کو جنگی چالوں میں نیچا دکھا چکا تھا لیکن اسماعیل کے سواروں کا لشکر کا لشکر بے خبر دریا کے پار آ گیا اور ازبک قراول سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ تین روز بعد قزلباشوں نے شمال کی طرف حرکت کی۔ شیبانی کے سرداروں نے عرض کی کہ جب تک عبید خاں اور تیمور سلطان کے امدادی دستے نہ آ جائیں ہمیں اپنے پڑاؤ کو چھوڑنا نہ چاہئے۔ شیبانی نے نہ مانا اور اپنی کم تعداد فوج کو لے کر ایرانیوں کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو لڑائی ہوئی اس کی اطلاعات بدخشاں میں میرزا خان کو ملی تھیں اس نے بذریعہ خط بابر کو کابل بھیجیں۔ کس قدر ہنگامہ خیز تھا۔ یہ خط جس میں مرو کے قریب لب دریا ازبکوں کی کامل ہزیمت، شیبانی کے زخمی ہو کر ہلاک ہونے اور اس کے سب بڑے بڑے سپہ سالاروں کے مارے جانے کی اطلاع تھی اور یہ کہ ان خوف انگیز ازبکوں کو تترہتر کر کے شاہ اسماعیل مرو سے ہرات تک جھاڑو پھیرتا ہوا گیا اور بعد میں یہ بھی مشہور ہوا کہ اس نے شیبانی کے کاسہ سر کا پیالہ بنوایا اور سونے سے مرصع کر کے پینے کا کام لیا۔ نیز کھال کھنچوا کے بھس بھروایا اور اس کی عام تشییر کرائی۔ یہ افواہ تھی، اس کی پوری صحت کا علم نہیں ہوتا۔ مزید برآں خاں میرزا نے لکھا کہ بیس ہزار جنگ آزما جو زبردستی شیبانی کے لشکر میں فتح تاشقند کے بعد بھرتی کئے گئے تھے، اس کے شکست کھاتے ہی الگ ہو کر بھاگتے ازبکوں پر پلٹ پڑے اور انہیں لوٹ لیا (اس پر بابر کو ضرور ہنسی اور اپنے تجربے یاد آئے ہوں گے) پھر ان مغلوں نے قندز میں خان میرزا کے پاس آکر درخواست کی کہ بابر بادشاہ کو بلایا جائے۔ پھر حیدر میرزا لکھتا ہے کہ جونہی بادشاہ نے خط کا مضمون پڑھا، کمال غلبت کے ساتھ قندز کو چل پڑا حالانکہ یہ عین وسط سرما کا موسم تھا اور بالائی درے بند تھے۔ ”مگر اس وقت تک بابر کو اپنی مملکت زیریں دروں کے راستے بھی خوب معلوم ہو چکے تھے۔ ازبکوں کی اس مصیبت کبریٰ کو وہ سمجھا کہ سرفرد واپس لینے کا یہ خدا ساز موقع نکل آیا ہے۔

پتھر کے پل پر جنگ اور فتح

اس سفر میں بابر نے نو عمر حیدر میرزا اور سعید خاں چغتائی کو ہمراہ لے لیا تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے ساتھ لے چلنے کی منت سماجت کی۔ یہ دونوں سخت بے سرو سامانی میں کاہل آئے تھے۔ حیدر تو حسین میرزا کا بیٹا تھا جس نے بابر کے خلاف بغاوت کی۔ شیبانی کے پاس جا کر اس کی جھوٹی لیکن شیبانی ہی کے حکم سے قتل ہوا۔ چغتائی بابر کے چھوٹے ماموں کا واحد سلامت ماندہ لڑکا تھا اور اسے بھی ہلاک کرنے کا شیبانی حکم دے چکا تھا۔ بابر نے دونوں کو جس محبت سے رکھا اس خوش دلی کا وہ آئندہ عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔ حیدر لکھتا ہے ”(بادشاہ بابر نے) مجھ سے کہا ذرا غم نہ کھاؤ۔ شکر کرو کہ تم سلامت میرے پاس آ گئے۔ تمہارے باپ اور بھائی کی جگہ میں موجود ہوں..... میرے لئے سخت رنج و غم کا دن تھا۔ جب کہ میرا باپ مارا گیا لیکن اب بادشاہ نے مجھ سے وہی پدرانہ شفقت فرمائی جیسی باپ کرتا تھا۔ جب سوار ہو کر باہر جاتا تو مجھے اس کے پہلو میں چلنے کی عزت حاصل ہوتی۔ میرے درس کا وقت ختم ہو جاتا تو بادشاہ یاد کر کے کسی کو بھیجتا کہ مجھے لے آئے..... جب تک میرا قیام رہا یہی پدرانہ سلوک کرتا رہا۔“ سعید خاں نے اپنی شہادت کا اضافہ کیا ہے :

”کاہل میں میرے جو دن گزرے فکر و تشویش سے خالی تھے..... سب لوگوں سے میرے تعلقات دوستانہ تھے اور وہ سب میرے ساتھ مہر و محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی درد سر کی بھی شکایت مجھے نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ زیادہ پی جانے سے سر بھاری ہو گیا ہو۔“

انہی دونوں کے بیانات سے سمرقند کے واقعات واضح ہوتے ہیں۔ قندز میں سب اہل خاندان کا اجتماع ہوا۔ اندرونی اختلافات بھی لازماً سرسراتے رہے۔ پورے مجموعے میں قوت کا توازن مغول کے ہاتھ میں تھا جو اس وقت بغیر کسی سردھرے کے سرگرداں تھے۔ قدامت پرستی کی بنا پر یہ سخت کوشش جنگجو تاشقند کے سابق والی کے بیٹے سعید خاں کے سوا اور کسی کی بادشاہی قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان میں خفیہ کام کرنے کا قدرتی میلان تھا چنانچہ سعید خاں سے صیغہ راز میں درخواست کی کہ اپنا موروثی منصب سنبھالے۔ قدیم علم کھڑے کر کے مغلوں کی سنت کے مطابق ان کی برکت حاصل کرے اور بابر کو جو پکا مغل نہ تھا، اپنی راہ جانے دے۔ چاہے اس میں لڑائی کی نوبت آ جائے۔ سعید خاں نے یہ پیشکش منظور نہیں کی۔ اس نے کہا ”شیبانی کے سیل بے پناہ میں بابر بادشاہ نے مجھے پناہ دی اور بڑی عنایت سے پیش آیا۔ احکام الہی کے خلاف ہے کہ اپنے محسن سے احسان فراموشی کروں۔“ دوسری طرف بابر کو پیام کہلا بھیجا کہ ”خدا کی رحمت سے بہ کثرت لوگ آپ کی

سرکار میں واپس آ رہے ہیں۔ خصوصاً مغل قوم جس کی تعداد اور قوت کسی سے کم نہیں اور جس کے دنیا کے بزرگ ترین بادشاہ ہوئے ہیں، وہ بھی آپ کی طرف رجوع ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں میرا آپ کے قریب رہنا دور اندیشی کے خلاف ہے۔ رفاقت لا محالہ مفارقت میں بدلتی پڑے گی اور ہم دونوں کے حق میں بہتر ہو گا کہ آپ مجھے کسی اور جگہ بھیج دیں جہاں ہمارے تعلقات مرواخلاص کی استواری میں فرق نہ آ سکے۔“

بابر نے یقیناً چغتائی مغل بادشاہی کے وارث کا اشارہ سمجھ لیا اور اس کی شرافت و مروت کا اعتراف کیا ہو گا۔ ایسے مخلوط لشکر میں دونوں کا حکم تو چل نہ سکتا تھا۔ بابر اپنی سلطانی سیادت کا دعویٰ رکھتا تھا اور ادھر بیس ہزار مغل وطن کی یاد میں بیقرار، سعید خاں کی بادشاہی کے طالب تھے۔ غرض جلد ہی فیصلہ کیا گیا کہ نوجوان شہزادہ اپنی ”ذاتی“ فوج لے کر نیم صحرائی حکومت ”مغولستان“ کو چلا جائے۔ رخصت کرنے سے پہلے بابر نے قدیم مغل رسم کے مطابق اس کی جانشینی کا دربار کیا اور ”سعید چغتائی (اپنے باپ، یعنی بابر کے ماموں کی بجائے) خان بنا دیا گیا۔“

بعض مغل گروہ، خصوصاً ایوب بیگ چک کی برادری جنہوں نے بابر کی ملازمت میں آنے سے پہلے خروشاہ کی نوکری کی تھی بابر ہی کی فوج میں رہ گئے۔ بعد شمالی علاقے میں نئے فرماں روا کی پختہ دوستی آئندہ بھی بادشاہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ مغلوں کے چلے جانے سے متحدہ لشکر کا سب سے قوی جزو جدا ہو گیا، لیکن بابر نے سرقد کا بیتابانہ کوچ جاری رکھا اور اس شد و مد سے پگھلتی برف کے راستے بڑھے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی کم تعداد فوج میں بہت سے لوگ جو ادھر ادھر دیک رہے تھے آکر شریک ہو گئے۔ حیدر میرزا کے (مقتول) باپ کے پرانے رفیق بھی اسی کے پرچم تلے جمع ہوئے اور اس نے ازراہ مصلحت اپنی سپاہ کی بھی سپہ سالاری نو عمر حیدر میرزا کے تفویض کر دی حیدر نہایت مسرور ہوا اور اپنا پہلا معرکہ ازبکوں کی منتشر جمعیت سے پتھر کے پل پر دیکھا جو آمد دریا کی ایک دھار پر بنا ہوا تھا۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی اور بابر کے پہلو میں ایک ٹیکرے پر کھڑا حیرت سے ہزاروں سواروں کا ادھر سے ادھر دوڑنا، چیخ پکار کے ہنگامے اور کشت و خون کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ایک بار جو ازبکوں نے نالہ اتر کے اوپر چڑھنا شروع کیا تو لکھتا ہے کہ ”بادشاہ کی نظر میرے قریب کے آدمیوں پر پڑی۔ دریافت کیا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا ہم حیدر میرزا کی بیعت میں ہیں۔ بادشاہ میری طرف مخاطب ہوا اور کہا تم ابھی بہت کم عمر ہو

اس خطرناک کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔ تم میرے پاس رہو۔ مولانا محمد اور چند سپاہی تمہارے پاس ٹھہریں گے باقی جوانوں کو خان میرزا کی کمک کے لئے بھیج دو۔“ اتنے میں میری جمیعت کے لوگ ایک قیدی پکڑ کر لائے۔ بادشاہ نے کہا شگون اچھا ہے۔ اس قیدی کو حیدر میرزا کے نام لکھا جائے۔“

مغرب کے قریب ازبکوں کی صفیں پر آگندہ ہو گئیں۔ ان کے تین سپہ سالار اسیر کر کے لائے گئے ”بادشاہ نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شیبانی نے مثل خانوں اور چغتائی سلطانوں کے ساتھ کیا تھا۔“

بابر فتح پانے کے بعد ستانے کا قائل نہیں۔ بے سرے ازبکوں کا پوری قوت سے تعاقب جاری رکھا اور در آہن کے درے سے گزر کر کرشی کو پیٹ میں لیتا ہوا سرخ میدانوں تک پہنچ گیا کرشی میں ازبک عبید خاں نے محافظ فوج جمع کر لی تھی۔ مگر بخارا پہنچے تو وہ ”سپاہیوں سے خالی، احمقوں سے بھرا ہوا تھا۔“ پھر فاتحانہ سر قند پر بڑھے تو ازبک بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس علاقے اور اوپر فرغانہ کے قلعوں سے ہر جگہ ازبک جمعیاتیں مارا مار اپنے اہل و عیال کو لے کر واپس صحرائی علاقوں کو بھاگ رہی تھیں۔

نو سال کے بعد ۱۵۱۱ء میں بابر امیر تیمور کے شہر میں دوبارہ وارد ہوا: ”ساری نواح کے باشندے، کیا امیر کیا کسان، اہل حرفہ، ایمان و عمائد سبھی بادشاہ کی آمد پر شادمانی کا اظہار کرنے گھروں سے نکل آئے۔ امرانے اسے گھیر لیا۔ غریب غریا اپنے گھروں کی آرائش میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچے بازار، بادلے اور زری سے سجائے گئے۔ جگہ جگہ قطعات اور تصویریں لٹکائی گئیں۔“

یہ کسی جن کا کرشمہ نظر آتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے وہ سب مانوس مقامات جہاں بابر گشت لگاتا تھا اور خالوادہ تیموری کے ممالک ایک مرتبہ پھر بابر کے زیر نگیں آ گئے۔ اس کا بھائی کابل و غزنی میں اس کی طرف سے حاکم تھا۔ قندز اور بدخشاں نے والی خان میرزا کے اطاعت گزار تھے۔ اندجان سے تاشقند تک ہر شہر کے دروازے کھل گئے تھے اور نیم صحرا کی مثل ولایت میں اس کا حلیف سعید خاں فرماں روا ہو کر آ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ بابر واقعی بادشاہ (یا شہنشاہ) کے لقب کا سزاوار ہو گیا ہے۔

لیکن یہ ظاہری احوال حقیقت سے دور تھا۔ شیبانی کے سدھائے ہوئے سپہ سالاروں کی قیادت میں خونناک ازبک اگرچہ شمال میں پسپا ہوئے۔۔۔۔ اور وہ بھی شاہ اسماعیل کی

قوت سے، لیکن پوری طرح مغلوب نہیں کئے گئے تھے۔ پھر مشترکہ دشمن شیبانی کے دفع ہونے کے بعد، بابر کو اس متعصب ایرانی سے مصالحت کی کوئی صورت نکالنی تھی۔ اور یہی وہ کوشش تھی جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا، اس بار سمرقند میں اس کی حکومت صرف آٹھ مہینے رہی۔

وقت ضرورت

ہمارے شیر اور شاہ اسماعیل کے درمیان جو مراسلت ہوئی وہ معما ہو کے رہ گئی ہے۔ بابر کی تزک سے ان سنین کے اوراق تلف ہو گئے لہذا اس کا اپنا بیان بھی مفقود ہو گیا۔ دوسرے اہل قلم جیسے حیدر میرزا اور مورخ خواند میر کے بیانات بہت تشنہ اور متضاد ہیں۔ جنبہ داری، مذہبی تعصبات اور بعد کے سیاسی مصالح نے انہیں متاثر کر دیا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسی ہنری نوار اور شاہ فرانس کی ”کیٹھولک ہیوگنو“ (فرانس کا احتجاجی فرقہ) مبادلتہ کے قصے جو بعد کی افواہوں پر مبنی تھے۔ ہمیں رغبت تو ہوتی ہے کہ بابر کی نسبت کہیں کہ وہ سمرقند کو طریق سنت کے عوض خریدنے پر مائل تھا لیکن یہ پوری سچی بات نہ ہو گی۔ ہرچند ہمیں ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ اس کے محرکات کیا تھے لیکن جو کچھ عمل کیا وہ پوری طرح واضح ہے اور یہی عمل اس کے افکار و استدلال ذہنی کی خبر دیتا ہے جسے حیدر میرزا نے ”اس کے وقت ضرورت“ سے تعبیر کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ صفوی نے اس کی بڑی بہن خانزادہ بیگم کو جنگ مرو کے بعد شیبانی کی لشکر گاہ میں پایا تو عزت حرمت کے ساتھ بدرقہ دے کر بابر کے پاس بھیج دیا۔ یہ بلند حوصلہ جوڑ توڑ والی شہزادی شیبانی کے نکاح میں رہی اور اس سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا، لیکن شیبانی نے اپنے دشمن بابر کی طرفداری میں اس کے ساز باز سے مشتبہ ہو کر طلاق دے دی اور ایک بڑے ازبک سردار سے اسے بیاہ دیا۔ یہ سردار اور شیبانی دونوں مرو میں ہلاک ہو گئے تھے۔ بظاہر خانزادہ کی بھائی سے دلی محبت میں فرق نہ آیا تھا۔ اور بہر حال وہ ازبک دربار کے جملہ کوائف بابر کے پاس لائی تھی۔

پراسرار صفوی کا یہ فعل مروت و شائستگی کا آئینہ دار تھا۔ بابر نے بھی اس کے شکریے میں اپنے سفیر ہرات روانہ کئے۔ اسماعیل کی عنایت کا اعتراف کرنے کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنا مقصود تھا کہ آئندہ روابط کی کیا شرطیں ہوں گی۔ پھر دوسرے کاموں سے

فرصت ملتے ہی خان میرزا کو سفارت کار سربراہ بنا کر صفوی دربار میں بھیجا۔ واضح رہے کہ خانزادہ بیگم کو لے کر جو قزل باش محافظ آئے تھے، ان کے سرداروں نے بابر کے سمرقند پر جھپٹے میں بھی عملی حصہ لیا اور تیمور کے تاریخی تخت پر متمکن ہونے کے بعد بابر نے معقول تحفے تحائف دے کر انہیں رخصت کیا تھا۔ غرض یہ کہ اسماعیل کی طرف سے جو شرائط پیش ہوئیں وہ پتھر کے پل اور سمرقند پر بابر کے فتح پانے کے بعد ہی مرتب کی گئی تھیں۔ انہیں خان میرزا بابر کے پاس لایا اور اگرچہ اختلافی بیانات نے انہیں مبسم کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ درستی سے خالی نہ تھیں۔ شاہ اسماعیل نے تیموری وارث کو تخت سمرقند پر قائم رہنے میں مدد کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ بابر اس ایرانی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لے۔ مزید برآں وہ شرطیں جن کو مناتھے کے غبار نے دھندلا کر دیا ہے، یہ تھیں کہ آئندہ سکے پر شاہ اسماعیل اور (بہ تصحیح مترجم) دوازدہ اماموں کے نام کندہ کرائے جائیں جو اس کی شہنشاہی کا علانیہ باضابطہ اعتراف ہوں اور اسی طرح خطبے میں (اپنی بجائے) شاہ کا نام پڑھوایا جائے۔

اسماعیل نہایت متعصب نوجوان تھا۔ بابر کے مزاج میں رواداری تھی۔ تیس برس کی عمر میں اٹھارہ سال جنگ و جدال میں گزارے۔ عزت نفس رکھنے میں کسی سے کم نہ تھا۔ اسی زمانے میں خانزادہ بیگم نے ازبکوں کی قوت اور منصوبوں کی خوف انگیز تفصیلات سنیں اور قرینہ غالب یہی ہے کہ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ سمرقند جو محض خدائے تعالیٰ کی کریمی سے دوبارہ ہاتھ آیا، ایرانی فاتح خراسان کی مدد کے بغیر وہ اس پر قبضہ نہ رکھ سکے گا پھر بابر کے حافظے میں خاص خاص صوفیہ، چھپے ہوئے ”ایشان“ عالم خیال میں پرواز کرنے والے درویش اور سب سے بڑھ کر حضرت جانی کی (جو راسخ العقیدہ سنی ہونے کے ساتھ صوفی بھی تھے) یاد باقی تھی۔ اس کے ذہن میں عقیدے کی یہ الجھن صاف نہ ہوئی تھی کہ خدا کو محیط کل (ہر جگہ ہر طرف موجود) مانا جائے یا سنی مذہب کے مطابق انسان سے بالکل جداگانہ ہستی جس کی حسب احکام رسمی عبادت فرض ہے۔ صفوی بادشاہ اول الذکر اعتقاد رکھتا تھا۔ (۵۱) مرحوم شیبانی طریق آخر کا پابند تھا۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ اس زمانے میں بابر کے دل میں شیعہ عقائد کی بھی وہی حرمت تھی جیسی طریق سنت کی۔ یہ شہادت بھی موجود ہے کہ اس نے اسماعیل کی شرط کے مطابق بعض سکوں پر امام کا نام ضرب کرایا۔ اسی سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کے منبروں سے خطبے میں شاہ اسماعیل کا نام پڑھوایا

گیا ہو گا۔ اہل ملک میں اس سے بڑھ کر ناگواری کی بات نہ ہو سکتی تھی۔ بخارا بزرگان اولیا کے مقابر سے گھرا ہوا تھا۔ وہ سب سنی اہل علم و عرفان تھے اور شر ("تبت الاسلام" یعنی) عقاید سنت والجماعت کا مرکز کھلاتا تھا کم و بیش ایسا ہی سمرقند تھا۔ یہاں والوں نے کمال شادمانی سے بابر کا خیر مقدم کیا تھا، کیا وہ اس لئے تھا کہ بابر ایک ملحد شیعہ کا خود کو باج گزار بنا لے گا۔ ایسے بے دین شاہ کا جس کے ہاتھ ان شہیدوں کے خون سے آلودہ تھے جنہوں نے ہرات میں سچے دین سے منحرف ہونا منظور نہیں کیا (حقیقت میں مسلمانوں کے معزز شیوخ سے شاہ اسماعیل کے روبرو جرح کی گئی اور بے گناہ قتل کر دیئے گئے تھے) میرزا حیدر لکھتا ہے کہ "سب لوگ، خصوصاً اہل سمرقند توقع کرتے تھے کہ گو ضرورت کے وقت پادشاہ نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کر لیا ہو، سمرقند کے تخت پر، جو خاص سنت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تخت تھا، قدم دھرنے کے بعد وہ اسماعیل کی شاہی سے تبری کرے گا جس کے مذہب کی نوعیت الحاد، اور نشان گدھے کی دم ہے۔" پچارے حیدر میرزا کے دل میں لڑکین کے باوجود اپنے محسن بابر کی عقیدت مندی میں سخت تزلزل آگیا۔ کیونکہ وہ پر جوش سنی تھا۔ اب اس نے پادشاہ کے پہلو میں سوار ہونا چھوڑ دیا اور بیماری کے عذر پر جو واقعی تھی یا اعتقادی، اپنے کمرے ہی میں وقت گزارتا تھا۔ اس کا قول کہ بابر نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کیا، فارسی زبان کا استعارہ ہے بعض مصنفوں نے اسے غلطی سے بیان واقعہ سمجھ لیا۔ بابر نے قزل باشوں کی چونچ والی منڈے کی سرخ کاہ جس سے مسلمان نفرت کرتے تھے اور ان کا سرخ پچھائے کا کپڑا کبھی نہیں پہنا۔ البتہ اس لباس میں ایرانی عمدہ دار ہر جگہ اس کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔

ادھر معلوم ہوتا ہے ان ایرانی عمدہ داروں نے شاہ کو اطلاع دی کہ بابر کا برتاؤ باج گزاروں کا سنا نہیں، بلکہ نخوت آمیز ہے۔ ۱۵۱۱ء کے جاڑوں میں شیر اپنی سیاسی ضرورت اور اہل ملک کے مذہبی جذبات کے درمیان پھنس گیا۔ سمرقند والوں کو راسخ العقیدہ سنی شیبانی کے عمدہ حدیث کی شدت سے یاد ستانے لگی۔ اس فرماں روا نے شیطان اور یزداں کے درمیان بہت امتیاز کیا اور اس میں کوئی ابہام نہ آنے دیا تھا۔ اس کی سنگ دلی صرف سیاسی خطاکاروں کا خون بہاتی تھی بخلاف وحشی اسماعیل کے جس نے اہل علم و عرفان کو شہید کیا اور وہ سوال کرتے تھے کہ کیا شیبانی خود شہید نہیں تھا۔

اسی جاڑے میں بابر نے شراب پینی شروع کی اور جب پیتا تو بے تحاشا پنے چلے جاتا

تھا۔

۱۵۱۲ء میں برف پگھلنے کے بعد موسم بہار کے ہم قدم عبید خاں اور ازبک لشکر ازسرنو منظم ہو کر شمال سے اترے۔ بابر اپنی مغل جمعیت اور کابل کے آزمودہ کار سپاہیوں کو لے کر لڑنے نکلا۔ بظاہر سمرقند میں کوئی بھرتی نہیں ہوئی اور یہاں والے اس کے ساتھ نہیں گئے۔ ایک مقام حوض شاہی کے قریب اس کی مختصر فوج کو شکست ہوئی اور پیچھے دھکیل دی گئی۔ اس کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ سمرقند کی مدافعت کے لئے کافی ہوتی اور وہ تلخ تجربہ یاد تھا جب کہ یہاں کی بڑی فصیلوں کو محدودے چند محافظوں سے پہرہ دلوانے کی مصیبت اٹھانی پڑی تھی۔

دوبارہ اسے سلامتی کی راہ وہی جنوب کی طرف کوستان سیاہ سے گزرنے میں نظر آئی جہاں ایک سرحدی قلعے حصار میں ٹک گیا۔ اہل و عیال جس میں اب بہن خانزادہ اور دوسرے بیٹے کامران کا اضافہ ہو گیا تھا، ہمراہ تھے۔ بے غیرت بن کر صفوی شاہ سے مدد دینے کی درخواست کی۔

حیدر میرزا اپنے سرپرست کے ہمراہ نہیں گیا۔ افسردہ و ملول سمرقند ہی میں پڑا تھا کہ آئندہ چند ماہ میں تقدیر کا پیسہ پھرنے کی خبر سنی۔ یعنی یہ کہ مغرور صفوی نے اپنے گیارہ ہزار ”ترکمان“ شمشیر زن، شکست خوردہ بابر کی مدد کے لئے بھیجے۔ ان کا سپہ سالار نجم ثانی بھی اپنے شاہ کی طرح غرور کے نشے میں مست تھا۔ پھر کس طرح ان بے دینوں نے بابر کو لے کر در آہن کے قریب قلعہ کرشی کا محاصرہ کیا جہاں عبید خاں کے کچھ گھر والے اس وقت تک مقیم تھے۔ پھر کس طرح بابر کی رائے کے خلاف اور بغیر اس کی فوج کے خود یورش کر کے قلعہ فتح کیا اور وہاں کے تمام باشندوں، حتیٰ کہ دودھ پیتے بچوں اور معذور بوڑھوں تک کو ذبح کر ڈالا۔ بے خانماں شاعر بنای بھی قزل باشوں کے اسی قتل عام میں جان سے گیا۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کرشی کی خونریزی نے اتحادیوں کے صلاح مشورے میں خرابی ڈالی۔ یوں بھی یہ اتحاد پہلے سے قابل اطمینان نہیں تھا۔ بابر کو کرشی کے سانچے نے تذبذب میں ڈال دیا۔ شیبانی خاں نے کبھی اپنی فوج کو اجازت نہ دی تھی کہ عام شہریوں کا خون بہائیں۔ بخلاف اس کے نجم ثانی ان مسلمانوں کو جنہیں وہ کافر سمجھتا تھا، قتل کر کے خورو شادمانی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ بابر پر نکتہ چینی کرتا اور اس کے طرز عمل سے مشتبه ہو گیا تھا۔ باہمی مشاورت میں اسی ایرانی کا فیصلہ چلتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ فوج میں نااتفاق اور ناگواری

پھیلی ہوئی تھی جب کہ نجم ثانی حریف پر چڑھ دوڑا اور منہ کے بل گرا۔ کوئل غج پر بخارا کے راستے میں عبید خاں نے دام بچھا رکھا تھا۔ یہاں، حیدر میرزا اپنے پورے خسیانہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ ”اسلام کی تلوار نے الحاد اور بے دینی کے ہاتھ قطع کر دیئے۔ اسلام کی ہوائے نصرت و اقبال نے روانض کے پرچم الٹ دیئے۔ ترکمانوں کو کامل ہزیمت ہوئی اور میدان میں کھیت رہے۔ کرشی کے زخم تیر انتقام کے بیجے سے سئے گئے۔ امیر نجم اور جملہ ترکمان سرداروں کو (ازبکوں نے) جنم واصل کیا۔ بابر پادشاہ شکست خوردہ سرنگوں حصار کو پسپا ہوا۔

آئندہ پشت میں بھی بابر اور اس کی مغل فوج پر ایرانی الزام لگاتے تھے کہ انہوں نے غج کے معرکے میں نجم کے قزل باشوں کو مدد نہ دی اور پیچھے ٹھٹک رہے حالانکہ اسی موقع کے لئے انہیں ردیف میں رکھا گیا تھا۔ ایسی لڑائیوں کے بعد اس طرح کے اعتراض و الزام ایک دوسرے پر وارد کئے ہی جایا کرتے ہیں لیکن کیا ان الزامات کی کوئی اصلیت نہ تھی؟ بابر نے کرشی اور بخارا پر حملہ کرنے کے خلاف رائے دی تھی، ممکن تو ہے کہ اسی رائے کے مطابق اس نے اپنی فوج کو ان حملوں میں حصہ لینے سے روکا ہو۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ اسے بخارا جیسے مقدس شہر کے شہر پر وہی کچھ گزرنے کا اندیشہ ہو جو کرشی پر ترکمانوں کے ہاتھ سے گزری تھی؟ بابر نے اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔

حصار واپس جاتے میں اس کی جان بال بال بچی۔ قزل باشوں کی ہزیمت کے بعد مغل اہیروں نے خود فائدہ اٹھانا اور بابر ہی کو گرفتار کر لینا چاہا تھا۔ عین وقت پر اسے سوتے سے اٹھایا گیا اور وہ گھوڑے پر چڑھ کر تنہا لشکر سے نکل گیا۔ تب مغلوں نے دیہات لوٹنے شروع کیے۔ برسوں بعد ان کے سردار ایوب بیگ چک نے جب کہ وہ اپنے وطن اور سعید خاں کی لشکر گاہ میں قریب مرگ تھا اقرار کیا کہ اس رات بابر سے جو غداری میں نے کی تھی، وہ آج تک میرا جگر چھیلی ہے۔ اسی سعید خاں کی پناہ میں حیدر میرزا، سرقند کے سقاخانہ کشت و خون سے بیزار ملول ہو کر بعید شمال میں چلا آیا تھا۔

اس اثنا میں مغرب کی جانب جو واقعات پیش آئے ان کی وجہ سے شاہ اسماعیل کو اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس جانا پڑا کہ ایک اور خوفناک سنی دشمن، عثمان لی سلطان سلیم (فاتح) سے مقابلہ کرے۔

جاڑوں میں اتنی برف گری اور سامان خوردنی کا ایسا قحط ہوا کہ حصار کے چھوٹے سے

قلعے میں لوگ اسے خدا کا قہر سمجھتے جو آپس میں مسلمانوں کا خون بہانے کے باعث نازل ہوا۔ باہر نے بدخشاں کی حکومت بدستور اپنے خالہ زاد بھائی خان میرزا کے ہاتھ میں رہنے دی اور خود ٹیلے پن سے پھر جنوبی وادی آمو میں آگیا۔ آئندہ پانچ سال (۱۵۱۳ء تا ۱۵۱۸ء) میں اس کے حالات کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر بلخ و قندز کے درمیان سرحدوں سے چپکا رہا تا آنکہ اس کی سمجھ میں آگیا کہ قدیم سلطنت کے کسی قطعے پر بھی قبضہ رکھنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ تب آخری مرتبہ اس نے سمرقند کے حملات اور ہرات کے باغوں کو خیر باد کہی اور کابل کو واپس روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ معروف پہاڑی دروں اور بستیوں سے اس نے طے کیا۔ سفر میں شراب ممنوعہ کے بارہا قدحے کے قدحے چڑھاتا رہا۔ ان سنہن میں اس کا تیسرا بیٹا ہوا جس کا عرف ”عسکری“ (یعنی لشکر والا) رکھا گیا۔

شر کابل کے دروازے پر چھوٹے اور مرل بھائی ناصر میرزا نے تپاک سے خیر مقدم کیا اور فخریہ کہا کہ میں نے کابل اور غزنیوں کو برادر بزرگ، پادشاہ کے لئے محفوظ رکھا۔ باہر کو بھی اس جنگلی وطن میں یہ خیر مقدم دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن چند ہی روز گزرے تھے کہ ناصر کثرت سے نوشی سے بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

کابل میں اس مراجعت کے وقت خود باہر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ مفلس تلاش لالہابی شنزادہ نہ تھا جس کا دس برس پہلے اس شہر میں داخلہ ہوا تھا کہ بے نوائی کے باوجود ہمت بلند اور منصوبے بڑے بڑے تھے۔ مراجعت کے وقت ناز و نخوت کی گردن ٹوٹ چکی تھی اور حال و مستقبل کی کچھ فکر نہیں رہی تھی۔ لطف شراب میں ایفون و بھنگ کا اضافہ کر لیا تھا اور آشفٹ مزاجی کی گھڑیوں میں خطاکاروں کو سخت عذاب دے کر قتل کرنے کے حکم نافذ کر دیتا تھا۔ شکار جو پہلے بڑی تفریح کا مشغلہ تھا، اب محض جان داروں کو مار ڈالنے کا جذبہ رہ گیا تھا۔

باہر کی طبیعت میں اس تبدیلی کی تاویل میں بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے موروثی ”مغل“ خون کا ظہور تھا۔ لیکن اول تو اس کی رگوں میں ”مغل“ خون کی آمیزش بہت کم تھی، دوسرے اپنے فرغانہ کے عہد میں اس پر یہ بے رحمی کے دورے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

کابل کے ان افسردہ سنہن میں خانزادہ بیگم اچھے دنوں کی یاد دلایا کرتی تھی۔ اس نے علی یزدی کی کتاب ”ظفر نامہ“ جسے پہلے بھی پڑھا کرتا تھا، پھر پڑھی۔ امیر تیمور کی فتوحات کی

پر تکلف فارسی میں مدح و ثنا پڑھ کر اسے اپنی ناکامی اور بھی نمایاں نظر آئی ہو گی۔ جنگ میں شکست، سمرقند میں خود اپنے اہل ملک کا انحراف اور طعنے کہ بے دین صفوی کی جوتیاں چاٹتا ہے، زیر پرورش حیدر دوغلات کا اسے چھوڑ دینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر کے دشمن شیبانی کی شبیہ کا مرنے کے بعد بھی اس پر غالب آ جانا ---- یہ سب باتیں بابر کو اپنی زندگی سے نفرت دلاتی تھیں۔ اپنے آپ کو ”پادشاہ“ کے لقب سے تو ملقب کیا۔ لیکن قوت کا مدار، چند دانش مند مشیروں کے سوا تھا تو ان مغل شمشیر زنوں پر جن کی وفاداری پر کوئی بھروسہ نہ ہو سکتا تھا۔ حکومت، وادی کے ایک قلعے پر۔ اور حالت یہ کہ غلے کے لئے افغانی قبائل پر تاحیں کرنی پڑتی تھیں۔ ادھر شراب خوری کی معصیت میں روز بروز اور زیادہ مبتلا ہوا جاتا تھا۔ ”پادشاہ اسلام“ ایک طرف کیا کسی مسلمان فرماں روا کی صورت یہ ہو سکتی تھی؟

مغل سپاہ نے حسب معمول پھر جو غدر کیا، تو بابر نے وحشیانہ سفاکی سے انہیں پکڑا اور اسی قسم کی بے رحمی قدیم افغانی باشندوں کی مورچہ بند بستیوں کو تاراج کرنے میں دکھائی۔

بایں ہمہ یہ پختہ عمر بابر تو ہم کی قید سے چھوٹ گیا تھا۔ کسی حلیف و مددگار کی اسے تلاش نہ رہی تھی اور سن رسیدہ قاسم بیگ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کو اپنی رائے پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اسے صرف اپنی ذات پر بھروسہ تھا اور وقتی ترنگ میں آکر فتوحات حاصل کرنے کی امیدیں باندھنی بھی اس نے چھوڑ دی تھیں۔ اس نے پہلی مرتبہ بعید انقواں پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی۔ اس کی قدیم میراث ازبک اور ایرانیوں میں بٹ گئی تھی اور اسے واپس لینے کا کوئی امکان نہ تھا۔ البتہ بدخشاں کی مستور وادی باقی تھی اور بابر نے پوری استقامت سے اس کے پہاڑی راستے کھلے رکھے۔ یہ ہندوکش کے دشوار گزار بلند دروں سے گزر کر بدخشاں کے محفوظ حصار تک جاتے تھے۔ یہ ولایت اس نے اپنے رشتہ دار خان میرزا کے سپرد کی اور برابر اس کا خبر گیراں رہا۔ بعض اہل الرائے باور کرتے ہیں کہ اسے قبضے میں رکھنے کی سخت کوشش کا مقصد یہ تھا کہ سمرقند کی بازیابی کے لئے بدخشاں سے ممبر کا کام لیا جائے۔ لیکن ایک اور قرینہ یہ ہے کہ وہ اسے محفوظ رکھنے کا اس لئے خواہاں تھا کہ اگر کابل سے ٹکنا پڑے تو وہاں پناہ لی جاسکے۔ پہلے بھی ایک نازک وقت میں وہ اور قاسم بیگ بحث کر چکے تھے کہ ان کے سامنے دو ہی مامن ہیں: بدخشاں یا ہندوستان کا میدانی علاقہ۔

ان اندھیرے دنوں میں بابر کا خیال پھر سندھ پار کے زرخیز میدانوں کی طرف منعطف ہوا۔ معمولی تاخت ہی سے مواشی، پارچہ، اموال منقولہ کی معقول مقدار وہاں سے ہاتھ آ گئی۔ لڑکپن میں اس نے سمرقند کی ان تصاویر کو غور سے دیکھا تھا جن میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ اس بڑی یورش کی تفصیلات، اسی پر تکلف انشا پردازی میں ظفر نامے کے اوراق میں مطالعہ کی تھیں۔ اپنی سرکش رعایا یعنی افغانی قبائل پر بار بار چڑھائیاں کرنے سے کہیں زیادہ نفع کا سودا اور یقیناً معقول بات یہ تھی کہ اپنی باقی ماندہ فوج کو لے کر خیبر کے پار جائے اور ہندوستان کے مال غنیمت سے اپنا خزانہ معمور کرے۔

لیکن خیبر کا راستہ ہو یا سوات کے بلند پہاڑ، یا ورہ قزم، جملہ گزرگاہوں پر پٹھانوں کا پہرا تھا۔ دریائے سندھ اور اس کے درمیان یہ قبائلی پٹی حائل تھی اور بابر کو یہ بھی معلوم تھا کہ کسی بے پروا سپہ سالار یا شکست خوردہ فوج کے ساتھ یہ عیسوی خیل، یوسف زئی اور آفریدی کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ لہذا ہندوستان کے دولت کدوں تک پہنچنے سے پہلے ضروری تھا کہ ان پہاڑ کے خدائی فوجداروں کو یا کلاماً "مرعوب کر دیا جائے یا دوست دار بنا لیا جائے۔ سارے افغانوں کو مغلوب و محکوم کرنے کا خیال اس نے اب چھوڑ دیا تھا۔

ہندوستان کا راستہ

افغان بی بی کی ضمنی نقل

پراٹم چینوں کی ایک کماوت ہے کہ ”سڑکیں بدل جائیں، پہاڑ کبھی نہیں بدلتے۔“ پھر مرور زمانہ سے شوارع ہی نہیں بدلتے ان کے آس پاس رہنے والے بھی کچھ نقل مکانی سے کچھ دخیل تہذیبوں کے میل سے بدل جایا کرتے ہیں۔ نشیبی ممالک میں سلطنتیں تک بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ لیکن اونچے پہاڑوں کے بسنے والے بالکل نہیں بدلتے اور یا اتنی خفیف تدریج سے بدلتے ہیں کہ ہم کو فرق کا پتا نہیں چلتا۔ سرحد ہسپانیہ کے پہاڑی بامک سب سے الگ تھلگ ہونے میں قاف کے گرجیوں کی مثل ہیں اور مدتوں تبت والوں کے مشابہہ رہے، سوائے زمانہ حاضرہ کے۔

عجیب بات ہے کہ افغانستان کی پہاڑی قومیں، اپنی نامتغیر بلند چراگاہوں میں، سکندر یونانی کے زمانے میں بھی ویسی ہی تھیں۔ جیسی باہر کے عہد میں اور آج بھی ان کے نام تک قریب قریب وہی چلے آتے ہیں مزید برآں انہوں نے تاریخی انقلابات تماشائیوں کی طرح الگ رہ کے دیکھے اور بڑے بڑے واقعات عوامی حائلے میں لگائے رکھے۔ انہوں نے ان واقعات کو خود اپنے ہاں کی کمائیاں بنا لیا جو ان میں اس طرح معروف ہیں جیسے مقامی مزارات، گو ہمارے لئے بڑے بڑے پتھروں کے یہ سرراہ مقبرے نامعلوم اولیا کے ہیں اور ان کی مذکورہ بالا قسم کی کمائیاں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً سفید کوہ کے برفانی خط کے کنارے جو کرد قبائل آباد ہیں انہوں نے سکندر یونانی کا خود حصہ بتایا اور اسے تحریر بھی کر لیا ہے اس سکندر نامے میں یہ مشہور فاتح عجیب عجیب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اتھاہ سمندروں کی تہوں تک کھگل ڈالتا اور فرشتے عزرائیل کے ساتھ مل کر سد سکندری تعمیر کرتا ہے کہ یاجوج ماجوج دیو اس میں بند رہیں ---- اور یہ یاجوج ماجوج چنگیز خاں کے

لشکر ہیں۔

بابر کے باب میں یوسف زئی پٹھانوں نے اس کی آمد کا خود ہی افسانہ گھڑا اور اس میں عشق و محبت کی چاشنی دے دی ہے۔ اسے ایسے لطائف سے رنگا ہے کہ صداقت کا پابند مورخ تو سن کر کانپ جائے گا۔ بایں ہمہ یہ بابر کی ایک تصویر ہے جسے قبائلی حافظے سے اتارا گیا تھا۔

افغان بیگم کی اس نقل کا خلاصہ یہ ہے :

بابر جب کابل میں حکومت کرنے آیا تو شروع میں وہ یوسف زیوں پر مہربان تھا لیکن ان کے جانی دشمن دلاکوں کی باتوں نے اسے یوسف زئی سے سخت بدظن کر دیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ ملک احمد ان کے سردار کو جب وہ کابل آئے تو قتل کرا دے۔ دلاکوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ فوراً قتل کرانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ ایسا چالاک ہے کہ بولنے کا موقع مل گیا تو کسی نہ کسی طرح بادشاہ سے جان بخشی کرا لے گا۔

ملک احمد کی آمد پر بابر نے بڑا دربار لگایا۔ شہ نشین کے تخت پر متمکن ہوا۔ احمد نے آداب بجالانے کے بعد فوراً اپنے گھلے کی گھنڈیاں کھول دیں۔ بابر نے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ وہ چپ رہا۔ آخر تیسری دفعہ سوال کرنے پر جواب دیا : ”میں نے سنا ہے حضور مجھے اپنے ہاتھ سے تیر مار کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا اتنے بھرے دربار میں جب کہ سب کی نگاہیں ادھر لگی ہوئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ حضور کا وار خالی جائے۔ اسی سے اپنا بھاری گدے دار گلا ہٹائے دیتا ہوں کہ تیر پوری طرح کارگر ہو۔“

یہ بات سن کر بابر خوش ہو گیا اور اس سے کئی سوال کئے۔ ایک یہ تھا کہ سکندر کس قسم کا آدمی تھا؟

احمد نے کہا : ”خلعت عطا کرنے والا۔“

پوچھا : ”اور بابر؟“

احمد نے کہا : ”وہ زندگی عطا کرنے والا ہے، کیونکہ میری جان مجھے واپس دے گا۔“

بابر نے کہا : ”بے شک ایسا ہی ہو گا۔“

پھر تو بادشاہ ایسا مہربان ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر تختے میں احمد کو لے گیا اور وہاں انہوں نے تین دفعہ شراب پی۔ پہلے بابر تھوڑی سی پیتا پھر وہی جام احمد کو دے دیتا تھا۔ شراب کا نشہ چڑھا تو بابر مست ہو کر ناپچنے لگا۔ ملک احمد کے سازندے ساز بجاتے رہے اور خود ملک احمد

جو فارسی خوب جانتا تھا۔ ساز پر بہت عمدہ گانے گاتا رہا۔ بابر ناچتے ناچتے تھک گیا تو ہاتھ بڑھا کر کہا ”میں تمہارا رقاص ہوں (۵۲)“ لاؤ میرا انعام۔“ اس نے تین دفعہ مانگا اور ہر دفعہ ملک احمد نے ایک اثرنی اس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ اس طرح احمد بخیر و سلامت اپنی قوم میں واپس آیا۔

لیکن پھر بابر ان کے علاقے میں فوج لے کر آیا۔ ان کی زمینیں پامال کر ڈالیں مگر ان کا سُنڈ (قلعہ) نہیں فتح ہوا۔ تب بابر نے، جیسی اس کی عادت تھی، قلندر کا بھیس بھرا اور قلعے کے استحکام دیکھنے دیارن کے پڑاؤ سے ماہورہ پہاڑی پر گیا جہاں قلع واقع تھا۔ اس وقت (بہ تصحیح مترجم) عید قربان کا تہوار منایا جا رہا تھا اور ماہورہ پہاڑی کے عقب میں ملک احمد کے چھوٹے بھائی شاہ منصور کے ہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ آج کے دن تک یہ جگہ ”شاہ منصور کا تخت“ کہلاتی ہے۔ بابر بھیس بدلے ہوئے مکان کے پیچھے گیا اور صحن میں جہاں بھیڑ بکری تھی، کھڑا رہا۔ اس نے آنے جانے والے نوکروں سے معلوم کر لیا کہ شاہ منصور کے بال بچے اور ایک لڑکی بی بی مبارکہ نام ہے جو اس وقت دوسری عورتوں کے ساتھ ایک خیمے میں بیٹھی تھی۔ بی بی کی نظر قلندر پر پڑی تو اس نے روٹیوں میں سالن گوشت لپیٹ کر ایک نوکرانی کے ہاتھ اسے بھیجا۔ بابر نے پوچھا یہ کس نے بھیجا ہے۔ نوکرانی کے بتانے پر کہ بی بی مبارکہ نے، دریافت کیا وہ کہاں ہے؟ نوکر نے کہا ”وہ تمہارے سامنے والے خیمے میں۔“ پادشاہ نے جو اسے دیکھا تو خوبصورتی دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اس نے نوکرانی سے بی بی کی عمر اور مزاج کا پوچھا اور یہ کہ اس کی کہیں ملگنی تو نہیں ہوئی ہے۔ نوکرانی نے سنتے ہی کہا کہ جیسی وہ خوب صورت ہے، ویسی ہی خدا نے اسے نیک سیرت عطا کی ہے۔ عفت و حیا میں نظیر نہیں رکھتی اور نہایت متین اور خاموشی پسند ہے۔ تب بابر وہاں سے واپس ہوا، مگر آتے میں روٹی سالن وہیں ایک پتھر کے پیچھے چھپا آیا۔

لشکر گاہ میں واپس آکر اسے بہت اضطراب رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ قلعہ فتح نہ کر سکا تھا اور خالی ہاتھ کاہل جانے سے شرم آتی تھی، مزید برآں عشق کے جال میں پھنس گیا۔ آخر ملک احمد کو خط لکھا اور شاہ منصور کی بیٹی مانگی۔ احمد کو سخت اعتراض تھا، وہ اس کا سبب یہ بتاتا تھا کہ بابر کے چچا الغ بیگ اور خان میرزا لاغری سے بھی یوسف زئی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں، نتیجہ قوم کی خرابی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ دوسرے اس نے یہ بھی کہا کہ کوئی لڑکی شادی کے لائق موجود نہیں۔ جواب میں بابر نے بہت پر شکوہ شاہانہ مراسلہ بھیجا۔ جس میں اپنے

بھیس بدل کر شاہ منصور کے گھر جانے اور بی بی مبارکہ کو ایک نظر دیکھ لینے کا ذکر اور ثبوت میں گوشت روٹی پتھر کے پیچھے چھپا آنے کی شہادت لکھی تھی۔

احمد اور منصور پھر بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ لیکن قبیلے کے جرگے میں لوگوں نے اصرار کیا کہ پہلے بیٹیاں دی جا چکی ہیں تو اب بی بی مبارکہ کو دینے سے انکار کرنا اور پادشاہ کو قبیلے کا دشمن بنانا درست نہ ہو گا۔ ملکوں نے کہا ”اگر قبیلے کی اس میں بھلائی ہے تو بہت اچھا۔ یونہی سی۔“

باہر کو رضامندی کی خبر پہنچی تو خوشی کے نقارے بجنے لگے۔ جشن برپا ہوا۔ دلہن کے لئے بیش بہا تحائف بھیجے گئے جس میں ایک تلوار بھی تھی۔ ادھر سے دونوں ملک بیٹی کو لے کر موضع تلش کے باہر تک آئے جہاں شاہی محافظ پیشوائی کو آئے تھے۔ منصور آئے تھے۔ منصور کے گھر کی پرانی دایہ رو نہ اور بہت سے نوکر چاکر بی بی مبارکہ کے ہمراہ شاہی لشکر گاہ میں گئے۔ اس کے عین وسط میں بہت بڑا خیمہ نصب تھا۔ دلہن کو بڑے اعزاز اکرام سے اس میں اتارا گیا۔ اس رات اور دوسرے دن امراء کابل کی بیویاں ملنے کے لئے آتی رہیں۔ بی بی نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی اور ان کی رائے ہوئی کہ ”بے شک دلہن بہت خوبصورت ہے لیکن ہمارے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آئی، اس میں دیکھ لینا کچھ بھید کی بات ہے۔“

بی بی مبارکہ نے اپنی نوکرانیوں سے کہہ دیا تھا کہ پادشاہ کے آنے کی خبر رکھیں۔ ملک احمد نے جس طرح بتا دیا تھا، وہ اسی کے مطابق پادشاہ کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔ نوکروں نے اس سے کہا ”باہر بہت گہما گہمی اس لئے ہو رہی ہے کہ پادشاہ نماز پڑھنے جامع مسجد میں جانے والے ہیں۔“ پھر اسی روز بعد نماز انہوں نے خبر دی کہ ”پادشاہ تمہارے خیمے کی طرف آرہے ہیں۔“ بی بی مبارکہ فوراً تخت سے اتر کے قالین پر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی خوبصورتی نے فرش کو چار چاند لگا دیئے مگر پادشاہ اندر آئے اور وہ بہت جھک کر آداب بجالائی تو بھی اپنے چہرے سے نقاب نہ ہٹائی۔ پادشاہ دیر تک اسے تکتا رہا، پھر تخت پر بیٹھ کر بولا۔ ”میری افغانی بیگم، آؤ میرے پاس آکر بیٹھو۔“ اس نے پھر جھک کر آداب کیا لیکن آگے نہیں بڑھی۔ دوبارہ پادشاہ نے بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ کسی قدر بڑھ کر قدم بوس ہوئی۔ پادشاہ نے بیقرار ہو کر کہا ”اجی آؤ، آؤ، بیٹھ جاؤ اس نے چہرے سے نقاب ہٹائی اور اپنا دامن بھی اوپر اٹھایا۔ پادشاہ دیکھ کر کھل گیا۔ بی بی نے کہا مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

اجازت ہو تو عرض کروں؟“ بادشاہ نے کمال عنایت سے کہا ”کہو کیا کہنا ہے۔“ تب بی بی نے کہا ”سمجھ لیجئے کہ ساری یوسف زئی قوم میرے دامن میں اکٹھی ہے۔ میری خاطر ان کے قصور معاف کر دیجئے۔ باہر نے جواب دیا ”میں نے یوسف زئی کے سب قصور معاف کئے تمہارے سامنے ان کو تمہارے دامن میں ڈال دیا۔ اب میرے دل میں یوسف زئی سے کوئی کدورت نہیں رہی۔“

وہ پھر جھک کر آداب بجالائی۔ بادشاہ ہاتھ پکڑ کر اسے تخت پر لے گیا۔ جب نماز عصر کا وقت ہوا، بادشاہ تخت سے اٹھا تو بی بی مبارکہ جلدی سے کودی اور اس کی جوتیاں لا کے رکھیں۔ بادشاہ نے جوتی پاؤں میں ڈالی۔ خوش ہو کر کہا۔ ”میں تم سے بہت خوش ہوا۔ تمہاری خاطر ساری قوم کی خطائیں بخش دیں۔“ پھر مسکرا کر کہا ”یہ بات ضرور ملک احمد نے تم کو سکھائی ہو گی۔“ وہ نماز کے لئے گیا۔ بی بی مبارکہ نے اپنے خیمے میں نماز کی تیاری کی۔

مضبوط اور بڑے قلعے کی تسخیر

اس پٹھانی لاف و گزاف کی داستان عشق میں، حقیقت کا اچھا خاصا جزو موجود ہے۔ بی بی مبارکہ واقعی کابل کی حرم سرا میں داخل تھی اگرچہ تیوری نہ ہونے اور محض قبائلی بیٹی، نیز کم عمر ہونے کے باعث دوسری بیگمات سے کچھ الگ الگ رہتی تھی۔ باہر سے کوئی اولاد اس کے ہاں نہ ہوئی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مشوروں میں حصہ لیتی اور پٹھانوں کے بے شکے مزاج کے متعلق سمجھاتی رہتی تھی۔ مع ہذا اپنی قوم یوسف زئی کی حمایت کرتی، جس طرح قدیم ایرانی بادشاہ زر کبیر (زریر) کے روبرو ملکہ استھر سفارش کیا کرتی تھی۔ محل سرا میں اور لوگ اسے ”افغانی بیگم“ موسوم کرتے تھے۔

باہر کی تزک دوبارہ ۹۲۵ھ (۱۹-۱۵۱۸ء) کی سردیوں سے شروع ہوتی ہے۔ اتنی مدت کے خلا کے بعد تحریر زیادہ دو ٹوک اور باریک نگاہ ہو گئی ہے۔ اس میں یوسف زئی سے قول و قرار اور بی بی کو حوالہ عقد میں لانا اس کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ان جاؤں میں بڑی جمیعت لے کر وہ بالائی سندھ پر تاخت کرنے چلا تھا۔

”جمعہ کو یوسف زئی افغانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے سواد (سوات) کی جانب کوچ ہوا..... شاہ منصور یوسف زئی خوش ذائقہ، نہایت نشہ آور مٹھائی تختہ“ لے کر آیا۔ ایک

حصہ میں نے کھایا۔ ایک طغائی کو، تیسرا عبداللہ کتاب دار کو دیا۔ اس میں ایسی منشیات ملی تھیں کہ مغرب کے بعد امرا مشورے کے لئے جمع ہوئے تو میں خیمے سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ عجیب ہی نشہ تھا۔ ایک زمانے بعد تو اگر میں تینوں حصے کھا لیتا تو بھی مجھے اتنا نشہ نہ ہوتا..... اسی علاقے میں تھے جب یہاں ٹخنوں ٹخنوں برف پڑی۔ ایسا شاز و نادر ہوتا ہو گا، کیونکہ مقامی لوگ بہت حیران ہوئے۔ سلطان (بہ تصحیح مترجم) اولیس سوادى کے مشورے سے یہاں والوں سے چار ہزار خردار چاول لشکر کے واسطے لینے تجویز ہوئے۔ سلطان اولیس ہی لانے کے لئے بھیجا۔ ان جنگلی پہاڑیوں نے اتنا محصول کبھی نہیں بھرا تھا..... یوسف زئی قوم کی خاطر میں نے اپنے خیر خواہ ملک شاہ منصور کی بیٹی کی خواستگاری کی تھی جب کہ وہ اپنی قوم کا وکیل بن کے آیا تھا..... ہم اسی پڑاؤ پر تھے کہ اس لڑکی کے یوسف زئیوں کے خراج کے ساتھ آنے کی اطلاع ہوئی۔ شام کو شراب نوشی کا جلسہ ہوا جس میں سلطان سواد کو شریک کیا اور خلوت خاص دی گئی۔ کوچ کرتے ہوئے آگے چلے تو شاہ منصور کا بھائی طاؤس خاں اپنی بھتیجی کو اگلے پڑاؤ پر لایا.....

امرا اور دلاک (دلہ زاک) سرداروں سے مشاورت ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ سال ہلائی ختم ہو رہا ہے۔ برج حوت کے دو دن رہ گئے ہیں۔ کاشتکار فصلیں اٹھا کر لے جا چکے ہیں۔ اب سواد کی سواری میں بڑھے چلے گئے تو غلہ میسر نہ آنے سے لشکر کم رہ جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ سواد ندی سے پار ہو کر ان یوسف زئیوں پر تاخت کی جائے جو اپنے قلعے ماہورہ کے نیچے میدانوں میں ہیں (مگر سردیوں میں یہ حملہ نہ ہو) آئندہ کسی برس کچھ پہلے آکر فصلوں کے تیار ہونے کے وقت ان کی خبر لی جائے۔"

ان یادداشتوں میں افغانی افسانے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں :-

یوسف زئی وکیل کے سامنے بابر کا نشہ میں متوالا ہونا۔ بی بی مبارکہ کا اپنے قبیلے کے خراج کے ساتھ آنا۔ پھر اس قبیلے پر حملے کا ملٹوی کر دیا جانا۔ وغیرہ۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بابر نے پھر کبھی یوسف زئیوں کی چراگاہوں یا مزدورہ اراضی پر حملہ نہیں کیا اور عجب نہیں کہ اس گھومنے والے بادشاہ اور اس طاقتور قبیلے میں (جو وادی سوات کی پہاڑی بلندیوں پر بے ہوئے تھے اور سندھ کو جانے کا ایک راستہ ان کی زد میں تھا) مفاہمت کا بڑا سبب بی بی مبارکہ کی کوشش ہوئی ہو۔

وفادار قاسم بیگ کی ایک آخری کارگزاری یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے بادشاہ اور ان

آتشیں اسلحہ کا ذکر آیا ہے۔

”جعفرات کو حکم دیا گیا کہ فوج والے زرہ اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سوار ہو جائیں۔ میسرے کو قلعے کے بالائی رخ پر ندی پار کر کے شمال میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ قول (قلب لشکر) کو ندی اترے بغیر شمال مغرب کے ناہموار میدان میں، اور سینے کو دروازہ قلعہ کے مغرب میں گھوڑوں سے اترنا تھا۔ جب دولت بیگ اور میسرے کے سردار مذکورہ بالا جگہ پر پہنچے تو سو ڈیڑھ سو آدمیوں نے قلعے سے نکل کر حملہ کیا اور تیروں کی بوچھاڑ کی۔ میرے سپاہیوں نے جواب میں تیر چلائے اور قلعہ والوں کو دھس تک پیچھے ہٹا دیا۔ عبدالملک (بہ تصحیح مترجم) خوشی دیوانہ وار گھوڑا دوڑاتا ہوا فصیل کے نیچے تک پہنچ گیا۔ اگر سیڑھیاں تیار ہوتیں تو ہم قلعے کے اندر داخل ہو جاتے بجور والوں نے ہندو قیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ان سے نہیں ڈرے بلکہ ہندو ق دغنے کی آواز سن کر بھی سامنے کھڑے بیہودہ حرکتیں کرتے رہے۔ اس روز استاد علی قلی نے اپنی توڑے دار ہندو ق سے پانچ آدمیوں کو نشانہ بنایا۔ دوسرے تفنگ اندازوں نے بھی اچھا کام کیا۔ ان کی گولیاں زرہوں تک کو توڑ گئیں۔ ڈھالوں اور چمڑے کے پردوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ شام ہوتے آٹھ دس بجوری مارے گئے اور پھر انہوں نے ڈر کے مارے دھسوں کے اوپر سر نہیں نکالا۔ رات ہوتے میں نے حکم دیا کہ آلات قلعہ گیری تیار کئے جائیں۔

جمعے کو صبح ہوتے ہی جنگی طبل بجوا دیئے اور سب عسکری اپنی اپنی مقررہ جگہ ‘ زرہیں پہن، زینے لے کر پہنچ گئے..... اس دن بھی استاد علی قلی نے خوب کام کیا اور دو دفعہ آتش فرنگ (ہندو ق) چلائی محمد علی دنگ دنگ اور اس کے چھوٹے بھائی نے زینوں سے چڑھ کر برچھوں کے جواب میں تلواریں ماریں۔ بابا یساول فصیل پر چڑھ گیا اور تبر مار مار کر اس کو توڑتا رہا پھر اور سپاہیوں نے ہجوم کیا مگر فصیل کے اندر سب سے پہلے یہی داخل ہوئے چاشت کا وقت تھا جب کہ شمال مشرقی برج کو دولت بیگ کی جمیعت نے گرا لیا اور اندر گھس گئی۔ دشمن کو مار بھگایا اور عنایت الہی سے ایسا مضبوط، زبردست قلعہ دو تین ساعت نجومی کے اندر لے لیا گیا۔

اہل بجور باقی بے دین تھے کہ اسلام کا نام تک اپنی قوم سے اڑا دیا تھا۔ لہذا انہیں قتل کیا اور بال بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ قیاساً ”کوئی تین ہزار مرد مارے گئے۔ تھوڑے سے قلعے کے مشرقی پہلو سے بچ کے نکل گئے۔ پھر میں قلعے کے معائنے کے واسطے داخل ہوا۔

فصلوں، گلیوں، مکانوں میں مقتول پڑے تھے۔ چلنے والے لاشوں پر سے گزرتے تھے۔ سلطان بجور کے محل میں میرا قیام ہوا۔ یہ ولایت خواجہ کلاں کے تفویض کی گئی۔ نماز مغرب کے وقت میں اپنی لشکر گاہ میں واپس آ گیا۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجور والوں کا قلعہ نہ بہت بڑا تھا نہ مستحکم۔ انہوں نے آتشیں اسلحہ نہیں دیکھے تھے اور نہ کسی باقاعدہ فوج کے حملے کا سامنا کیا تھا۔ کرشی میں ایرانیوں کے قتل عام کرنے سے بابر کو بہت رنج ہوا تھا مگر یہ قلق بھی خود اسے شکست خوردہ پہاڑیوں کو بے تحاشا قتل کرانے سے باز نہ رکھ سکا۔

قلعے پر اس تیز و تند یورش کا حال پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دس برس کے عرصے میں بابر کی فوج کس قدر بدل گئی تھی۔ تربیت یافتہ سردار اپنا کام خوب جان گئے تھے اور خود شریک ہوئے بغیر وہ انہیں اپنے آپ کام انجام دینے کی اجازت دیتا تھا۔ دوست بیگ کے سوائے سرداروں کے نام بھی نئے نئے سننے میں آتے ہیں۔ غالباً یہ شمالی مہاربات سے بچ کر آنے والے لوگ تھے۔ وہ اب ساز باز یا بھاگ جانے کی تدبیریں نہیں کرتے۔ ناخواندہ مگر جاں نثار قاسم بیگ کی جگہ خواجہ کلاں لیتا ہے جو ذی علم، سیاست داں اور عمر شیخ میرزا کے ایک وزیر فرغانہ کا فرزند تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بابر کسی نہ کسی طرح یورپی اسلحہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں توڑے دار بندوقیں اور دو ایک توپیں بھی تھیں۔ یہ آتشیں اسلحہ اس کے پاس کس طرح پہنچے، یہ کیفیت ترک کے گذشتہ سالہ اوراق کے ساتھ گم ہو گئی۔ توپ و تفنگ چلانے والوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عثمانی ترک تھے جو دو تین پشت سے توپ خانے، حتیٰ کہ بڑی قلعہ شکن توپوں سے بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ البتہ کسی ترک کا ایرانیوں میں سے گزر کر جو ترکوں کے جانی دشمن تھے، اپنی فنی مہارت کے ساتھ کابل پہنچ جانا حیرت میں ڈالتا ہے۔ بہر حال یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہو گا کہ یہ کارگر ہتھیار اس وقت بحر خزر کے مشرق میں صرف بابر کے قبضے میں تھے۔ اسے ان کا بڑا شوق تھا اور وہ آئندہ برابر ان سے مفید کام لیتا رہا۔

سپاہیوں کی بہادری پر بدستور اس کی نظر رہتی تھی اور ان کی جانبازی کا دل کھول کر انعام دیتا تھا۔ وہ اس پر بھروسہ رکھتے تھے اور اسی سے وہ وفاداری آئی جو مختلف اقوام کے افراد پر اس کی بادشاہی کی پختہ بنیاد بنی۔ اتنا ضرور ہے کہ قاسم بیگ کے بغیر بابر کی سنگ دلی خونریزی کی روش بناتی چلی گئی۔

اپنے اہل خدمت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح بے تکلف ہونے کا ڈھنگ اسے خوب آتا تھا۔ وہ ان کے روزانہ مشاغل کی خبریں رکھتا۔ ایک دن لکھتا ہے کہ درہ خیبر سے ہم واپس آئے تو دوست بیگ کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ ایک اور دن کی یادداشت میں ہے کہ ”آج میری سب سے اچھی بھری کھوئی گئی۔ میرا شکار نے اسے لق اور قاز کو بڑی خوبی سے مارنا سکھایا تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین دفعہ اڑ گئی تھی۔ شکار پر اس طرح بے خطا جھپٹا مارتی تھی کہ مجھ جیسا اناڑی آدمی بھی نہایت کامیاب شکاری ہو گیا تھا۔ شکار میں اپنے آدمیوں کی کارگزاری دیکھنے میں باہر اسی قدر توجہ رکھتا تھا جیسی میدان جنگ میں۔ بڑے شکار کی خاطر اس کے عسکری کوچ ملتوی کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر لکھتا ہے: ”آج علی الصباح جنگل سے شیر کے دھاڑنے کی آوازیں آئیں۔ دیر نہ گزری تھی کہ وہ باہر نکل آیا۔ ہمارے گھوڑے بے قابو ہو کر ایک دم ڈھلانوں، کھڈوں کی طرف بھاگے۔ شیر جنگل میں واپس چلا گیا۔ میں نے حکم دیا، جھاڑیوں کے پاس بھینسا لا کر باندھو کہ شیر پھر باہر آئے۔ وہ پھر دوڑتا ہوا نکلا۔ ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی۔ میں نے بھی ایک تیر مارا۔ خواجہ پیادہ نے بڑھ کر برچھا مارا تو اس نے بل کھا کے پھل کو منہ میں لے کر چبا ڈالا۔ تیروں کے بہت سے زخم کھا کے وہ پھر گھسٹتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ بابا یساول تلواری کھینچ کے پیچھے پیچھے گھسا اور اس کے جست لگانے سے پہلے سر پر تلواری ماری۔ ایک اور تلواری علی سیستانی کی کولھے پر پڑی۔ شیر (بھاگ کر) قریبی ندی میں کودا، وہاں اسے لوگوں نے مار ڈالا اور باہر کھینچ لائے۔ میں نے حکم دیا اس کی کھال اتار کر الگ رکھو۔“

وادی سندھ میں تاخت کر کے گرمیوں کے آخر میں فوج واپس آ رہی تھی جب کہ درہ خیبر کے قریب جلسہ شراب نوشی کے لئے قیام ہوا۔ کسی مقامی رئیس نے باریاب ہو کر تجویز کی کہ آفریدیوں پر حملہ کیا جائے۔ وہ درے کے نواح میں فصل اٹھانے کے لئے بال بچوں سمیت مقیم تھے۔ باہر نے قبول نہ کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت یوسف زئی کی فکر ہے۔ خواجہ کلاں کو سفر کی مختصر کیفیت لکھی تو خط کے حاشیے پر یہ شعر خود گھسیٹ دیا ۔

صبا بہ لطف بگو آل غزال رعنا را
کہ سر بکوه و بیاباں تو داده مارا

اس کی مخاطب بی بی مبارکہ تھی (۵۳) جسے حفاظت کی خاطر خواجہ کلاں کے پاس بجز

چھوڑ گیا تھا۔

ہل ہل کی میخواری

بابر کو نئی چیز معلوم کرنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ بھور میں بھورے بال، سفید چہرے کے بندر نظر آئے بڑی دیر تک ان کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ معلوم ہوا مداری انہیں سدھا کر طرح طرح کے تماشے کرنے سکھاتے ہیں۔ کابل میں کسی عورت کو مے نوشی کرتے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ اس نادر چیز کا تجربہ کیا جائے ایک روز جمعے کی شام کو شراب کے مزے لے رہا تھا اور بارہ سالہ بیٹے ہمایوں کو مرغائیاں شکار کرتے دیکھ رہا تھا۔ آدھی رات تک نیند نہ آئی تو نوکروں کو چھوڑ کر چار باغ سے بازاروں کا گشت لگاتا ہوا چلا اور صبح ہوتے تردی بیگ کی کاریز پر پہنچا۔ تردی بیگ پستہ قامت ترک تھا جس نے فقیری چھوڑ کر سپہ گری اختیار کی اور فوج کا بہت اچھا سردار بنا تھا۔ ”وہ میرے آنے کی خبر سن کر چھوٹی چھوٹی ٹانگوں ہی سے دوڑا ہوا آیا۔ مجھے (بہ تصحیح مترجم) اس کی مفلسی کا حال معلوم تھا اور کوئی ایک سو شاہرخیاں (سکے) ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اسے دیئے کہ شراب خرید لائے اور ایک بے تکلف جلسے کا انتظام کرے۔ وہ ہنرادی گاؤں کو شراب لانے گیا اس کا غلام میرا گھوڑا نیچے درے میں لے گیا۔ میں کاریز کے پیچھے ایک ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ کوئی ایک پہر میں تردی بیگ شراب کی ایک ٹھلیا لایا اور ہم نے باری باری پینی شروع کی۔ تردی کے پیچھے پیچھے قاسم برلاس اور شاہزادہ بھی آئے۔ ٹھلیا لاتے دیکھ کر انہیں شبہ ہوا اور تردی بیگ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میری ان کو خبر نہ تھی۔ غرض میں نے انہیں بھی بلا کر شریک صحبت کیا۔ تردی بیگ نے کہا ہل ہل آنگہ (۵۳) بھی آپ کے ساتھ شراب پینا چاہتی ہے۔ میں نے کہا ”آج تک میں نے کسی عورت کو شراب پیتے نہیں دیکھا۔ اسے بلا لو۔“

اتنے میں ایک قلندر وہاں آ نکلا ہم نے اسے اور کاریز کے ایک نوکر کو بھی بلا لیا۔ جس نے عود بجایا۔ شام تک یہ جلسہ ٹیلے پر جما رہا۔ پھر ہم تردی بیگ کے مکان میں گئے اور چراغ کی روشنی میں عشاء تک دور چلا بڑے مزے کی بے تکلف صحبت رہی۔ میں ذرا لیٹ رہا۔ دوسرے لوگ ایک اور مکان میں اٹھ گئے۔ آدھی رات کو ہل ہل پھر آئی اور مجھے بہت دق کرنے لگی۔ میں نے نشے میں مدہوش گر جانے کا بہانہ کر کے اس سے پیچھا

چھڑایا۔

عورت کا قصہ طے ہونے کے بعد اور دو دن تک باغوں کی سیر ہوتی رہی۔ موسم خزاں میں، صبح کے وقت یہ نہایت دلاویز ہوتے تھے۔ ان میں بابر انگور کھاتا اور مناظر قدرت کا لطف اٹھاتا رہا۔ ایک خزاں رسیدہ سیب کا درخت دیکھ کر خاص طور پر وجد کرتا ہے کہ ”اس کے خزانے پتے اتنے حسین تھے کہ کسی مصور کا مو قلم ایسے نہیں بنا سکتا۔“

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شیر جسمانی تندرستی اور دماغ کی بیداری ایسی غیر معمولی رکھتا تھا کہ نشہ شراب سے مغلوب نہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس حالت کو پہنچنے کے لئے وہ کبھی کبھی شراب میں دو آتش، سہ آتش ”عرق“ ملا لیا کرتا تھا۔ پنجاب پر حملے کے دوران میں ایک دن پٹی کر دریا پر کشتی میں سوار ہوا۔ وہاں بھی عشا کے وقت تک ہم عرق پیتے رہے۔ جب اندھیرا بڑھا تو کنارے پر کشتی لگا کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ مشعلیں ہاتھ میں تھیں۔ گھوڑے دوڑاتے میں کبھی ایک طرف لڑھکتے کبھی دوسری طرف۔ میں نشے میں حیوان لا عقل ہو رہا تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے بتایا کہ میں بگ ٹ گھوڑا دوڑاتا، مشعل گھماتا ہوا لشکر گاہ میں داخل ہوا تو یہ بات مجھے مطلق یاد نہ تھی۔“

بابر تنہا کبھی نہ پیتا تھا۔ شراب کشی کے جلسوں میں موسیقی اور گپ شپ ہوتی رہتی۔ تاہم شراب کے ساتھ معجون کھا کھا کر بھی جب لوگ متوالے ہو جاتے تو وہ ان کی خبر رکھتا تھا۔ لکھتا ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) شرابی اور معجونی کی کبھی نہیں بنتی۔ ایک بار کشتی میں یاروں کے ساتھ شراب کی محفل جبی۔ آسمان پر قوس قزح بہار دکھا رہی تھی۔ کشتی میں عرق کا دور چل رہا تھا۔ عرق پیتے پیتے اکتا گئے تو ہم نے بھنگ پینی شروع کی۔ کشتی کے گوشے والوں کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ وہ شرابیں پیتے رہے۔ نماز عشا کے وقت کشتی سے اتر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کافی دیر سے ڈیروں میں پہنچے۔ محمد (بیگ) اور گدائی یہ سمجھ کر کہ میں صرف عرق پی رہا ہوں، شراب کی ایک گھڑیا، کارگزاری دکھانے کو لائے۔ باری باری گھوڑوں پر اسے رکھ لیتے تھے۔ نشے میں مگن اور مست ہو رہے تھے۔ کہنے لگے ”اس اندھیرے میں آپ کے لئے ہم یہ گھڑا بھر شراب لاد کر لائے ہیں۔ باری باری سے اٹھا کر چلتے رہے۔“ میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ اور نشہ کر رہا ہوں۔ بھنگ نوش اور شراب خواروں کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ قریب تھا کہ آپس میں جھگڑا ہو جائے۔ میں نے کہا ”صحبت کا مزہ مت خراب کرو۔ جس کا جی چاہے شراب پیئے اور جو چاہے بھنگ“ (معجون)

---- چنانچہ اسی کے مطابق الگ الگ شغل ہونے لگا۔ بابا جان ”قابوس“ (ساز) نواز نے شاہی خیمے میں عرق پینا پسند کیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھنگ نوشوں پر پھبتیاں کسے لگے۔ بابا جان نشے میں دھت ہو کر واپس تباہی بکنے لگا۔ یہ لوگ تروی بیک کو جام پر جام بھر کر پلاتے رہے کہ وہ بھی نشے میں بے سدھ ہو گیا پھر جو دھاندلی مچی، میرے سنبھالے نہ سنبھلی۔ ہنگامے اور ہشت مشمت نے مزا کر کر دیا۔ اسی بے لطفی میں جلسہ برخاست ہوا۔“

بابر کا غور اپنی حالت پر

شراب خواری کے ان بے محابا جلسوں میں، بلکہ دھینگا مشیتوں میں بھی اوقات نماز کا بار بار ذکر آتا ہے۔ یہ ازراہ تمسخر نہ تھا۔ فجر۔ دوپہر۔ سہ پہر، مغرب اور عشا کی اذان دن کے چند حصوں کی واضح نشانی تھی۔ بابر، وقت کا جسے اب ہم گھنٹوں میں شمار کرتے ہیں، اندازہ لگانے کا خاص مادہ رکھتا تھا (اس کے سامان میں گھڑی گھنٹے شامل نہ تھے اور نہ اس وقت تک یورپ میں بننے تھے۔ بجز کچھ انگلیٹ آلات کے۔ تاہم اس کے تعلیم یافتہ ترک اور ایرانی مصاحب ہیات کا علم ضرورت کے مطابق رکھتے تھے۔ ان کے پاس برنجی تختیوں پر بڑے بڑے شہروں کے نام اور عرض بلد کھدے ہوئے ہوتے اور ایک سوئی تاریخی قوس پر سایہ ڈال کر وقت کا اندازہ بتاتی تھی۔ سوئی کا رخ قطب شمالی کی طرف رکھا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کی ”سماعت نجومی“ یا گھڑی ہوتی جس کا بابر کی تحریر میں اکثر ذکر آتا ہے۔ دن کا آغاز غروب آفتاب سے کرتے اور سال، قمری ہوتا تھا)۔

بابر کے ہم نشین مخمور ہونے کے متعین مقصد سے شراب پیتے تھے۔ (فرنگیوں کی طرح) کھانا کھاتے میں چسکی لگانا ان کے نزدیک فضول حماقت کی بات تھی۔ بابر کے اجداد خانہ بدوشی کے زمانے سے چھک کر پینے کے عادی تھے اگرچہ بعض لوگ نہیں بھی پیتے تھے۔ اس کے آخری چچا حسین با۔ قرا کے ہاں یہ میخواری کے جلے صرف سرشام یا سرشب جما کرتے تھے۔ عمر شیخ میرزا آگے چل کر آٹھ آٹھ دن رنگ رلیوں میں مست رہتا اور دونوں کا مزاج آخر میں، نشے میں یا بغیر نشہ بھی، غیر متوازن ہو گیا تھا۔ بابر بھی تیزی سے انہی کے قدم بہ قدم جا رہا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی تو زیادہ تر اسی کثرت شراب خواری سے جوانی میں مر گئے تھے۔ بابر سخت معرکوں کے وقت، کبھی کبھی پینی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ اس عادت بد کی خرابیوں سے بے خبر نہ تھا۔ لکھتا ہے ”میں نے اپنے ہاتھوں زندگی بگاڑی ہے اور

سوائے اس کے کہ خدا رحم فرمائے میرا شمار بھی دوزخیوں میں ہو گا۔“ اس کے تاثرات طرح طرح کے عجیب ہوتے تھے جنہیں وہ اپنی خواہش کا نتیجہ سمجھتا ہے ارادہ کیا تھا کہ چالیس برس کی عمر میں شراب چھوڑ دے گا۔ اب جو یہ سال قریب آتا چلا تو اس نے اور زیادہ پینی شروع کر دی نئے باغوں میں انگور کی کثرت دیکھ کر اس سے رہا نہ جاتا اور سبزہ و گل کی سیر میں لطف سے کشی کا اضافہ کرنے چلتے چلتے گھوڑے سے اتر پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ پچیش اور تیز بخار میں خون بھی آنے لگا تو اسے اپنے اعمال، خصوصاً ہزل نویسی، پر پشیمانی ہوئی کہ جس قلم سے حضرت جامی کی تقلید میں اسمائے حسنہ لکھے جائیں، وہی قلم ہزل سے آلودہ ہو۔ نیت کر لی کہ آئندہ ایسی شاعری نہ کرے گا اور قلم توڑ ڈالے گا۔ پھر افاقہ ہوا تو کلہل میں ایک دل پسند پہاڑی شراب کا چھوٹا سا حوض سرخ رنگ ساق سے بنوایا۔ یہاں گرمی کی راتوں میں رنڈیوں کے ناچ اور مطربوں کا گانا ہوتا۔ حوض کے کناروں پر اپنا شعر کھدوایا تھا جسے لافانی شاعری تو نہیں کہہ سکتے مگر افکار وہی تھے جو کبھی استاد ہیات حکیم عمر خیام، بلکہ خود حضرت جامی کے ذہن میں نفلش پیدا کرتے ہوں گے :-

”نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش ایست
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“

بابر ترنگ میں آکر شعر کہا کرتا تھا، خواہ ناصحانہ ہوں یا رندانہ۔ تیوری دور میں اعلیٰ قابلیت کی نشانی یہی تھی کہ مضمون کے مناسب بندش الفاظ میں آدنی استادی دکھائے۔ اگرچہ ترکی شعر لکھنے میں بابر کو علی شیر نوائی سے سبقت لے جانا کبھی نصیب نہ ہوا۔ تاہم اس کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے وہ متین خیالات کو نغے کی زبان میں ادا کرنے کا قدرتی میلان رکھتا ہے۔ اس پر اثابت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خواجہ احرار کے ارشادات کو ترکی میں نظم کرتا کہ عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔ ضلع جگت میں اسے بہت لطف آتا اور بلاغت و بیان پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ ایک نیا رسم الخط ”بابری“ بھی ایجاد کیا تھا۔ شاعر پیشہ اشخاص سے مسابقت کرنے میں اسے باک نہ تھا مگر تعجب ہے کہ موسیقی کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتا اور انوکھی، من مانی قسم کی راگنیاں نکالنے کے سوا، شاذ و نادر ہی کوئی ساز بجاتا ہو گا۔ ہاں دوسروں کے ساز بجانے پر اچھی یا بری رائے لگانے سے باز نہ رہتا تھا۔

سالہا سال وہ خود ایک بڑی مثنوی ”مبین“ لکھنے میں مصروف رہا۔ یہ اپنے بیٹوں ہمایوں اور کامران کو اس کی نصائح ہیں۔ ترکی زبان میں عقائد و اعمال کے سوا حکمرانوں کے مالی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی کی طرز مولانا رومیؒ اور صوفی شعرا سے لی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور عملی نصیحتوں کو گویا نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ممکن ہے اپنے بیٹوں کو اسے پڑھنے میں ترغیب کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا ہو اور یا یہ کہ اپنے ذوق کی تسکین مقصود ہو۔ یہ مثنوی جزء ”روسی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا بابر کی ان تجاویز کا پتا دیتا ہے جو سرزمین افغانہ سے اخذ محصول کے بارے میں اس نے سوچی تھیں۔ چونکہ آئندہ وارث ہونے والے بیٹوں کے واسطے لکھی ہیں۔ لہذا انہیں اس کی آخری رائے سمجھنا چاہئے کہ وہ اس مفلس ملک کے مستقل کاشتکاروں اور قبائلی لوگوں سے کس طرح مالیہ وصول کرنا مناسب سمجھتا تھا۔ اسے پڑھ کر منکشف ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس مملکت میں تیوریوں کا وہ جاگیرداری نظام جو سمرقند میں رائج تھا کہ بڑی بڑی جاگیریں امرا کو دے دی جاتی تھیں اور وہ بٹائی کے اصول پر مالیہ لے کر حکومت کو مقررہ محصول ادا کرتے تھے، چلانے سے دستکش ہو گیا تھا اور اس کی بجائے اراضی، گلے اور تجارت پر براہ راست محصول عاید کرنا چاہتا تھا۔ زمین کا مالیہ بہت کم رکھا تھا اور پیداوار کا لحاظ کئے بغیر بیانیہ پر شرح مقرر کر دی تھی کہ مزارعین کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کی ترغیب ہو۔ پھل کے درختوں پر خواہ کاشت کئے گئے ہوں یا خوردو، سالانہ پیداوار کا ایک عشر لگایا تھا۔ بھیڑ بکری کے گلوں پر فی صد ایک راس لی جاتی تھی۔ گائے بیل میں تیس پر ایک، گھوڑوں میں چالیس پر ایک جانور، اور اونٹوں میں پانچ پر کسی سے ایک بھیڑ مقرر تھی۔ گلے والوں کو اختیار تھا کہ جنس کے بجائے اس کی قیمت سکے میں ادا کر دیں۔ مقامی تاجر نیز آنے والے کاروانی تاجروں سے یہ بازاری یا درآمد کا محصول لیتے تھے اور غیر مسلم یعنی ہندو اور یہودی مال کا بیسواں حصہ ادا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کابل کے خزانے میں زیادہ تر اجناس جمع کی جاتی تھیں۔ اور ان کا بڑا حصہ بازار کے دکانداروں اور گلہ بانوں سے وصول ہوتا تھا۔ بابر کو ہمیشہ ٹوہ رہتی تھی کہ کوئی خرابی پیدا ہو تو خود تفتیش کرے۔ نئے نئے تجربوں کا شوق راج سے (کاریزیں) بنوانے اور باغ لگانے سے پورا کرتا تھا۔ اور جگہ جگہ پھر کر باغ لگوانے کی بدولت ”باغبان بادشاہ“ (یا باغ ساز) کہلانے لگا تھا۔

گلبدن بیگم کے وقائع

بابر کی سرگزشت میں تیسری دفعہ پھر ایک خلا آتا ہے۔ یہ ۱۵۲۰ء کے اوائل میں جاڑے کے ایک دن سے شروع ہوا جس میں وہ خوشی خوشی قرآن مجید کی ایک سورۃ تلاوت کرتا ہے، پھر کابل آتے ہیں وہ ایک ندیوں کو پایاب عبور کرتا ہے اور مغرب کے قریب آرام لیتا ہے کہ گھوڑے جو (دانہ چارہ) کھالیں۔ یہاں سے ترک منقطع ہونے کے بعد پھر ۱۵۲۲ء میں وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ ان چھوٹے ہوئے سنن کے واقعات کا حوالہ کہیں کہیں آگے آیا ہے لیکن دوسری شہادتیں بہت کم میسر آتی ہیں۔ حیدر میرزا دوغلات ان دنوں سعید خاں سے غلگت تھا، جو کاشغر میں حکومت کر رہا تھا اور بلند پہاڑوں کے پار کے حالات سے اس کا قریب قریب کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ مورخ خواند میر صفوی دربار میں رک گیا اور کابل کے پہاڑی گوشہ مخمول کی خیر خبر لینے کے بجائے، بزرگ تر واقعات کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بایں ہمہ قرائن موجود ہیں کہ کابل کی حالت اچھی تھی ذرائع آب پاشی کی بدولت فصلوں کی پیداوار بڑھ گئی اور باہر سے منگائی ہوئی قلمیں درخت بن کر پھل لانے لگی تھیں۔ سب سے بڑھ کر فلاح و خیر کا قرینہ یہ کہ دور دور کے خطوں سے جنگ و جدال کا بازار گرم تھا۔ عمال و عمائد پادشاہ کی مملکت میں نقل مکانی کر کے آرہے تھے کہ امن و سلامتی کے علاوہ تھوڑی بہت خوش حالی سے بہرہ مند ہو سکیں۔ جھلے اور جنگ جو افغان قبائل آپس میں کشت و خون کرتے رہیں بابر کے انتظامات میں خلل ڈالنے کی اب جرات نہ کر سکتے تھے۔ وہ ان پر پوری نگرانی رکھتا تھا۔ شمال میں ازبکوں کی حکومت تھی۔ وہ بھی افغانی ملکوں کی طرح گزر بسر کر رہے تھے۔

لیکن ان سنن کے بارے میں بلا توقع ہمیں ایک نوجوان عورت کی شہادت ملنی شروع ہوتی ہے۔ یہ بابر کی سن کمولت کی بیٹی گلبدن بیگم ہے جس نے ایک مدت بعد اپنے بھتیجے اکبر بادشاہ کی درخواست پر، خاندان کے بعض مردوں کی طرح، حالات زندگی قلم بند کئے تھے۔ وہ بچوں کی اس نئی پود میں تھی، جن کی مائیں تیموری خاندان کی نہ تھیں اور جو مصائب گذشتہ کی پریشانی اور سرفقت کی عظمت رفتہ کے مال و اندوہ کی بجائے دربار کابل کی خوش دلی کی فضا میں پلے تھے۔ گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ اس کے باپ کو سابقہ وطن کی یاد نہیں رہی تھی۔ کم سے کم بابر اپنے چھوٹے بچوں سے سرفقت و اندجان کی باتیں نہیں کرتا تھا اور تقدیر کی کارستانی سمجھتے کہ اس کی تیموری نژاد بیویاں، کابل میں سکونت کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ چکی یا فوت ہو چکی تھیں۔ محل سرا میں ان غمناک واقعات کے ضرور

تذکرے ہوتے ہوں گے۔ جنہیں گلبدن سنتی ہوگی۔ ورنہ ثلث صدی میں یہی ایسا زمانہ تھا کہ اس خاندان کو محفوظ مامن کی تلاش میں رخت سفر باندھنا نہیں پڑا۔ نرسلوں والی، بل کھاتی ندی کے کنارے نیکرے پر قصر شاہی اور بالائی مرغزار میں چار باغ ان کے مستقل ٹھکانے بن گئے تھے۔ شروع میں سن رسیدہ قاسم بیگ بیگمات کے مجھے میں عہد رفتہ کی یادگار کے طور پر بزرگ و مشیر کی خدمت انجام دیتا تھا۔ قلعے کے دروازوں کو کسی ہتھیار بند دشمن کی آمد کا خوف نہ تھا۔ گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ بابر کا کابل میں آنا اس کے حق میں فال نیک ثابت ہوا ورنہ پہلے اس کے جتنے بچے ہوئے سب ضائع ہو گئے۔ کابل آکر ایک نہ دو اٹھارہ بچے ہوئے اس سے بڑھ کر نیک فالی کا ثبوت اور کیا ہو گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم، توہم پرست نہ تھی بلکہ صحیح معنی میں مذہبی خاتون تھی۔ ان دونوں میں فرق کرنا چاہئے۔ سب سے بڑا بھائی ہمایوں پورا توہم پرست تھا۔ اپنے خوابوں کی تعبیروں اور دن کے شگونوں کی تلاش میں رہتا۔ دس برس کی عمر تھی کہ صبح باہر جانے تک کا اس نے شگون لیا۔ جن کا محل سرا میں مذکور ہوا۔ وہ سڑک پر راہ پلٹوں کے نام دریافت کرتا کہ پہلا کون تھا، دوسرا، تیسرا کون، پھر تینوں نام لکھ کر مستقبل کا شگون لیتا۔ پرانے مصاحبوں نے سمجھایا کہ فال کے لئے ایک ہی نام کافی ہے۔ تین تین کو جمع کرنے سے الجھن پیدا ہوگی۔ مگر کسمن شہزادہ نہ مانا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ نقاؤل میں جن تین کے نام آئے ان کے معنی: مطلوب، سلامت، فتح تھے۔ ہمایوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خدا کی طرف سے بشارت ہے کہ اس کی خوش حالی کی آرزوئیں پوری طرح بر آئیں گی۔ بابر کو رمالوں وغیرہ کا مدت سے اعتبار نہیں رہا تھا۔ لیکن افسردہ مزاج اور تنہائی پسند ہمایوں کی باتوں پر تھل کرتا تھا۔ خان میرزا کا انتقال ہوا تو بدخشاں کی حکومت ۱۳ سالہ ہمایوں کے تفویض کی اور اس کی ماں ماہم سمیت اس ولایت کی سرحد تک بیٹے کو پہنچانے آیا۔ کئی دن ٹھہر کر چیدہ چیدہ مشیر اس کے پاس چھوڑے کہ ہمہ وقت حال کے نگران رہے۔ دور رہنے کی یہ تجویز بھی غالباً ہمایوں کی خواہش کے مطابق بابر نے قبول کی تھی اور اسے برابر خط لکھتا رہتا تھا۔ اگرچہ شکایت کرتا ہے کہ ہمایوں بہت کم اور مختصر جواب دیتا ہے۔

ہمایوں کے بدخشاں چلے جانے اور بابر کے باہر گشت لگاتے رہنے کی وجہ سے گلبدن کو بچپن میں بڑے بھائی، اور باپ کی معیت کا بہت کم موقع ملا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا اور پہلی دفعہ سندھ کے پار باپ کے پاس آئی تو بہت ڈرتے ڈرتے پادشاہ کے سامنے گئی۔ محل سرا کی

اکثر خواتین کی طرح وہ بھی نہایت دین دار لڑکی تھی اور اہل خاندان کے حق میں خدا سے رحمت و کرم کی دعائیں کرتی رہتی تھی لیکن باطنی علم و اعمال سے واسطہ نہ رکھتی تھی۔

کابل کی چھوٹی سی سرکار میں شاہی خاندان ”ایام بے تاج“ کے زمانے سے اب تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔ محل سرا میں ایساں دولت جیسے ٹیلے مزاج کی کوئی خاتون ”تاتاری مادر شاہ“ کی حاکمانہ شان سے حکم چلانے والی نہیں رہی تھی۔ ولی عہد (ہمایوں) کی ماں ماہم محل کے اندر گوشہ نشینی پر قانع تھی اور زیر نظر زمانے میں بیرونی معاملات کی طرف آنکھ اٹھا کے نہ دیکھتی تھی اگرچہ اس کا شوہر بارہا جاتا اور تماشا کرنے والے بندروں سے لے کر پشاور کی منڈی کے نفیس ریشم تک طرح طرح کے تحفے بیویوں، بچوں کو لا کر دیتا رہتا تھا۔ مگر نقد روپے کا انعام وہ صرف اپنے دو بیٹے کو عنایت کرتا تھا۔ افغان بی بی (مبارکہ) کبھی کبھی اس کے سفر میں ہمراہ جاتی تھی۔ حیرت ہے کہ کابل کی حرم سرا میں وہ بہت ہرولعزیز تھی جس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ بے اولاد رہی۔ بہر حال کابل کے گوشہ سلامتی میں بسبھی بیویاں خوش رہتی تھیں۔ بابر کی ہر بار مراجعت پر ان کا خوشی منانا اور ضیافتیں کرنا اسی خوش دلی کی صریح دلیل ہے۔ ایک مرتبہ اس کے دل میں آئی کہ اپنی آمد کو چھپائے رکھا اور جب شہر کی ندی پر پہنچ گیا تب کہیں لوگوں نے اسے دیکھا۔ ایک دم سارے شہر میں گڑبڑ مچ گئی۔ دونوں بڑے بیٹے پیشوائی کے لئے دوڑے۔ انہیں اتنا وقت نہیں ملا کہ (بہ تصحیح مترجم) گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے آدمیوں کی معیت میں قاعدے سے شہر کے باہر آ کے ملے۔ شہر اور ارک کے درمیان پل پر ملے۔ بابر کو ان کی گھبراہٹ دیکھ کر بہت لطف آیا۔

اس کا کنبہ کچھ نئی طرح سے بوجھا۔ بہت سے پناہ گزین اس میں آ ملے۔ خازنہ بیگم جس کا گلبدن پر بڑا رعب تھا، بچوں کو چار و ناچار ازبکوں میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے گلبدن صحرائی بیگم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ایک علاقائی بسن اپنے لڑکے سمیت شمال سے فرار ہو کر آئی۔ خان میرزا متوفی کا بیٹا سلیمان، بابر کی پرورش میں دیا گیا تھا۔ اس نے اسی کو والئی بدخشاں نامزد کیا اور ہمایوں قائم مقام شاہ (یا والی) کر دیا گیا۔ کئی لڑکیاں اور بابر کا چھوٹا لڑکا عسکری محل سرا میں تعلیم و تربیت پاتے تھے۔ سلیمان بھی اسی زمرے میں داخل کیا گیا۔ ہرات، بلخ، بخارا سے اہل علم و ہنر بھاگ بھاگ کر کابل آتے تھے۔ خطاطی، دینیات، تاریخ، شعر شاعری اور ضروری السنہ سکھانے پر مامور تھے۔ اسی تعلیم و تربیت کی بدولت گلبدن فارسی قریب قریب اسی طرح بے تکلف لکھتی ہے جیسے اس کا باپ ترکی لکھتا تھا۔ اس نے

اسے اپنی تزک کا نام نہیں دیا بلکہ ”ہمایوں نامہ“ موسوم کیا لیکن حقیقت میں وہ سارے خاندان ہی کی سرگزشت ہے جو اب ہندوستان پر حکومت کرنے کو ابھر رہا تھا۔

ممکن ہے ماہم امیر خاندان سے نہ ہو۔ اس کا ٹھیک حال اور خود لفظ کے معنی معلوم نہیں۔ گلبدن بیگم اسے ”آتم“ یعنی میری آقا، لکھتی ہے۔ بہر حال وہ ولی عہد کی ماں اور محل سرا میں حاکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے چار بچے تھوڑے تھوڑے دن ہی جی کر ضائع ہوئے۔ جب چوتھا مرا تو اس نے ایک من مانی فرمائش کی اور بابر نے اس کی خاطر منظور کر لی۔ وہ ان دنوں بجور پر فوج لے جا رہا تھا۔ اگرچہ یہ تحریر کچھ دن بعد کی ہے کہ ”ہمایوں کی ماں کے کئی بچے ہوئے اور گزر گئے تھے۔ ہندال ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہم اسی نواح میں تھے جب ماہم کا خط آیا کہ اب جو بچہ ہو، خواہ بیٹا یا بیٹی، آپ مجھے دیں۔ میری قسمت سے جیتا رہے تو میں اسے پالوں گی۔“ میں نے جتھے کو یوسف علی (بہ تصحیح مترجم) رکابدار کو ڈاک دے کر کابل روانہ کیا۔ اسی میں ایک خط ماہم کو لکھ کر بچہ ہندال جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، اسے دے دیا۔“ حاملہ ماں دلدار بیگم تھی۔ اسی کے ہاں آئندہ گلبدن پیدا ہوئی۔ وہ ماہم سے عمر میں چھوٹی تھی۔ پھر بھی شاہی بیگمات کبھی کبھی جو کسی کا بچہ گود میں لے کر پالتی تھیں وہ عموماً ادنیٰ درجہ کی مائیں ہوتی تھیں اور پادشاہ (بابر) کے محل میں ایسا ہوا بھی نہ تھا۔ عجب نہیں بڑھاپا آتے دیکھ کر ماہم کو کسی اور کا بچہ پالنے کی ہڑک اٹھی ہو اور یا جب اپنے پیٹ کا بچہ زندہ نہیں رہا تو کسی اور بیوی سے پادشاہ کا فرزند پالنے کی خواہش ہوئی ہو۔ دلدار کو یہ بات ناگوار تھی مگر پادشاہ کا حکم مانے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

ماہم نے یہ درخواست بھی کی کہ پادشاہ خود فال لے کر بتائیں، بیٹا ہو گا یا بیٹی۔ بابر نے مضحکہ کیا کہ یہ سب عورتوں کے ادہام ہیں۔ تاہم بیوی کی خوشی پوری کرنے کے لئے ایک بڑی بوڑھی عورت کو بلا کر دو نام باریک کاغذ پر لکھ کر الگ الگ چکنی مٹی کے اندر لپیٹ کر (یہ غلطی) پانی کے پیالے میں ڈلوائے کہ ان میں سے جو پہلے گھل جائے اور اندر سے کاغذ نکل آئے۔ اسی کے مطابق واقع ہو گا۔ اس موقع پر بابر لکھتا ہے کہ بیٹا ہونے کی فال نکلی۔ دو چار مہینے بعد دلدار کے ہاں بیٹا ہوا اور ماہم زور اقتدار سے دوسرے ہی دن بچے کو اپنے محل میں لے آئی۔ دلدار بیگم کو صبر سے انتظار کرنا پڑا کہ جب مناسب موقع ہاتھ آئے تو اپنے بچے کو واپس حاصل کرے۔ (”ہندال“ یعنی ہند والا، اس کا آگے چل کر عرف رکھا گیا تھا) مگر ماہم کو اسی پر سیری نہیں ہوئی اور چونکہ اپنا کوئی بچہ نہ رہا تھا (ہمایوں بھی باہر چلا گیا

تھا) لہذا اس نے تین برس بعد پیدا ہونے والی گلبدن کو بھی طلب کر لیا۔ چنانچہ یہ لڑکی بھی اس وقت سے متلون مزاج ماہم ہی کی نگرانی میں لے لی گئی، جب کہ کچھ سمجھ بوجھ اسے آ گئی تھی۔ پھر بھی سب سے اہم شخصیت یعنی باپ کے آنے جانے کی اسے مشکل ہی سے خبر ہوتی تھی۔ البتہ قلعے سے اس کی سواری کو نیچے ندی کی سڑک پر گزرتے دیکھا کرتی ہوگی جمال انبوه کثیر لہراتے جھنڈے لئے اس کے جلو میں حرکت کرتا اور آراستہ پیراستہ گھوڑے اچھی سے اچھی چال دکھاتے نظر آتے تھے۔

یہ ۱۵۲۵ء کی سرودیوں کا ذکر ہے جب کہ سخت پالا پڑ رہا تھا۔ لیکن گلبدن بیگم نے بڑی ہو کر کتاب لکھی تو اس گزشتہ تاریخی واقعے کی نسبت صرف اتنا لکھا کہ ”آفتاب برج قوس میں تھا جب پادشاہ ہندوستان کے لئے منزل بہ منزل روانہ ہوا۔“

اس کوچ میں چند منزل بعد ہمایوں کے بدخشاں سے امدادی فوج لے کر آنے کا دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ زمانہ قیام میں بابر ایک دیہاتی باغ میں ہر ہفتہ چار دن شراب نوشی کے جلسے کر کے دل بہلاتا رہا۔ چالیسویں سالگرہ سے شراب چھوڑنے کی نیت کی تھی۔ اس توبہ پر تو عمل نہ کر سکا مگر ہفتے میں چار دن (ہفتہ، اتوار، پیر، منگل) شراب نوشی کے قرار دیئے۔ باقی دنوں میں معجون کا نشہ کرتا تھا۔ آخر ست قدم بیٹا لشکر میں پہنچا۔ بابر نے فوجی سرداروں کے روبرو سخت ست کہا۔ معلوم ہوا۔ کابل میں ماہم نے منت سماجت کر کے ہفتہ بھر تک ٹھیرائے رکھا تھا۔ آگے کوچ میں بھی ہمایوں برداشتہ دل ہی رہا۔ وہ اسے بھی ایک اور احمقانہ تاخت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ اس مرتبہ بابر واپس کابل آنے والا نہ تھا۔

حملہ ہندوستان کی چیتان

بابر توضیح کرتا ہے کہ ”جس وقت سے میں نے ملک کابل فتح کیا، برابر ہندوستان کو زیر نگین لانے کا منصوبہ سوچتا رہا۔ مگر میرے امرا کبھی تو قتنہ و فساد اٹھاتے، کبھی میرے بھائیوں سے مل کر سازشیں کرتے تھے، ان وجوہ سے میں اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکا۔ بارے یہ موانع راستے سے دور ہوئے اور اب اعلیٰ، ادنیٰ، عاقل یا احمق کوئی شخص (دربار میں) ایسا نہیں رہا جو اس لشکر کشی کی مخالفت کا دم بھرتا قلعہ بجور کو یورش کر لینے (۱۵۱۹ء) کے بعد سے میں خاص طور پر ہندوستان کے معاملات پر ہی متوجہ رہا۔“

مگر یہ وقوعے کے بہت بعد کی تحریر ہے جسے ”زیب داستان“ کے لئے خیال کرنا چاہئے کیونکہ سالہا سال پہلے جب شیبانی کے آگے سے سرقد چھوڑ کر فرار ہوا تو کابل پر حملہ کرنے کی تفصیل سے کیفیت لکھی ہے، وہاں ہندوستان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ کتنا مشکل سے صحیح ہو گا کہ وہ سالہا سال سے اس حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا یا اسے شمالی ہندوستان پر اپنے جد امجد تیمور کی فتوحات کے باعث کوئی دعویٰ پیدا ہو گیا تھا۔ سو برس پہلے تیمور کی یورش مال و دولت کی تلاش میں، قابل حیرت ایک جھپٹا تھا جو شہر دہلی کی الم ناک تباہی پر منتج ہوا اور حملہ آور نوے چھینے ہوئے ہاتھیوں کی قطار پر اموال غنیمت لاد کر سرقد لے گیا۔ اس ایک صدی سے زیادہ مدت قبل کے حالات بابر نے تیموری محاربات کے سلسلے میں بار بار مطالعہ کئے اور وہ ان کی نوعیت سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ کے پار کا قبل ازیں کوئی دعویٰ اس کو نہ تھا اور ادھر جو تاختیں کیں ان کی نسبت حیدر میرزا نے بھی اپنی تاریخ میں دور بیٹھ کر یہی مشاہدہ کیا کہ وہ ہندوستان میں کئی مرتبہ تاخت کر کے واپس ہوا۔“ دوسرے لفظوں میں یہ خانہ بدوشوں کے سے حملے تھے کہ جب تک کابل کا انتظام درست ہو، رسد حاصل کرنے کی غرض سے سرحد پار تک کئے گئے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ”سرحد پر پہنچ کر ہمیں خیال ہوا کہ بھیرہ نزدیک ہے۔ اگر ہم بھاری سامان چھوڑ کر آگے بڑھ چلیں تو عجب نہیں کچھ غنیمت اہل فوج کے ہاتھ آجائے۔“ یہ صحیح ہے کہ ۱۵۱۹ء کی بجزور کی مہم میں جب وہ سندھ پار کر کے اترا تو جیسا کہ بیان کرتا ہے، اس نے لوٹ مار کی ممانعت کی اور اس کی بجائے باشندوں سے باقاعدہ محصول لینے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ کہیں کہیں رسمی طور پر محافظ دستے بھی متعین کر دیئے تھے لیکن اسے پلٹتے دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ مٹھی بھر آدمی نکال دیئے گئے۔ خود اس کا پورا لشکر اس مہم میں دو ہزار جنگ آزماؤں سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا اور حقیقت میں برسوں تک اس کی جمعیت اتنی نہیں ہونے پائی تھی کہ سندھ پار کی بے حساب آبادی کو زیر تلک لائے کا خیال دل میں لاتا۔

البتہ ۱۵۲۵ء تک اس نے گھر کا انتظام درست کر لیا تھا۔ اور بے شبہ اتنی مدت میں سرزمین کابل کی مخلوط آبادی پر نہ صرف بادشاہ بننے بلکہ حکمرانی کرنے کا گر سیکھ لیا تھا اور یہ قابلیت بڑے صبر و تحمل اور غور و فکر کی بدولت حاصل کی تھی۔ اپنے آخری حریف شاہ بیگ ارغون سے قدھار بھی پھر لے لیا تھا۔ ارغون جنوب کی طرف سندھ کی گرم سرزمین میں ہٹ گیا تھا۔ مغرب کی جانب بھی بادشاہ کی عمل داری ایران کے ایسے ہی گرم ریگستان

تک وسیع تھی۔ شاہ بیگ ارغون بد سگالی سے کہا کرتا تھا کہ بابر کی بڑھتی ہوئی فوج کو زیادہ زمین درکار ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس کا انتقال ہو چکا تھا اور ادھر گئے شاہ اسماعیل صفوی کو عثمان لی ترکوں نے یہ مقام پندراں ۱۵۱۳ء میں ایسی قیامت کی شکست دی کہ حواس جاتے رہے اور پھر اس نے مشرقی اقطاع کو پریشان کرنے کی کبھی جرات نہ کی۔

قدحار بابر نے اپنے دوسرے فرزند کامران کو تفویض کیا اور خود کابل کے باغوں سے نہایت مایوس ہو گیا تھا۔ بیس برس تک مشقت جھیلنے کے بعد اب وہ اس ملک کو اپنا ملک اور یہاں کے باشندوں کو اپنی رعایا کہہ سکتا تھا۔ لکھتا ہے کہ ”ہماری آنکھیں اسی زمین اور یہاں والوں پر لگی ہوئی ہیں۔“ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یکایک اسے کیا سوچھی کہ جو کچھ قدر قلیل حاصل کر لیا تھا، اس سب کی بازی شمالی ہندوستان کی فتح کے لئے لگا دے؟ بابر نے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب کبھی نہیں دیا۔ اس کا رواداری میں لکھ دینا کہ سال ہا سال سے یہ منصوبہ باندھ رہا تھا، یا یہ کہ وہ ان ممالک پر جہاں بڑے بڑے ترک سلاطین اور خصوصاً امیر تیمور کی فرماں روائی رہی، کوئی حق وراثت رکھتا ہے۔ محض نمائشی باتیں ہیں اور آئندہ قرون میں اکثر تاریخ نویسوں نے انہیں صحیح سمجھ لیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کابل سے ان سردیوں میں چلتے وقت تک وہ کوئی منصوبہ ایسے کام کرنے کا سوچتا جیسا کہ آئندہ دو سال میں فی الواقع اس نے انجام دے لئے، تو اس کی حالت کچھ ایسی مانی جاتی جیسی ایک بار اس نے تردی بیگ کی تحریر کی کہ وہ ”نشے میں پاگل“ ہو گیا تھا۔ اس کی فوجی تعداد پر نظر کیجئے کہ کوچ شروع ہوا اور ہمایوں کچھ تاخیر سے آکر شریک ہوا تو باقاعدہ جائزہ لئے جانے پر لڑنے والے سپاہیوں کا شمار سات ہزار قلم بند ہوا۔ بہر میں خدمت گار، بار برداری وغیرہ کاموں کے جملہ آدمی پانچ ہزار تھے۔ اس برائے نام لشکر سے ہندوستان کی عظیم افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے چل پڑنا کسی طرح خیال میں نہیں آتا۔ سکندر مقدونی بابر سے زیادہ بے باک جرات رکھتا تھا اور اپنے آگے کے مشرقی ممالک کا بھی اسے نہایت مبہم تصور تھا بلکہ ہندوستان کے دریاؤں کے پار قریب میں ایشیائی سمندر کے موجود ہونے کا یقین تھا، پھر بھی جب سرحد کے دروں سے نکل کر بڑھا تو کہیں بڑی فوج زیر علم تھی۔ بخلاف اس کے بابر بخوبی جانتا تھا کہ آگے کتنا وسیع ملک ہے۔ فی الواقع اس نے ان امور پر اچھی طرح غور و خوض کیا تھا۔

گمان غالب یہ ہے کہ اس مہم تقدیر آزمائی کا محرک بعض ذاتی مصلحتیں تھیں جن کو

تک میں اس نے تحریر نہیں کیا۔ اس کی عمر بیالیس برس کے قریب ہو گئی تھی اور تیس برس ٹھکانا ڈھونڈنے کی جدوجہد نے لازماً "صحت پر اثر ڈالا تھا۔ جوانی میں اس کی قوت کا یہ حال تھا کہ ایک بار دونوں بظلوں میں ایک ایک آدمی کو دبائے ہوئے فسیل پر دوڑ لگائی اور ہرچند ابھی تک خاصی توانائی باقی تھی پھر بھی اکثر رشتہ داروں کا اپنے سامنے گزر جانا دیکھ کر اسے یہ ناگزیر خاتمہ ضرور یاد آتا ہو گا اور اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پھر اس کے متعلقین پر کیا گزرے گی؟ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہی کا بوجھ اٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اہل و عیال کے علاوہ ان آخری سین میں بہت سے پناہ گزین کابل پہنچے اور اس نے ان کی خبر گیری بھی اپنے ذمے لے لی تھی۔ پھر قدیم الحدمت امرا تقریباً سبھی صاحب اہل و عیال تھے اور انہیں سرحد کے لئے زمیں داری درکار تھی۔ ولایت کابل کی غیر آباد وادیوں میں اتنے بہت سے حصے لگانے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

خود اپنے گمرانے کے بارے میں بابر کی تشویش کے اسباب کچھ خلاف معمول تھے۔ ان دنوں بابر کی عمر کے بادشاہوں کے عموماً کئی کئی سیانے بیٹے ہوتے جو کبھی باپ کی خدمت و اطاعت میں اور کبھی اس کے خلاف ساز باز میں مصروف رہتے۔ بابر کے ابتدائی عمر میں بچے نہیں ہوئے۔ سب سے بڑا ایک ہمایوں تھا کہ سترہ سال کا ہو جانے کے باوجود نگرانی کا محتاج تھا۔ عسکری اور ہندال ہنوز بہت چھوٹے اور محل سرا میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ گلبدن اور دوسری بہنوں یا ماؤں اور خاندان کی سن رسیدہ مستورات کی طرح خود کچھ کرنے کے لائق نہ تھے۔ بابر کو سلیمان سمیت ان بچوں اور بیبیوں کی کفالت کا خیال تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لڑکے جوان ہوں گے تو انہیں کونسی ولایت یا جاگیر گزارے کے لئے دی جائے گی؟ خود ساز "پادشاہ" کی دنیا سے رحلت کے بعد یہ پادشاہزادے اور کنبے کی بہت سی خواتین شاہی توقیر کے ساتھ کہاں رہیں گی اور کس طرح گزر اوقات ہو گی؟ اس بات کو محض اتفاقی نہیں کہہ سکتے کہ نئے مولود کا عرف ہندال "ہند والا" تجویز کیا گیا تھا۔

سگنائے کابل کے مقابلے میں اپنی شمالی میراث کا حال بھی شیر کو پیچ و تاب میں لاتا ہو گا۔ آج وہاں کے تمام نامی گرامی بلاد پر ازبک خاں کی بادشاہی تھی۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، کرشی وغیرہ اس کے باج گزاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ مغلوں کے قدیم قانون "یسا" کا نفاذ ہو رہا تھا جس سے بابر کو سخت نفرت تھی۔ غچ ندی کی مملکت جنگ کے بعد تیموری سلطنت کی باقی اراضی جنگلی ازبک سرداروں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ پھر تھوڑے دن کے لئے

جو قزل باشوں نے اسے سرقند میں شاہ شطرنج بتائے رکھا اس ذلت کی نلش بھی شیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔

ترک میں چند مرتبہ اس نے قدیم یونانی مقفن سولن کا قول (جانے بغیر) اپنے لفظوں میں دہرایا ہے کہ آدمی کی زندگی کا اصلی صلہ وہ شہرت اور نیک نامی ہے جو مرنے کے بعد اسے حاصل ہو۔ امیر تیمور کے اس وارث کی نسبت جو عمر بھر کے لئے سرقند چھوڑ کر بھاگا، آئندہ نسل کے شاعر کیا لکھیں گے؟ بابر خود بھویہ شعر کہنے میں مشاق تھا، وہ آسانی سے تصور کر سکتا تھا کہ یہ نظمیں کیسی طعن آمیز ہوں گی؟ یہاں پھر ہمیں خیال آتا ہے کہ یہ محض اتفاقی بات نہ تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرتے وقت اس نے لکھا کہ میں تیموریوں کی گزشتہ میراث واپس لینے چلا ہوں۔

غچ ندی کی شکست نے اسے بہت مفید سبق دیا تھا۔ خود اس کا بیان ترک کے مفقود اوراق میں گم ہو گیا لیکن حیدر میرزا بتاتا ہے کہ ایرانی رسالہ جس کی قوت بے پناہ مانی جاتی تھی، اس کے غرور کی گردن کیسی عجیب طرح ٹوٹی۔ اس کا قول ہے کہ قزل باش سواروں کے دیوانہ وار حملوں کو عبید خاں کی اس جنگی تدبیر نے خاک میں ملا دیا کہ اس نے بخارا کے باغوں اور نہروں کے کنارے پیادہ تیر انداز لگا دئے تھے جو ایرانی رسالے پر باڑیں مار رہے تھے۔ ان علاقوں میں پیادہ تیر انداز پہلے کبھی میدان میں نہ آئے تھے۔ اس مشاہدے کے علاوہ بابر کو یہ اطلاعات بھی ضرور پہنچی ہوں گی کہ مہیب سلطان سلیم (فاتح) نے تھوڑی مدت بعد ہندران کے معرکے میں بانی چری برقدازوں سے کیسا کام لیا۔ یہ فوج آڑ لے کر پیدل لڑی اور اسماعیل صفوی کے سوار لشکروں کے پرچے اڑا دیئے۔ بابر نے خود بھی زرہ پوش پیادہ صفوں کو لڑانے کا تجربہ کیا اور اب اس کے قبضے میں یہ کرشمہ نیز آتشیں اسلحہ اور ان کے چلانے والے ترک استاد بھی آگئے تھے۔ وہ جزئیات پر گہری نظر رکھتا تھا اور ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ عجب نہیں نیزہ بردار سواروں کا دور ختم اور مورچہ بند پیادوں کا زمانہ آگیا ہو۔ بہر حال جب وہ آمد سرا میں خیبر سے نکل کر چلا تو توڑے دار بندو تچیوں کی چیدہ جمعیت اور توپوں کی اچھی خاصی تعداد اس کے جلو میں تھی۔

بابری حملے کا ایک پہلو صرف عہد جدید والوں کے ذہن میں چیتان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کابل کو نہ کوئی ملکی سرحد عبور کرنی پڑی نہ قدرتی۔ افسانہ نویسوں کو یہ بیان کرنے میں بہت مزہ آتا ہے کہ ازمہ قدیم سے نیم وحشی حملہ آور ہندوستان کے

دروازوں یعنی درہائے خیبر وغیرہ سے آباد و مزروعہ ممالک ہند پر قبضہ جمانے کے لئے گھسی آتے تھے۔ وہ قدیم آریوں، پھر سکندر یونانی اور آگے چل کر چنگیز و تیمور کی اور آخر میں بابر اور اس کے ترکوں کی آمد کا یہی نقشہ دکھاتے ہیں۔ کہانی بہت صاف اور ولولہ انگیز ہے لیکن صداقت سے بہت دور ہے۔ کوہ سلیمان اور ہندوکش کے جھرمٹوں سے قدرتی پہاڑی سرحد کا موہوم خیال دراصل انگریزوں کے زمانہ دراز تک ہندوستان خاص پر حکومت کرنے سے پیدا ہوا جب کہ انہوں نے شمال مغربی سرحد پر اپنی فوجی چوکیوں کا سلسلہ ان غضب آلود پہاڑوں کے دامن میں قائم کیا، جن پر کپلنڈ کے زمانے میں پہاڑی قبیلے آباد تھے۔ جس دن یہ انگریزی چوکیاں اٹھائی گئیں وہ حد فاصل و حائل بھی باقی نہیں رہی۔ دریائے سندھ کے مشرقی طاس میں آن بھی پٹھان بستے ہیں۔ جیسے بابر کے عہد میں بستے تھے۔ کہانیوں کا خیبر آمدورفت کے اور راستوں کے، نیمد ایک شارع عام ہے جو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ تاریخ کا صحت سے مطالعہ کیا جائے تو پہاڑی بلندیوں کے کنارے کنارے جاتی ہوئی کوئی حد فاصل نہیں ملے گی۔ حملہ آور آریوں سے پیشتر وادی سندھ کی تہذیب مغرب میں ہڑپہ (کنار راوی) اور پہاڑوں میں دبرکوٹ کے آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر سکندر یونانی دریا کے راستے ساحل بحر تک جا کے رخصت ہوا تو اشوک راجہ کی عہد داری میں وہ اقطاع شامل تھے جو کابل و قندھار کہلاتے رہے صحرائی (چنگیزی) مغول جو خوارزمیوں کو شکستیں دیتے ہوئے بڑھے، سو وہ بھی بلا روک پہاڑوں کو طے کر کے دریائے گجیر (سندھ) تک پہنچ گئے تھے اور محض ہندوستان کے میدانوں کی گرمی کی تاب نہ لا کر واپس ہوئے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی کی سلطنت کو ان پہاڑوں کے سلسلوں نے میدانی علاقوں میں دور تک پھیلنے سے نہیں روکا۔

اگر کوئی قدرتی سرحد تھی تو وہ عریض اور طغیان آور سندھ دریا جو پہاڑی دروں سے پچاس تا سو میل آگے بہتا ہے۔ بابر نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو یہ بھی مشاہدہ کیا کہ دریا کے دوسری طرف زمین کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ پھر کابل کے صاف مطلع کی بجائے ہندوستان کا ابر آلودہ آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کسانوں کے گاؤں اور پالتو جانوروں کے گلے تک، شہری تمدن، کھلے میدانوں کی تجارتی سرگرمی، نیز بارانی زراعت کے اثرات سے بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ انتہا یہ کہ پرندے اور جنگلی جانور بھی مختلف ہیں۔

دین اسلام، مشرق میں جہاں سلاطین دہلی کی حکومت رہی، بہت آگے تک نفوذ کر چکا

تھا۔ بعید گنگا کی ایک بڑی معاون (جمنہ) کے کنارے گرمی ماری دلی اور سندھ دریا کے مابین پانچ ندیوں کی زرخیز زمین پنجاب واقع تھی جسے بالائی سندھ اور اگلی ندیاں قطع کرتی ہوئی گزرتی تھیں۔ سرسبز پنجاب کے جنوب میں تھل کا بھیانک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ آثار قدیمہ کی شہادتیں بتاتی ہیں کہ ہند کے عظیم جزیرہ نما کا یہ گوشہ کبھی الگ الگ ٹکڑوں میں حد بند نہیں رہا بلکہ صدیوں سے مختلف اقوام و ملل، کاروانوں، تاجروں کی عام گزرگاہ تھا۔ یہیں نیکسلا کا قدیم شہر آباد تھا جہاں چین و ایران کی بعض صنایعوں کا اتصال ہوا۔ گندھارا کے مندروں میں وہ بت تراشے گئے جنہیں یونان کے تربیت یافتہ ہاتھوں نے بنایا تھا۔ یہاں کی شاہراہوں سے بیش سے بیش بہا اجناس کے وہ قافلے گزرا کرتے تھے جن کی کبھی کبھی مال سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاروں کی صورت میں بابر نے اندجان میں تھلک دیکھی۔

القصہ بابر کاہل ندی کے کنارے کنارے خیبر کی سرخی مائل پہاڑیوں کے درے سے نکل کر آیا تو وہ کسی جداگانہ معاشرے کو چھوڑ کر کسی دوسری نئی قوم پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے کافی مدت پہلے ۱۵۱۹ء میں بھی پنجاب کے دوسرے دریا (چناب) تک دیکھ بھال کر گیا تھا۔ اپنے محرکات کی تو اس نے صراحت نہیں کی کہ آج چار سو برس بعد ہم محض قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں لیکن اس کی منزل مقصود خاصی طرح واضح تھی۔ وہ مانوس، سایہ دار پشاور سے چل کر بالائی سندھ کو قلعہ پر عبور کرنا، پھر نمک کے پہاڑوں سے گزر کر ملک پنجاب پر چھا جانا چاہتا تھا۔ دلکش راوی کے کنارے پنجاب کے صدر مقام لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب پر اپنا تسلط مضبوطی سے قائم اور اسے سلطنت کاہل میں شامل کرنا مقصود تھا۔ مفتوحہ ملک کی قدرتی سرحدیں جنوب میں تھر اور شمال میں ہمالیہ، ہندوکش کے کوہستان ہوتے۔ وہ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ پنجاب کو زیر نگین لانے میں ایک منزل آگے دہلی کے طاقتور بادشاہ سے اسے کوئی نہ کوئی تصفیہ کرنا ضروری ہو گا۔ مدتوں پہلے وہ دیکھ چکا تھا کہ جب تک سمرقند پر قبضہ نہ ہو فرغانہ کی چوڑی پٹی ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں ضروری تھا کہ دہلی کو مصالحت سے یا بزور معطل بنا دیا جائے۔ کیونکہ ٹھان لی تھی کہ پنجاب کا خطہ فراخ اپنا، اور لاہور کو دوسرا کاہل بناؤں گا تاکہ گنگا کی بالائی وادی سے آمو کی بالائی وادی بدخشاں تک میرا حکم چلے۔ نیچے چتے ریگستان اور اوپر وسط ایشیا کے بلند کوہستان ان کے پاسبان رہیں۔

وہ راز کی بات جس کی بابر نے اپنے سپہ سالاروں اور فرزند ہمایوں کو بھی خبر نہ کی، یہ

تھی کہ جب تک اس کی فتوحات پکی نہ ہو جائیں وہ سندھ کے پار ہی ٹھہرا رہے گا۔ اسے
 آئندہ پناہ گزین بننا منظور نہ تھا۔ اور اب کے اس ارادے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابر پٹ کر پھر
 کبھی کابل نہ آیا۔

باب ہفتم

پانی پت اور کنواہ

کابل سے حتمی کوچ!

۱۵۲۵ء کے ناخوش گوار دسمبر میں جو لشکر خیبر کے نلے سے نکل رہا تھا اس کی رہنمائی کلاما" بابر پر منحصر تھی۔ تنہا اسی کی ذات خیل و سپاہ کی تقویم کا باعث تھی اور خود اسے اپنا عزم فقط اس امید پر دھکیلے لئے جا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اقبال اس کا یاور و مددگار ہو جائے گا۔

مگر بابر تقدیر کی نیرنگیوں سے ناواقف نہ تھا۔ سفر میں دوبارہ پیچش ہوئی اور سینے سے خون آیا۔ ایک سال قبل تقدیر ہی نے (یا اس کی اپنی بے تدبیری نے) لاہور سے اس کی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا تھا جب کہ وہی حلیف جنہوں نے اسے پنجاب آنے کی دعوت دی، پلٹ گئے اور اس کی مٹھی بھر فوجوں کو اکیلا چھوڑ دیا جو بادشاہ دہلی کا کسی طرح مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ تاہم بعض محافظ دستے وفادار سرداروں کے ماتحت، قلعوں میں ڈٹے رہے۔ یہ قلعے پنجاب کے دو آہوں میں واقع تھے اور بابر کا انہیں گھیرے سے نکالنا لازم تھا۔ اپنے بخار اور خون آور کھانسی کو اس نے اپنی توبہ شکنی کے گناہ کی سزا خیال کیا۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق :

”(جس نے اپنا عہد توڑا، سو اپنی ہی جان پر توڑا، اور جس نے پورا کیا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے تو اسے وہ جلد اجر عظیم دے گا۔“)

لکھتا ہے کہ ”میں نے بار دگر توبہ اور ضبط نفس کا ارادہ کیا کہ آئندہ غیر مشروع خیالات دل میں نہ لاؤں گا نہ زبان سے ان کا اظہار کروں گا۔ اپنا قلم میں نے توڑ دیا..... اس شام کوچ کر کے علی مسجد میں ٹھہرا (خیبر کے دہانے کا قلعہ) یہاں گھاٹی تنگ ہو گئی ہے۔ میں ہمیشہ ایک ٹیکری پر اپنے خیمے نصب کرتا ہوں۔ رات کو نیچے لشکر گاہ میں الاؤ بجائے

گئے تو خوب روشنی اور عجیب طرح کا چراغاں کا لطف آیا اسی لئے میں اس منزل میں شراب پیا کرتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی پی سحر سے پہلے معجون کھائی اور دن کو روزہ رکھا۔ دوسرے دن لشکر گاہ سے گینڈوں کی جھاڑیوں کی طرف چلے۔ بگرام (پشاور) کے قریب رود سیاہ کو عبور کیا اور بہاؤ کے رخ حلقہ بنا کے چلے۔ اتنے میں کسی نے خبر دی کہ قریب کی جھاڑیوں میں ایک گینڈا ہے۔ سواروں نے درختوں کے اس جھنڈ کو گھیر لیا۔ ہم باگ ڈھیلی چھوڑ کر حلقے میں شامل ہوئے۔ غل شور مچانے سے گینڈا جھاڑیوں کے اندر سے نکل آیا۔ ہمایوں اور پہاڑ سے آنے والوں نے کبھی گینڈا نہ دیکھا تھا انہیں اچھا تماشا ہاتھ آیا۔ کوئی کوس بھر تک تیر مارتے ہوئے پیچھا کرتے گئے۔ گینڈے نے کسی آدمی یا جانور پر حربہ نہیں کیا اور وہ اور دو اور گینڈے گرائے گئے۔ بہت دن سے میرے دل میں تھا کہ ہاتھی اور گینڈے کا مقابلہ کرا کے دیکھا جائے۔ اس شکار میں مہاتو ہاتھی کو لائے۔ گینڈا ہاتھیوں کی جانب جھپٹا مگر جب ایک مہاتو نے ہاتھی کو آگے بڑھایا تو وہ سامنے نہ ٹھہر سکا، بلکہ دوسری طرف دوڑ گیا۔

اس دن بگرام آکر میں نے چند (کل ۶ یا ۷) سرداروں اور خشیوں کو مقرر کیا کہ دریا کے معبر پر کشتیوں کا انتظام کریں اور سب اہل لشکر کا جو دریا اتریں نام لکھے جائیں۔ اس رات مجھے اسمال اور کھانسی میں خون آیا۔ بہت فکر ہوئی، لیکن خدا کی رحمت سے دو تین روز میں آرام ہو گیا۔ ہم بگرام سے چلے تو بارش ہونے لگی۔ اگلی منزل کابل ندی پر کی۔ یہاں خبر ملی کہ دولت خاں اور غازی خاں نے (جو پہلے بابر کے حلیف تھے اور اب حریف تھے) بیس تیس ہزار آدمی جمع کر لئے اور کلانور فتح کر کے اب لاہور پر چڑھائی کرنے والے ہیں (جہاں بابر کا محافظ دستہ متعین تھا) فوراً ایک قاصد سریت دوڑایا گیا کہ ہمارے آدمیوں کو خبر دے کہ ”ہم منزل بہ منزل آرہے ہیں۔ ہمارے آنے تک لڑائی نہ کریں۔“ ہفتے کو آب سندھ سے عبور کیا اور دوسرے کنارے پر اترے، جن سرداروں کے سپرد کشتیوں کا انتظام تھا انہوں نے خبر دی کہ فوج میں اچھے برے، چھوٹے بڑے، سپاہی اور نوکر سب ملا کر بارہ ہزار لکھے گئے۔

اسمال میدانوں میں بارش بہت کم ہوئی لیکن دامن کوہ میں اچھی ہوئی اور مزدع اراضی کو سیراب کر گئی۔ اسی لئے میں نے پہاڑوں کے نیچے نیچے سیال کوٹ کا راستہ اختیار کیا۔ گکمرٹوں کا علاقہ طے کرتے میں ایک ندی ملی جس کے پیٹے میں جگہ جگہ جقر (چھوٹے

جوہڑ) بن گئے تھے اور ان سب میں پانی کوئی ہاتھ ہاتھ بھر منجمد ہو گیا تھا۔ اتنی برف ہندوستان میں شاد و نادر پڑتی ہے۔ آئندہ جتنے سال میں ہندوستان میں رہا میں نے اس طرح کی جگہ کبھی نہیں دیکھی۔

سندھ سے پانچ منزلیں چل کر چھٹے پڑاؤ میں ایک دن اور ٹھہر گیا کہ لوگ سامان رسد حاصل کر لیں۔ اس روز ہم نے عرق پیا۔ ملا پر غری نے طرح طرح کی کہانیاں سنائیں۔ اسے اتنا بولتے نہیں دیکھا تھا۔ ملا شمس بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ پینے پر آیا تو رات گئے تک بس نہیں کی۔ ہر قسم کے اہل لشکر جو غلہ لینے گئے تھے، کھیتوں کو چھوڑ دوڑ تک جنگلوں پہاڑیوں کے اندر گھس گئے کہ شاید کوئی قیدی پکڑ لائیں۔ اس بے احتیاطی کی بدولت خود اپنے کئی آدمی ضائع کروا آئے۔

اگلے روز جنلم کو پایاب جگہ سے عبور کیا اور کناروں پر منزل ہوئی۔ دلی (بہ تصحیح مترجم) قرطی نے حاضر ہو کر سیالکوٹ کو (جو اس کی تحویل میں دیا گیا تھا) چھوڑنے کی مجبوری بیان کی۔ میں نے کہا تم سیالکوٹ میں نہ رہ سکتے تھے تو دوسرے امرا کے پاس لاہور کیوں نہیں چلے گئے؟ اس کا معقول جواب نہ دے سکا لیکن فوج کشی کا موقع تھا، اسے سزا نہیں دی۔ اسی پڑاؤ سے سید طوفان اور سید لاجپن کو ایک ایک کو قتل گھوڑا دے کے روانہ کیا کہ سرعت سے لاہور جا کر سرداروں سے کہیں کہ وہاں لڑائی نہ لڑیں بلکہ ہم سے سیالکوٹ یا پسرور آکر ملیں۔ ”افواہ سنا تھا کہ غازی خاں نے چالیس ہزار فوج فراہم کر لی ہے اور دولت خاں نے دو دو کمواریں کمر سے باندھی ہیں اور جنگ پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے مثل یاد آئی کہ ”نو سے دس ایتھے“ اور دل میں کہا کہ جب تک لاہور کے سردار آکر شریک نہ ہو جائیں، جنگ کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ ان کا انتظار کرو۔“ قاصد بھیج کر ہم چناب کی طرف چلے اور اسے اتر کر دوسرے کنارے پڑاؤ لگایا۔ میں کنارے کنارے سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی تک گیا جہاں دریا کی گہری شاخ کے اوپر قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ ارادہ کیا کہ سیالکوٹ والوں کو یہاں لا کر رہا کر جائے (سیالکوٹ میں پانی کے خراب ہونے کی وجہ سے) خدا نے موقع دیا تو ایسا کیا جائے گا۔ پھر کشتی میں بیٹھ کر لشکر گاہ کو واپس آیا۔ کشتی میں مے کشی کا جلسہ ہوا۔ بعض نے عرق، بعض نے ہلکی جو کی شراب (”بوزہ“) پی۔ بعض نے مجھ کو کھائی۔ نماز عشا کے وقت میں کشتی سے اتر۔ میرے خیمے میں آکر بھی کچھ شراب پی گئی۔ گھوڑوں کو آرام دینے کے لئے ہم یہاں ایک روز اور ٹھہرے۔

جمعے (۲۹ دسمبر) کے دن سیالکوٹ میں اترے۔ ہر دفعہ جب میں ہندوستان آیا، جاٹ گوجر اپنے پہاڑی جنگلوں سے نیچے اتر کر گائے بھینسیں لوٹ لے جاتے تھے۔ یہ منحوس لوگ اس ملک کے لئے بلائے جان ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے ملک اپنے زیر نگیں لیا ہے مگر یہ موذی پھر لوٹ مار کرنے اترے۔ جب سیالکوٹ میں لشکر پڑا تھا تو بستی سے پڑاؤ آنے جانے والوں پر بھی انہوں نے دست درازی کی اور ہنگامہ مچایا۔ اچھے بھلے آدمیوں کے کپڑے اتروائے۔ میں نے چوروں کو ڈھنڈوا کر پکڑا اور دو تین کے کلڑے کلڑے کرا دیئے۔

سیالکوٹ سے ایک سردار کے بھائی شاہم کو سرپٹ لاہور بھیجا کہ لاہور کے حکام سے دشمن کی صحیح خبر لائے کہ وہ کہاں ہے اور ہم کس طرح مقابلہ کریں گے۔ تاکید کر دی کہ قابل اعتماد آدمی کو بھیج کر معلوم کریں اور ہم کو اطلاع دیں۔

پڑاؤ پر ایک سوداگر نے خبر سنائی کہ ”عالم خاں نے سلطان ابراہیم سے شکست کھائی۔“ پھر وہ سب سازش کرنے لگے

شیر کا یہ کوچ جس میں وہ دو تین تین منزلیں مارتا ہوا پنجاب کی ندیاں عبور کرتا ہوا چلا، اپنے آزمودہ کار ترک سرداروں کو گھیرے سے نکالنے کی غرض سے تھا۔ ان سرداروں کو لاہور میں ڈٹے رہنا کا حکم تھا اور وہ سازباز بغاوت، بدعیدی کے اس طوفان میں جو ہندی مسلمانوں میں آیا ہوا تھا، اپنی منہضہ خدمت بڑی ہنرمندی سے انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں دغا اور بے وفائی کا یہ ساز غالباً سلطان ابراہیم لودھی کے مزاج کی وجہ سے جنبش میں آیا کہ وہ ایک لائق باپ کا تنگ دل حریص بیٹا تھا۔ ۱۵۱۸ء میں اس کے باپ (سکندر لودھی) نے تقریباً سالم ”ہندوستان“ ترکے میں چھوڑا تھا جس کی حدود گنگا سے سندھ تک وسیع تھیں اور کئی طاقت ور راجپوت ریاستیں اس میں شامل کر لی گئی تھیں۔ لیکن ابراہیم نے بادشاہ ہو کر اپنے اکثر بڑے بڑے امرا کو دشمن بنا لیا جو سندھ، افغانی اور ممبعا سرکش تھے۔ سن رسیدہ عالم خاں، ابراہیم سے جبراً بادشاہی چھین لینے کی تنگ و دو میں سندھ پار کابل گیا کہ بابر ہی ایک بیرونی بادشاہ مدد دینے کے قابل نظر آتا تھا۔ عالم خاں کا بھتیجا دولت خاں ابراہیم کی طرف سے پنجاب کا صوبہ دار تھا، اس نے اپنے لئے الگ ہی درخواست کی تھی۔ امراء ہند کی اس دہری غداری ہی سے بابر کو ترغیب ہوئی اور گذشتہ سال وہ لاہور تک تاخت لایا تھا۔ اس کی فوج تعداد میں کم، لیکن ایک ہی پیوستہ، باقاعدہ

جمعیت تھی جو ایک خاص مقصد لے کے ملک میں داخل ہوئی اور مزاحمتوں کو بلا وقت ہٹاتی ہوئی دلکش راوی کے کنارے لاہور پہنچ گئی۔ یہاں آکر پتا چلا کہ بڑھا دولت خاں سارا پنجاب خود لینے کی امید لگا رہا ہے، حالانکہ یہی وہ صوبہ تھا جسے بابر اپنی سلطنت کاہل سے الحاق کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ ابھی تک دہلی یا وہاں کی حکومت پر کسی حملہ کرنے کا خیال اسے نہ آیا تھا۔

اسی سال جب بابر واپس کاہل گیا کہ بلخ کی طرف جو فتنہ فساد ازبکوں نے برپا کیا تھا، اسے فرو کرنے کے لئے ہمایوں کی مدد سے تازہ افغانی فوج بھرتی کرے، تو یہاں دولت خاں اور اس کے بھتیجے غازی خاں نے اپنی فوجیں تیار کرنی شروع کیں کہ پنجاب میں متعین کاہلی جمعیتوں کو نکال باہر کریں۔ انہوں نے بابر کی سپاہ کو دو حصوں میں بانٹ دینے کی بھی تدبیر کی تھی اور اگر اسے دولت خاں کا بیٹا دلاور خاں بروقت ان کے فریب کی اطلاع نہ دے تو عجب نہیں بابر کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ پھر گزشتہ گرمیوں میں سن رسیدہ عالم خاں دوبارہ دربار کاہل میں ایک نئی یہ تجویز لے کر آیا کہ بابر، دولت اور غازی خاں کی سرکوبی کے علاوہ، قابل نفرت مگر طاقتور ابراہیم لودھی کو دہلی سے دفع کرے کہ عالم خاں کا تخت و تاج پر قبضہ ہو جائے اور پھر اپنا مرغوب خاطر صوبہ پنجاب وہ شوق سے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ قرارداد کر کے عالم خاں اس پیرانہ سالی میں افتاں دخیزاں پھر سندھ کے پار واپس گیا۔ لیکن اب جو اصل مقام محرکہ میں بابر آیا تو رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ عالم خاں جو لاہور کی محافظ فوج کے نام بابر کے خط لایا تھا۔ باغیوں کے صدر گروہوں، یعنی دولت خاں اور غازی خاں سے خود مل گیا اور ان میں یہ نئی سازش کی کھچڑی پکائی گئی کہ تینوں مل کر ابراہیم سے دہلی چھین لیں اور ادھر بابر کے لاہوری دستے کا قلع قمع کر کے اسے بوہنے سے روکے رکھیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ بابر کے پاس جنگ آزما سپاہیوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ چنانچہ بابر پریشان ہو کر جلد سے جلد لاہور آ رہا تھا اور اپنے دشمنوں کے ٹھیک ٹھیک مقام، ارادوں اور لشکروں کی صحیح خبروں کا جوہا تھا۔

سازشوں کا دھواں اس کے گرد چھایا ہوا تھا۔ لیکن اصلی طاقت ور حریف دھوئیں کے عقب میں ابراہیم لودھی ہندوستان خاص کا فرماں روا تھا جس کی فوجیں دہلی و آگرہ میں پڑی تھیں اور دوسرا، راجپوت ریاستوں کا وہ جتھا جو مسلمانوں کے خلاف آگے جنوب میں گٹھ جوڑ کر رہا تھا۔ اس طرف سے پہلی اطلاع بابر کو جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ ملی کہ عالم خاں نے

ابراہیم لودھی سے شکست کھائی۔ اس کی تفصیلی باہر نے اس طرح تحریر کی ہے: ”کابل میں مجھ سے رخصت ہو کر عالم خاں، سخت گرمی اور ساتھیوں کو تکلیف ہونے کے باوجود دو دو منزلیں روزانہ طے کرتا ہوا، لاہور گیا۔ انہی ایام میں ازبک سرداروں نے بلخ پر پیش قدمی کی تھی لہذا میں فوراً ادھر چل پڑا۔ عالم خاں نے لاہور میں میرے سرداروں سے اصرار کیا کہ ہمیں غازی خاں سے مل کر دہلی آگرے پر فوج کشی کرنی چاہئے۔ یہی بادشاہ کا حکم ہے۔ میرے سرداروں نے جواب دیا۔ ہم غازی خاں پر کیونکر بھروسہ کریں۔ ہمیں بادشاہ حکم دے چکا ہے کہ جب تک دربار کابل یا لاہور وہ یرغمال نہ بھیجے، اس کے ساتھ میل نہ کیا جائے۔ تمہیں وہ شکست دے چکا ہے۔ تم کس برتے پر اس سے اتحاد کرتے ہو۔ اور اس اتحاد کا فائدہ بھی کیا ہو گا؟ یہ کہہ کر انہوں نے انکار کر دیا۔ عالم خاں نے اپنے بیٹے شیر خاں کو دولت خاں اور غازی خاں کے پاس بھیجا اور پھر سب نے مل کر یہ سازش پکائی کہ دولت اور غازی تو ادھر (پنجاب) کے سب قلعوں کو سنبھالیں اور عالم خاں دوسرے امراء کو ہمراہ لے کر دہلی اور آگرے پر قبضہ جمائے..... چنانچہ وہ منزل بہ منزل دہلی روانہ ہوئے۔ اسے گھیرے میں تو لے لیا۔ لیکن نہ وہاں کی فوج کی ناکہ بندی کر سکے نہ یورش کر کے شہر فتح کر سکے۔ ان کی سپاہ شمار میں کم و بیش تیس ہزار ہو گی۔ سلطان ابراہیم کو ان کے مقابلے میں آنے کی خبر ہوئی تو فوراً سوار فوج تیار کر کے لڑنے آیا۔ اہل سازش اپنی لشکر گاہ سے اس کا سامنا کرنے چلے مگر آپس میں بحث کر کے طے کر لیا کہ ”دن کے وقت لڑائی ہوئی تو بدول افغان جو ابراہیم کے لشکر میں ہیں، بدنامی کے ڈر سے اسے چھوڑ کر ہمارے پاس نہیں آئیں گے، لیکن رات کے وقت حملہ کیا جائے جب کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تو ہر کوئی اپنا اپنا راستہ لے گا۔“

”دو دن سہ پہر کے بعد وہ کوئی چھ کوس کے فاصلے سے چلے اور دونوں دن فیصلہ نہ کر سکے کہ شب خون ماریں یا واپس پلٹ جائیں۔ رات کے دو دو پہر گھوڑوں پر چڑھے بیٹھے رہے۔ آخر تیسری رات کو وہ بھی پیچھے پھر کے ختم ہوتے، انہوں نے چند ڈیروں اور چھپروں پر حملہ کیا۔ غل شور مچا کر ان میں آگ لگا دی۔“

سلطان ابراہیم صبح کی پہلی نوبت بچتے تک اپنے سراپے سے اٹھ کر نہ آیا۔ عالم خاں کے آدمی ان ڈیروں کا سامان لوٹنے اور دوسرے خیمے تاکنے میں مصروف تھے جب کہ دن نکل آنے پر ابراہیم کے اہل لشکر نے دیکھا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ ایک ہاتھی لے

کر لڑنے نکلے۔ عالم خاں کے آدمی ہاتھی کے سامنے نہ تھم سکے اور بھاگ پڑے۔ عالم خاں (بہ تصحیح مترجم) میان دو آب کے علاقے سے فرار ہوتا ہوا، نواح پانی پت میں آیا سرہند سے گزرتے ہوئے اسے ہماری پیش قدمی کی خبر ملی۔ اس کا بیٹا دلاور خاں جو ہمیشہ میری خیر خواہی کرتا رہا اور اس کی وجہ سے دو تین مہینے قید میں ڈالا گیا، باپ کے ہمراہ تھا مگر اب اسے چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے پاس سلطان پور چلا گیا اور چند روز بعد میرے پاس حاضر ہوا۔ عالم خاں اور اس کے باقی ماندہ رفیق ستلج عبور کر کے دامن کوہ کے ایک قلعے میں چلے گئے۔

افواہوں کی وبا سی پھیلی ہوئی تھی مگر بابر نے کوچ جاری رکھا۔ ہر منزل پر بکھرے ہوئے مغل دستے، آزمودہ کار سردار جیسے محمد علی دنگ دنگ (۵۵) آتے اور شریک لشکر ہوتے۔ دشمن کی ایک بڑی جمعیت (جانب لاہور) راوی کے کنارے سنی گئی۔ بابر سیدھا ان کے خلاف چڑھا اور دوبارہ حریف کے اس موقع پر دولت اور غازی خان تھے، قوت آزمائی کی جرات کئے بغیر عزم مصمم کے سامنے سے بھاگتے نظر آئے۔ غیر منظم دشمنوں کا الگ الگ منتشر ہونا عین بابر کے حسب مراد تھا۔ اس نے اپنے لاہوری سرداروں کے ماتحت جو علاقے سے واقف تھے، تعاقب میں ایک فوج روانہ کی اور تاکید کی کہ خاص طور پر غازی خاں کی تلاش کی جائے جو اچھا لڑنے والا تھا۔ ضعیف العزم عالم خاں کو اس کے چند روزہ حلیف چھوڑ گئے تھے۔ وہ ایک پہاڑی قلعے میں کچھ خطرناک نہیں رہا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ ”افغان اور ہزارہ قبائل کا ایک میرا لشکر اس قلعے کے نزدیک سے گزرا اور قریب تھا کہ قلعے کو حملہ کر کے چھین لے لیکن رات ہو گئی۔ ادھر قلعہ والے اندھیرے میں نکل جانا چاہتے تھے۔ ان کے گھوڑے دروازہ قلعہ میں ایسے پھنسے کہ نکل نہ سکے۔ وہاں کچھ ہاتھی بھی ہوں گے جنہوں نے کئی گھوڑے روند کر ہلاک کر دیئے۔ عالم خاں گھوڑے پر سوار ہو کر نہ نکل سکا تو اندھیرے میں پیدل بھاگ نکلا اور سخت تکلیفیں اٹھاتا ہوا کسی نہ کسی طرح غازی خاں کے پاس پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ مگر وہاں اس کی کچھ آؤ بھگت نہیں ہوئی آخر بار کر میرے پاس حاضر ہونا پڑا۔“

اس کے آنے سے قبل خود بابر راوی اتر کر (۲۔ جنوری) اپنے ہراول دستے کے پیچھے پیچھے ملوت کو چلا جہاں نشیبی پہاڑیوں کے اس قلعے میں دولت خاں نے پناہ لی تھی۔ پورے لشکر نے جمع ہو کر قلعہ گھیر لیا۔ پنجاب کا یہ سابق صوبہ دار اب اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا،

اس کا ایک نو عمر پوتا قلعے کے باہر آیا کہ بادشاہ سے قبول اطاعت کی شرائط کا پتہ چلائے۔ وہ یہ وعدہ لے کر واپس گیا کہ ہتھیار ڈال دیئے تو عفو و درگزر کا سلوک ہو گا، مقابلہ کیا تو بزور مغلوب کیا جائے گا۔ اگلے دن بابر سوار ہو کر قلعے کی دیکھ بھال کو نکلا کہ اندر والے محصور بھی اسے دیکھ لیں۔

”اب دولت خاں نے پیام بھیجا کہ غازی خاں پہاڑوں میں نکل گیا مجھے معافی مل جائے تو قلعہ حوالے اور خود خدمت کرنے کو حاضر ہوں۔ میں نے خواجہ میر میراں کو بھیجا کہ اس کے دل سے خوف دور کرنے اور اپنے ہمراہ باہر لے آئے۔ وہ اپنے ساتھ بیٹے کو بھی لایا۔ میں نے حکم دیا کہ دونوں تلواریں جو مجھ سے لڑنے کو باندھتا تھا، اب گردن میں ڈال کر سامنے لایا جائے۔ یہاں تک نوبت آنے پر بھی اس کی اکڑ نہیں گئی۔ خیرہ چشتی سے حیلے کرتا تھا۔ سامنے آ کر جھکنے میں بھی تامل کیا۔ میں نے نوکروں سے کہا پاؤں کھینچ کر تعظیم کراؤ اور میرے رو برو بٹھا دو۔ پھر ایک ہندوستانی زبان جاننے والے سے کہا کہ میں جو کچھ کہوں لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے اسے سناؤ۔ میں نے کہا ”اس سے کہو کہ میں تجھے باپ کے لفظ سے یاد کرتا تھا اور تیری توقع سے بڑھ کر عزت و تکریم کرتا رہا۔ تجھے اور تیرے لڑکوں کو در بدر پناہ لیتے پھرنے سے بچایا۔ تیری حرم اور اہل و عیال کو ابراہیم کی قید میں نہیں جانے دیا۔ تیرے باپ کا تین کروڑ کا ملک تجھے دیا۔ بتا تو سہی میں نے تیرے ساتھ کوئی برائی کی تھی کہ تو نے مجھ سے لڑنے کے لئے دو دو تلواریں کمر سے باندھیں؟ اور فوج لے کر میرے مملوکہ اقطاع پر چلا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔“

بڑھے سے کوئی جواب نہ بن پڑا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور حقیقت میں جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔ خواجہ میر میراں کے پاس اسے رکھے جانے کا حکم دیا۔ ہفتے کو میں خود قلعے کے دروازے پر گیا اور گھوڑے سے اتر کر ایک ٹکڑے پر کھڑا ہو گیا کہ ان کے سب کنبے اور زنان خانہ کے لوگ حفاظت سے روانہ کر دیئے جائیں اگرچہ غازی خاں کی نسبت گمان تھا کہ جا چکا ہے لیکن بعض لوگ کہتے تھے ہم نے اسے قلعے کے اندر دیکھا ہے اسی واسطے اپنے ذاتی نوکر اور معتمد علیہ دروازے کی پاسبانی کے لئے مقرر کئے کہ وہ دھوکہ دے کے نکلنے نہ پائے اور زر و جواہر چوری سے لے جاتے دیکھیں تو ضبط کریں۔ رات کو بھی میرا قیام ٹکڑے پر رہا پھر قلعے کے اندر سیر کرنے گیا۔ غازی خاں معمولی سا شاعر اور مطالعے کا بڑا شوقین تھا، میں خاص طور پر اس کا کتب خانہ دیکھنے گیا۔ متعدد کتابیں بہت

اچھی تھیں۔ چند ہمایوں کو دیں اور چند کامران کو (قدھار) بھیجیں۔ علمی مسائل کی اور بھی بہت سی کتابیں تھیں مگر اتنی بیش قیمت نہ نکلیں جیسی اول امید تھی..... قلعہ ملوت محمد علی (جنگ جنگ) کے، جس نے اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی، تفویض کیا گیا اور دو سو (یوسف زئی) افغان سپاہی پاسپانی کے لئے اسے دیئے۔ خواجہ کلاں کئی اونٹوں پر غزنیں کی شراہیں لایا تھا، لہذا اسی کے ڈیرے میں جہاں سے قلعہ اور لشکر گاہ نظر آتی تھی، ہم نے جلسہ لگایا۔ ”مضوں نے عرق پیا۔ کسی نے شراب، ملا جلا جلسہ تھا۔“

عزم و ہمت کی رکاب میں پاؤں ڈالتا ہوں

جنگی مصروفیات کے ہنگام میں بھی ہمارا شیر اپنے پٹے ہوئے حرفوں پر حرف زنی کے بغیر نہیں رہا۔ لکھتا ہے کہ دولت خاں سلطان پور جا کر، جسے اپنے عہد اقتدار میں بنایا تھا، م گیا اور غازی خاں کو جو پہاڑیوں میں چھپتا پھرتا تھا، نام دھرتا ہے کہ وہ بے شرم باپ، بھائی بہنوں کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور سعدیؒ کا قطعہ نقل کرتا ہے کہ

بہ میں آں بے حمیت راکہ ہرگز نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خوشن را زن و فرزند بکار و بہ بختی

ذاتی تنگ و ناموس کا ہندوستان کے سپاہی پیشہ مسلمانوں میں بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں والے یہ مشاہدہ کئے بغیر نہیں رہے کہ اگرچہ بادشاہ ترک و مغل اور افغان غارتگروں کی فوج لے کر چڑھ آیا ہے اور اپنے دشمنوں سے سختی اور تنگ دلی میں کمی نہیں کرتا، تاہم اسے عزت نفس کا پاس ہے، بات کا سچا ہے اور اپنے اسیروں کے ساتھ غیر معمولی غفو و درگزر سے پیش آتا ہے۔ راوی عبور کرنے کے بعد بابر کی یلغار کی تیزی کم ہو گئی تھی اور اس کے پاس ہندوستان کے عمائد و رؤسا کے دوستانہ خطوط، اور ان میں سے بعض اصالتاً بھی آنے لگے تھے۔ ایسے ملک میں جہاں ہر ٹیکری پر گاؤں اور بلندی پر مضبوط گڑھ بنے دیکھے تھے، بابر نے لوگوں کو اپنی طرف یہ میلان اقبال مندی خیال کیا۔ جنگل جھاڑیاں تک بندروں اور موروں سے معمور تھیں۔ اثناء سفر میں بوڑھا عالم خاں ایک قلعے سے نکل کر تنہا پیادہ پا قبول اطاعت کے لئے حاضر ہوا۔ بابر نے اس کی آمد سن کر گھوڑے اور پیشوائی کے لئے سردار بھیجے کہ توقیر و عزت سے لے کر آئیں۔ سلاطین دہلی کے خاندان کے ایک ایسے بزرگ فرد کا ہاتھ آجانا عین مفید مطلب تھا۔ مفت کے یہ غمال حلیف کے ساتھ سیاسی

مصالح کے مطابق عزت و حرمت کا برتاؤ کیا گیا۔ اس کا بیٹا دلاور خاں پہلے بھی بابر کی یزخواستی کا دم بھرتا تھا، اب دوبارہ معافی کا خواستگار بن کر حاضر ہوا۔ قیدی امیروں کے دیے یا معافی کے بارے میں (بہ تصحیح مترجم) اسے شریک مشورہ کیا گیا۔

موسم بہار کی ابتدائی گرمی میں برف پوش ہمالیہ کے دامن میں سفر کرنا پر لطف تھا۔ اسی میں بڑے بڑے زرخیز اقطاع جو لڑنے والے دشمنوں سے چھینے تھے، جاں نثار سرداروں کو عطا کئے گئے ہندوستان کے رؤسا کو بھی نظر آگیا کہ پادشاہ کے خلاف لڑنے کی بجائے اس کی سلک ملازمت میں منسلک ہو جانا زیادہ نفع کا سودا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر ابھی سے ملک پر فرماں روائی کے اصول و ضوابط اپنے ذہن میں مرتب کر رہا تھا۔

سرہند کے قریب ایک گستاخ سا ہندوستانی امیر لشکر میں آیا اور کہا مجھے سلطان ابراہیم نے سفیر بنا کر بھیجا ہے، بابر بھی اپنا سفیر جو بابا شنشاہ دہلی کے دربار میں روانہ کرے۔ بابر کو ترنگ سو جھی۔ دو پہرہ داروں کو حکم دیا کہ وہ سفیر بن کر سلطان ابراہیم لودھی کے پاس جائیں۔ ”لودھی نے ان پیچاروں کو قید میں ڈال دیا تھا، لیکن عین (بانی پت کی) جنگ کے وقت وہ چھوٹ کر نکل آئے۔“

اسی سلسلے میں پادشاہ نیولین کی طرح آغاز جنگ کے قریب قلم کی جولانی دکھاتا ہے :
 ”اب میں نے ہمت کی رکاب میں پاؤں رکھا اور توکل علی اللہ کی باگ ہاتھ میں لے کر ابراہیم لودھی خلف سلطان سکندر لودھی افغان سے لڑنے چلا جو ممالک ہند کا حاکم اور پائے تخت دہلی میں مقیم تھا۔ اس کا لشکر شمار میں ایک لاکھ اور اس کے اور ماتحت سرداروں کے جنگلی ہاتھی ایک ہزار بتائے جاتے تھے..... ایک رات ہم ایک سو کھی ندی کے کنارے اترے۔ دیکھ بھال کرتے گھوڑوں پر چلے تو چند کوس آگے ایک اور آب رواں کی ندی ملی جس کا ہماؤ چار پانچ پون چکیوں کو چلانے کی قوت رکھتا تھا۔ مقام خوش منظر، ہوا لطیف تھی۔ اس کے بالائی گھاٹ پر جہاں سے پانی پہاڑیوں سے نکل کر نیچے آتا ہے میں نے ”چار باغ“ بنانے کا حکم دیا..... اس مقام پر خبر ملی کہ سلطان ابراہیم دہلی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اسی طرح حمید حاکم حصار (شمال مغرب دہلی) سے دس پندرہ کوس آگے بڑھ آیا ہے۔ ابراہیم کے لشکر کی خبر لانے کے بعد بیگ اور حمید خاں کی فوج کا حال معلوم کرنے مومن آتکے بھیجے گئے..... ہم انبالہ کے برابر سے چل کر ایک بڑے تالاب کے کنارے اترے۔“
 ظاہراً بادشاہ کو دامن کوہ سے میدان میں آنا پسند نہ تھا۔ اس کے ولایتی سپاہی اور

سردار پہاڑوں کے موسم و مناظر سے مانوس تھے۔ حسب معمول وہ یہاں بھی نئی بھرتی سے فوج کے کھانچے بھر رہا تھا۔ اگرچہ خوب جانتا تھا کہ یہ نووارد فوجی نظم و ضبط کے بہت کم پابند ہوتے ہیں۔ مگر ابراہیم کے آہستہ آہستہ بڑھنے کی خبر سن کر اس نے فوراً کام شروع کر دیا اور مہینہ کی پوری جمعیت ہمایوں کی سپہ سالاری میں حمید خان کے خلاف روانہ کی تاکہ نوجوان شہزادے کی جنگی قابلیت کا امتحان کرے۔ فوج کی تعداد بہت معقول اور چیدہ آزمودہ کار سردار جیسے خواجہ کلاں، خسرو کوکلتاش، محمد علی جنگ جنگ ہمراہ کئے۔ ان کی موجودگی میں ہمایوں کو شاید خود کچھ بھی نہ کرنا پڑا ہو گا لیکن بہر حال وہ وہاں تھا۔

حصار کے لشکر سے، اولاً ہراول دستے کی مڈ بھڑ ہوئی۔ مغل سوار بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمن پر جا پڑے اور جب اس نے ہر طرف سے سمٹ کر انہیں گھیرنا چاہا تو کنارہ افق سے اصل فوج ابھرتی ہوئی دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ ہراول کو آگے بڑھا کے لڑا: حصار کے سارے لشکر کو سامنے لے آنے کی چال تھی۔ قدرتی طور پر حصار والوں نے اپنے رخ دوسری جانب پھیرا۔ لیکن مغل حملہ زن رسالے کی طرف سے یہ منہ پھیرنا غضب ہو گیا۔ پھر ان کے قدم نہ کئے۔ ہمایوں کے منتخب سرداروں نے مار مار کے بھگا دیا اور ددور تک پیچھا کیا۔ کئی سو قیدی، چند جنگی ہاتھی اور معقول مال غنیمت ہاتھ آیا۔

باہر نے ہمایوں کی فتنمنہ فوج کی خوب قدر افزائی کی تھنکیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو (توڑے دار) بندوق سے اڑا دیں۔ ہمایوں کو خلعت فاخرہ، اسپ خاصہ اور ولایت حصار عطا کی گئی۔ خوش ہو کر لکھتا ہے کہ ”یہ تو اس کی پہلی مہم اور پہلا معرکہ تھا۔ ہماری آئندہ کامیابی کا بہت اچھا شگون ہوا۔“ رفیقوں کے اور زیادہ دل نشین کرنے کی غرض سے ہمایوں کے پہلی بار ڈاڑھی منڈانے کی رسم بھی منائی گئی۔ وہ اس وقت سترہ سال کا ہو گیا تھا۔

بایں ہمہ باہر پہاڑیوں اور گھائیوں کا سہارا چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ کوچ کی رفتار بہت سست رکھی، اس امید میں کہ دہلی کا لشکر عظیم شاید بڑھ کر ناہموار زمین پر لڑنے کی جسارت کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور باہر کو گنگا کے مشہور معاون دریائے جنا کے کنارے تک بڑھ کر دشمن کا انتظار کرنا پڑا۔ پڑاؤ سے حسب معمول وہ گرد و نواح کا جائزہ لینے روانہ ہوا:

دریا کو پایاب اتر کے میں (موضع) سرسادہ کی سیر کو گیا۔ یہاں چشمے سے ایک تالہ نکلا ہے۔ بری جگہ نہیں۔ یہاں ہم نے مجنوں کھائی۔ تروی بیگ کو یہ جگہ پسند آئی اور اس نے تعریف کی تو میں نے کہا ”سرسادہ تمہارا ہے۔“ یعنی اسی کو بخش دیا۔ میں نے ایک کھلی

کشتی میں سائبان ڈلوا لیا تھا کہ دریا میں سیر کے کام آئے۔ کبھی کبھی ہم بہاؤ کے رخ نیچے (دشمن کی بیرونی چوکیوں کی جانب) اسے لے گئے۔“

ان کلمات سے بابر کی بے پروائی ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی سپاہ کا میلان خاطر معلوم کرنے کی فکر میں تھا۔ نئی سرشماری کی گئی تو اس کی تعداد گنتا اتنی نہ نکلی جتنی توقع تھی۔ جنگ کا انتظار کرتے کرتے کچھ لوگ تھک گئے اور لشکر چھوڑ کر پل دیئے تھے۔

مغل سواروں کا جھپٹا

”لشکر میں بعض اشخاص متردد تھے۔ تردد اور خوف سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خدا نے جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ نہیں ٹل سکتا۔ پھر بھی سچ پوچھتے تو اس قسم کی پریشانی یا اندیشہ مندی پر گرفت نہیں کر سکتے میرے آدمی اپنے گھروں سے دو تین مہینے کی راہ پر، زحمت انتظار کھینچ رہے تھے۔ ایک اجنبی قوم سے مقابلہ تھا جس کی زبان ہم نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ ہمارے حریف لشکر کی تعداد ایک لاکھ اور اس میں ایک ہزار جنگی ہاتھی ہیں۔ ابراہیم کے ہاتھ میں اپنے باپ دادا کی ساری جمع جتھا تھی لیکن یہ روپیہ اس نے اپنے رفقاء جنگ میں تقسیم نہیں کیا۔ بیٹھا سکے گنتا رہا۔ جنگ کا ساز و سامان تیار نہیں کیا۔ جیسا کہ تجربہ کار سپہ سالاروں کا دستور ہے۔ نہ وہ فیصلہ کر سکا کہ ٹھہرا رہے، ہٹ جائے یا لڑ پڑے۔“

یہ باتیں بڑے معرکے کے کئی ہفتے بعد تحریر کی گئی ہیں، اور اول پسند خیال آرائی سے خالی نہیں۔ ہر چند بابر حریف کی کثرت فوج کی افواہوں کو وقعت نہیں دیتا تھا، تاہم اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ محتاط ابراہیم کی سوار فوج کے مقابلے میں اس کے رسالوں کا پلڑا بہت ہلکا ہے۔ حکومت دہلی نے جن جنگ جو باج گزاروں کی امدادی فوج طلب کی وہ تعداد میں نیم ویراں کابل سے چوگئے تھے۔ دو پشت سے اس خاندان کے بادشاہ فتح پر فتح پاتے رہے تھے۔ پھر یہ کہ بابر تو سندھ پار کے پہاڑوں سے اتنی دور چل کر آیا اور ابراہیم کو اپنی دہلیوں کے حصار بند مقام سے تیس میل سے زیادہ چلنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

بچھلے ہفتے سے بابر کی فوج لشکر گاہ کی پتلی پٹی کے گرد قصبہ پانی پت سے بائیں جانب باڑ تیار کر رہی تھی۔ اس کے کنارے کنارے سامان کے سات سو چھکڑے چرمی رسوں سے باندھے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور پر چوڑے فصل چھوڑے تھے، جن میں عثمانی ترک

ماہروں کی توہیں زنجیروں کے پیچھے لگائی گئی تھیں۔ بعض کھلے فصل وہ تھے جن میں چری جالیاں تنکیوں کی حفاظت کے لئے بنائی تھیں اور قطار کے بائیں سرے پر زیادہ چوڑی جگہ چھوڑ دی تھی کہ یہاں سے دو دو سواروں کا پراجھٹ کر دشمن پر جا گرے۔ مطلب یہ کہ باہر نے مداخلت کا پورا انتظام کیا اور جوابی حملے کے لئے جگہ نکال رکھی تھی۔ لیکن سپاہ دہلی نے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی اور ادھر سپاہ کابل کو دشمن کی کثیر سوار فوج کے ہوتے پہاڑی کے دامن کی طرف ہٹنے کا موقع نہ تھا۔

ایک دفعہ باہر نے اپنے معتمد علیہ اور مغل برادری کے چچن تیمور سلطان کو فوج دے کر بھیجا کہ دہلی کے لشکر عظیم کے ایک پہلو پر ضرب لگائے۔ تیمور سلطان کچھ قیدی اور مال غنیمت بھی لایا، مگر دہلی والوں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اسی طرح مغل سوار تیر اندازوں نے بڑھ بڑھ کر کئی بار انہیں تنگ کیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

یہ چالیں تو نہ چل سکیں لیکن اتفاقی اسباب نے لشکر دہلی کو اس بڑے حملے پر آمادہ کر دیا، جس کی باہر تدبیریں کر رہا تھا۔ بعض نئے ہندوستانی حلیفوں نے لشکر دہلی پر شبخون مارنے کا مشورہ دیا۔ انہیں اطمینان آگے بھیجا اور عقب میں مدد کے لئے مسلح سوار تیار رکھے گئے۔ جیسا کہ اکثر ہوا ہے، شبخون مارنے والے راستہ بھول گئے یا لشکر دہلی کے قریب جمع نہ ہو سکے اور صبح ہوتے ہی سلطان ابراہیم کے رسالے جنگی ہاتھی لئے ہوئے مقابلے میں نکل آئے۔ باہم جھڑپ ہوئی اور پھر دن نکلنے سے پہلے حملہ آور واپس ہوئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے پیر میں تیر کا زخم آیا۔ ہمایوں حفاظت سے فوج نکال لانے پر مامور ہوا اور اس نے یہ خدمت انجام دی۔ مگر اس چوک جانے کے باعث ابراہیم اور اس کے سرداروں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے دن کے وقت پوری فوج سے مغلوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجمعے کو جب اچھی طرح روشنی ہو چکی تھی، اطلاع ملی کہ دشمن صف بندی کر کے بڑھ رہا ہے۔ فوراً ہم نے زرہ پنی، ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔“

پانی پت کے میدان میں اس روز (۲۰۔ اپریل ۱۵۲۶ء مطابق ۸ رجب ۹۳۲) کیا ہوا، اس کی صاف صاف کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ ابتدائی زمانے میں باہر اپنی فوج کی اگلی صفوں کو لڑایا کرتا تھا۔ پانی پت میں بجور (باجوڑ) کی طرح وہ سپہ سالار اعلیٰ کے مقام پر لڑنے والوں کے عقب میں رہا۔ لہذا اس کے صرف احکام، تقررات، فوجوں کو ادھر سے ادھر پھیرنے کا ذکر آتا ہے۔ تاہم اس قدر پتا چل جاتا ہے کہ دہلی کے سواروں کا دل بادل تیز تیز

بڑھ کر مغل مورچہ بندی کے سامنے پہلے ٹھکتا اور پھر ٹوٹ کر حملہ کرتا ہے۔ ہندوستان کے امراء، رؤسا خود مطلب سلطان ابراہیم سے کیسے ہی ناراض ہوں، میدان جنگ میں انہوں نے دیوانہ وار دلیری دکھائی۔ بابر کو تھوڑی ہی دیر میں مہمہ سنبھالنے کے لئے فوج ردیف سے کام لینا پڑا۔ دوسرے حصوں میں بھی سبک پادستے جنہیں جوابی حملوں کے لئے لگا رکھا تھا، صف جنگ سلامت رکھنے کا کام میں لائے گئے۔ حتیٰ کہ محمد علی جنگ جنگ جسے تیر نے بیکار کر دیا تھا، اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی جمعیت میں آکر شامل ہو گیا۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ تیروں کی بازوؤں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیا۔ مغل انتہائی میسرے کی خندقوں اور جھنکاڑ کے مورچوں سے برابر چپے رہے۔ رومی (ترک) استاد محفوظ آڑ سے برابر توپیں بھر بھر کے آتش زنی کرتے رہے تا آنکہ رفتہ رفتہ ”پلٹانے والے“ دستے بازو کے سروں تک نکل آئے۔ بائیں جانب تو وہ لڑائی میں مخدوش طور پر پھنس گئے اور بابر کو آخری ردیف سوار بھیج کر ان کی مدد کرنی پڑی، لیکن دائیں طرف کے دستے ولی قریلی اور ملک قاسم کی قیادت میں کھلی جگہ نکل آئے اور سلطان ابراہیم کے بازو پر عقب سے جھپٹ کر گرے۔ دوپہر ہوتے دوسرا بازو بھی دکھیل کر مغلوں نے وسط میں گھیر لیا اور اب یہ غیر مرتب انبوہ توپ و تفنگ کی مار اور ترکوں کی چھوٹی پر قوت کمانوں کی تباہ کن بازوؤں کی عین زد میں آ گیا۔ سوار فوج کو آتش باری سے بچنے کی کوئی نہ سوچھی۔ غول کے غول پھٹ کر پلٹنے اور واپس دہلی کو بھاگنے لگے۔ مختصر یہ کہ مورچہ بند پیادوں نے حملہ آور سواروں کو مغلوب کر لیا۔ اور باقاعدہ فوج کی جنگی تدابیر شجاعت ذاتی پر غالب آئیں۔ بابر کی ماہرانہ سپہ سالاری نے ابراہیم کی اندھا دھند یورش کو شکست دی۔ سلطان دہلی مقتولوں کے ڈھیر میں مرا ہوا ملا۔ بابر نے حکم دیا کہ اسے عزت حرمت سے مسنون طریق پر دفن کیا جائے اور اپنے سردار خلیفہ کو اس کام پر نگرانی کے لئے بھیجا۔ لکھتا ہے کہ ”آفتاب ایک نیزہ بلند ہوا ہو گا۔ جب کہ جنگ کا پہلا تصادم ہوا۔ دوپہر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ زوال آفتاب کے ساتھ دشمن کو شکست فاش اور ہمارے رفیقوں کو فخر و مسرت نصیب ہوئی۔ خدائے تعالیٰ کی رحمت و کرم سے یہ دشوار کام ہمارے لئے آسان ہو گیا۔ وہ لشکر کثیر آدھے دن میں زمین پر منتشر غبار بن گیا۔ ابراہیم کے گرد و پیش کے پانچ چھ ہزار آدمی مارے گئے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسرے مقتول ۱۵ تا ۱۶ ہزار ہوں گے لیکن بعد میں آگرے آ کے ہندوستانیوں سے سنا کہ اس جنگ میں کم و بیش چالیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

”دشمن کو شکست ہوتے ہی سواروں کی پکڑ دھکڑ بھاگتوں کا تعاقب شروع ہوا، میرے آدمی ہر درجے کے امیر و رئیس گرفتار کر کے لائے (ہندوستانی) مہاتوتوں نے ہاتھیوں کے غول کے غول لا کر حوالے کئے۔ شروع میں خیال تھا کہ ابراہیم فرار ہو گیا اور اسی لئے میں نے تیزی سے اس کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ پھر سوار ہو کر اس کے لشکر گاہ، خیمہ و بارگاہ کا معائنہ کیا اور ایک تلاؤ کے کنارے اتر پڑا۔ نماز عصر کے وقت میرے چھوٹے برادر نسبتی خلیفہ کو ابراہیم کی لاش ملی اور اس کا سر کاٹ لایا۔

”اسی روز ہمایوں میرزا کو (باہر اس جنگ کے بعد سے اپنے بیٹے کی شنراؤگی کو لفظ ”میرزا“ سے بطور خاص نمایاں کرتا ہے۔) خواجہ کلاں اور خازن ولی کے ہمراہ مختصر سامان لے کر بہ غلبت آگرے جانے کا حکم دیا کہ شہر پر قبضہ اور وہاں کے خزانوں پر سپرہ بٹھادیں۔ دوسرے سردار مامور کئے گئے۔ کہ سیدھے دہلی جائیں اور وہاں کے خزانوں کی نگرانی کریں۔ اگلے دن ہم خود چلے لیکن گھوڑوں کو آرام دینے کی خاطر کوس بھر چل کر جہنا کے کنارے اتر گئے اور دو دن ٹھہر کر (دہلی میں) پہلے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی (بہ تصحیح مترجم) زیارت سے مشرف ہوئے پھر شام کو قلعہ دہلی میں داخل ہوئے اور رات وہاں بسر کی۔ دوسرے دن خواجہ قطب الدینؒ کے مزار پر حاضری دی سلطان بسلول اور سکندر لودھی کے مقابر اور باغوں کی سیر کی۔ لشکر گاہ میں واپس آکر کشتی میں بیٹھے اور عرق پیا۔

”دہلی کا فوج دار ولی قہرلی کو بنایا گیا خزانوں پر مر لگا دی گئی۔ جمعرات کو جہنا کے کنارے شہر تغلق میں (تغلق آباد۔ باہر یہاں کے ترک ناموں پر زور دیتا ہے تاکہ اس ملک کے سابقہ ہم نسل سلاطین ترک، تغلق اور غزنویوں کی یاد دلائے) جمعے کو میں لب دریا اردو میں رہا۔ مولانا محمود اور شیخ زین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ دہلی میں جمعہ پڑھنے گئے۔ میرے نام کا خطبہ پڑھا اور مساکین میں روپیہ تقسیم کر کے واپس آئے۔

اس ضمن میں باہر پہلی مرتبہ اپنے ”بادشاہ کابل و دہلی“ کے اعلان کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ۲۷۔ اپریل ۱۵۲۶ء (۱۵ رجب ۹۳۲ھ) پہلا جمعہ تھا جس دن سے مغل سلاطین اعظم کے پہلے مغل بادشاہ کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اگرچہ خود باہر اپنے آپ کو مغل کہلوانا سخت ناپسند کرتا تھا۔

قلند باہر کی شہرت بادشاہی

پانی پت کی ناگمانی مصیبت کبریٰ شمالی ہند پر بجلی بن کر گری۔ ابراہیم کا جسم زیر زمین

تاہو ہوا، فوج کا تار و پود ایسا بکھرا کہ پھر کبھی نہ جڑا۔ سلاطین لودھی کے اور کسی وارث کو ہمت نہ ہوئی کہ افغانی پہاڑوں سے آنے والے فاتح کے خلاف میدان میں نکلے۔ لوگ اس مقام جنگ تک سے بچ کر نکلتے تھے۔ رات کے وقت رہ گیاروں کا بیان تھا کہ اندھیرے میں روحوں کی انہوں نے نالہ و زاری سنی۔

بابر ایسے توہمات کو کیا گردانتا تھا۔ صدر مقامات پر اس کا فوری قبضہ کرا لینا، کہ جنگ کی خبریں بھی لوگوں کو نہ پہنچتی تھیں، شاہی محلات، خزانہ وغیرہ پر ایک دم پہرے بٹھا دینا، عام باشندوں کو مرعوب کر دینے کے لئے کافی تھا۔ لڑائی میں اس کی فوج کے نقصانات اتنے کم ہوئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لہذا علاقے میں پھیل کر وہ پوری طرح مسلط ہو گئے۔ انہیں غارت گری یا دشمن کے اہل و عیال کو ستانے سے روک دیا گیا تھا اور اس طرز عمل نے عوام پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اسی طرح بڑے (کوہ نور) ہیرے کا قصہ لوگوں میں زبان زد ہو گیا۔ وہ یہ کہ ہمایوں اپنا دستہ لے کر آگرے پہنچا تو شہر کے حکام نے باضابطہ اطاعت قبول کی البتہ درخواست کی کہ قلعے کے ان مقامات میں داخل نہ ہو جہاں بادشاہ کے ذاتی اسباب کے کارخانے اور یرغمال میں آئے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ ہمایوں کو بھی شہر میں جبر و قوت سے کام لینا پسند نہ تھا لہذا اپنے سپاہی قلعے کے باہر رہنے دیئے اور دروازوں پر باپ کے آنے تک پہرہ لگا دیا۔ یرغمال کے لوگوں میں گوالیار کے راجہ کے بیوی بچے بھی تھے۔ یہ دولت مند راجہ پانی پت میں مارا گیا اور اس کے اہل و عیال نے قلعے سے نکل کر اپنے وطن جانے کی کوشش کی، ہمایوں کے پہرہ داروں نے انہیں حراست میں لے لیا مگر مال و اسباب پر دست درازی نہیں کی۔ عالی خاندان ہندو عورتوں نے غالباً شہزادے کو خوش کرنے کی غرض سے حسب دستور نذرانے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ بہت سے بیش قیمت جواہرات نذر کئے۔ انہی میں کوہ نور ہیرا تھا۔ یہ گلابی رنگ کا بھاری ہیرا ہمایوں کے ۳۲۰ رتی (۸ مثقال) تلا (بہت سے گرم و سرد دیکھنے اور تراش خراش کے بعد جب یہ ہیرا ملکہ وکٹوریہ کے قبضے میں آیا تو اس وقت بھی ۱۸۶ قیراط اس کا وزن تھا)۔ بابر قلعے کے باہر آگرے کی لشکر گاہ میں آیا تو ہمایوں نے باضابطہ پیشوائی کی اور وہ ہیرا بھی جسے صاف کرا لیا تھا، پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کی سرگذشت سنی، عملی آدمی کی طرح شوق سے اسے آنکا۔ لکھتا ہے کہ اس کلاں الماس کی قیمت اکثر جوہر شناس ساری دنیا کی ڈھائی دن کی خوراک کے برابر بتاتے ہیں۔ وزن میں آٹھ مثقال معلوم ہوا۔ ہمایوں نے مجھے گزارنا تھا۔ میں نے

وہیں اسی کو دے دیا۔“ بابر نے قیدیوں اور یرغالیوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ قریب قریب سب کو نہ صرف معاف کیا بلکہ وطن میں یا اور کہیں زمینداری دے کر رخصت کیا۔ ”ابراہیم کی ماں کو سات لاکھ مانگڑاری کا پرگنہ عطا کیا اور آگرے سے دو میل پر مکان دیا کہ قلعہ سے نکل کر وہ اپنے نوکروں سمیت وہاں جا رہے۔

جمعرات کے دن عصر کے وقت میں آگرے میں داخل اور ابراہیم کے محل میں اترا۔“ قریب دو ہفتے اس نے اپنے آپ کو خلوت ہی میں رکھا۔ دہلی کی مسجد جامع میں دو سرر آوردہ علماء نے جمعے کے خطبے میں اس کا نام پڑھا اور ہمایوں نئی حکومت کے سپہ سالار کی حیثیت سے نمایاں رہا جب کہ باپ گھوڑوں کو سستانے یا جمنہ میں کشتی رانی کرنے ہی میں مصروف رہا۔ جس وقت بیٹے نے دنیا کا کلاں ترین ہیرا جس کی قیمت بے حساب تھی، نذر گزارا تو اسے بھی کمال استغنا سے اسی کو دے دیا۔ یہ محض مفراط سخاوت نہ تھی بلکہ دراصل وہ اپنے موجی بیٹے کی اپنے ساتھ دلی وابستگی کا طالب تھا۔ پانی پت کے بڑے میدان کارزار میں ہمایوں خوب لڑا۔ بابر اہل عسکر کی نظر میں اس کی توقیر بڑھانی چاہتا تھا۔

بابر کے ان سوانح حیات سے اب اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے طرز فکر و عمل کا پتا چلانا سہل نہ تھا۔ اس میں عام آرا اور قرائن کے خلاف چلنے کی ایک عجیب ذہانت پائی جاتی ہے۔ بالفعل وہ خاص طور پر اپنی سپاہ کو اس کی کارگزاری کا صلہ دینے پر متوجہ تھا۔ وہ اسے بڑے خطرناک حملے کے لئے اتنی دور لایا اور کھلے میدان میں کہیں زیادہ سوار فوج سے اسے لڑایا جو اصول حرب کے اعتبار سے مسلک اتمام تھا۔ ان جاں بازیوں کا انعام دیا جانا ضروری تھا چنانچہ سلطان ابراہیم کے محل میں قیام کے بعد ہی مقفل خزانوں کا بڑا حصہ فوج والوں کو دے دیا گیا۔ یہ مغل جاگیرداری ہندوستان کی روایات کی مخالفت تھی۔ کیونکہ یہاں رانا، راجا، بادشاہ بلکہ معمولی جاگیردار تک روپے پیسے کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ بابر نے ستر لاکھ (جو غالباً تین لاکھ ڈالر امریکی کے معادل مگر قوت خرید میں بڑھے ہوئے تھے) شہزادہ ہمایوں کو دیئے اور اس کی جمعیت نے جو کچھ لوٹا تھا، وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں کو دس لاکھ (چاندی کے سکے) فی کس دیئے اور بے حساب ساز و سامان، ہتھیار، گھوڑے عطا کئے۔ ہر امیر و رئیس کو ٹھیک ٹھیک تناسب سے انعام ملا۔ بندوچی، شمشیر زن، سائیس، باورچی، گاڑی بان، بمیر و بنگاہ کے مزدور خیمہ نصب کرنے والے تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی مٹھیاں غیر متوقع سکوں سے نہ بھر گئی ہوں۔ بابر

کی بخشش کا رنگ یہی تھا۔ دلی خزانچی پر جو کچھ گزری ہو اس کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ پھر یہ تقسیم زر، اراضی اور مواشی کی تقسیم کے علاوہ تھی جس نے سردار و سپاہی سب کو خوش حال کر دیا۔ اسی داد و دہش کی بنا پر دہلی سے یہ افواہ ملک بھر میں منتشر ہوئی کہ نئے بادشاہ نے سارا خزانہ جو ہاتھ آیا تھا، لٹا دیا اور اپنے لئے قلندری حصے کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ اسی افواہ نے مغلوں کی بنائی ہوئی پہلی مساجد میں سے ایک مسجد کے کتبے میں جگہ پائی جس میں یہ الفاظ کندہ تھے کہ ”قلندر بابر دنیا بھر میں بادشاہ مشہور ہے۔“

خود بابر نے ایک شعر میں اس خیال کو ادا کیا ہے کہ ”ہرچند میں درویش بادی میں شامل نہیں۔ لباس شاہی میں بھی میرا دل ان کے ساتھ ہے۔“ اس کی بے نظیر فیاضی کا وہ اثر ہوا جس کی خود اسے امید نہ تھی۔

پہرہ دار (عس) کی ایک اشرافی

شہزادی گلبدن بیگم نے اس جشن مسرت کی کیفیت لکھی ہے، جو کابل میں فتح کی مفصل خبریں اور تحائف و ہدایا کے آنے پر منایا گیا۔ یہ خدمت کسی معمولی آدمی کے نہیں، بڑے وزیر خواجہ کلاں کے سپرد ہوئی تھی (اگرچہ یہ واقعات گلبدن بیگم نے بڑی عمر میں، اکبر بادشاہ کے عہد میں قلم بند کئے، لیکن اسے بچپن میں اس جشن کی تقریبات اور محل سرا کی باتیں یاد ہوں گی)۔

”پانچ بادشاہوں کی جمع جتھا اس (بابر) کے ہاتھ آئی تھی، سب اس نے ہانٹ دی۔ ہندوستان کے امیروں کو اتنی کثیر دولت لٹا دینا بہت شاق گزرا خواجہ کلاں نے کہا، حضرت پادشاہ نے میرے ہاتھ یہ تحائف اپنی خالاؤں، بہنوں اور حرم کی جملہ مستورات کے لئے ارسال فرمائے ہیں۔ خود فہرست بنا کر دی ہے اور ہدایت کی ہے کہ دربار کے باغ میں ہر بیگم کا شامیانہ اور قاتیں لگا کے نام بہ نام تھے تقسیم کئے جائیں اور پھر سب مل کر اس فتح بزرگ پر خدا کا شکرانہ بجالائیں.....“

ہر بیگم کو ابراہیم کی ناچ گانا جاننے والی کینیوں میں سے ایک کنیز، یاقوت و جواہر اور موتیوں کی بھری ہوئی کشتی، سکوں اور صدف سے بھرے ہوئے دو خوان، نو پارچے کے قیمتی نلعت دیئے جائیں گے۔ بہنوں اور بچوں کو، دوسرے عزیز و اقارب بھائی اور ان کی بیویوں کو، دادا، مغلانیوں کو ---- سب کو جو اس شکرانے کی تقریب میں شامل ہوں، زر نقد اور

نلت الگ دیئے جائیں گے۔

”چنانچہ ہم سب حضوری باغ میں خوشی خوشی تین دن رہے۔ فرست کے مطابق تحفہ تقسیم ہوئے۔ ہر کوئی نازاں تھا اور شکر کے سجدے کر کے حضرت پادشاہ کے عمرو اقبال کی دعائیں مانگتا تھا۔ چوکیدار (مس) کے واسطے بھی پادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ ایک بڑی اشرفی بھیجی تھی۔ (غالباً یہ چوکیدار بابر کے باپ عمر شیخ میرزا کے محل کا آدمی تھا اور اس کا خاص خیال کیا جاتا تھا) اس کا وزن تین سیر شاہی تھا لیکن خواجہ سے پادشاہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر عس پوچھے میرے لئے کیا تحفہ بھیجا ہے تو کہہ دینا بس ایک اشرفی۔ جیسے وہ معمولی اشرفی ہو۔ چنانچہ خواجہ کلاں نے ایسا ہی کہہ دیا۔ عس بہت بگڑا اور تین دن تک بکنا جھکتا پھرا۔ پھر بادشاہ کے حکم سے اس اشرفی میں چھید کر کے ڈوری باندھی اور عس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گلے میں لٹکائی گئی اور محل سرا میں پھرایا گیا۔ اب جو اس نے ٹٹولا اور اتنا وزن دیکھا تو خوشی سے بے حال ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا دیکھو کوئی میری اشرفی کو ہاتھ نہ لگائے۔ بیگمات نے الگ اسے چاندی سونے کے سکے دیئے اور یہ بھی ستر اسی ہو گئے تھے۔“

بابر کی فیاضی اپنے خاندان یا کابل تک محدود نہ تھی۔ قندز و غزنین تک تحائف کے انبار گئے اور دو دوست بدخشاں کے کاشکاروں اور ان کے بیوی بچوں نے چاندی کے سکے پائے۔ سمرقند میں یہاں کے مہاجرین کو حصہ گیا اور حج کرنے والے اس کے تحائف مکہ معظمہ لے کر گئے۔ ساتھ ہی اعلان ہوا کہ ”امیر تیمور یا چنگیز خاں کی نسل کے ہر شخص کو دعوت ہے کہ ہمارے دربار میں آئے اور حسب ہمت و خدمت فائدہ اٹھائے“۔ یہ الفاظ دیگر سالہا سال کی آوارہ گردی کے بعد شیر کو لائق سکونت سرزمین مل گئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی نسل و نژاد کے جتنے افراد سلامت ہوں۔ انہیں بلا کر پوری قوم کا مرکز بنائے۔ یہ رائے کسی وقتی ترنگ میں آکر نہیں قائم کی گئی تھی۔ بلکہ جب سے ہندوستان میں آیا یہاں کی سرزمین، پانی، سبزیاں، چرند پرند ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتا رہا اور سفر یا لشکر گاہ میں برابر اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ لوگ جو کچھ آکر کہتے وہ عموماً اسے خود دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاتھیوں کی خوراک کو غور سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ ایک ہاتھی کئی ہوئی پولیاں دس اونٹوں کے برابر کھا لیتا ہے۔ مگر بہتے دریا کو اس طرح پار بھی کر سکتا ہے کہ اوپر کی لدی چیز کو پانی ذرا نہ چھوئے۔ تین چار مل کراتی بڑی توپ کے چھکڑے کو کھینچ سکتے ہیں جسے چڑھانے میں چار سو آدمی درکار ہوں۔ ہاتھی سدھانے کے طریقے دیکھے اور رائے قائم کی کہ ”بہت

عقل مند جانور ہے۔ مہادت کی بات سمجھتا ہے اور اس کا حکم مانتا ہے۔“

چرس رسے سے پانی کھینچنے کا ہندوؤں کا طریقہ بابر کو پسند نہیں آیا کہ تیل کی واپسی میں رسا کچڑ، پانی، گوبر میں گھستا آتا ہے اور وہی چرس کے ساتھ کونیں میں ڈالا جاتا ہے۔ نیل گاؤ سمیت پانچ قسم کے ہرنوں کی کیفیت لکھی ہے۔ موش نما جانور یعنی گلہری کو پھرتی سے درختوں پر چڑھتے اترتے دیکھ کر اسے بہت لطف آیا۔ دوسری ولایات کے اکثر جانوروں سے واقف تھا، لہذا لوگوں کے جھوٹے سچے قصے سن کر یقین نہ کرتا تھا۔ مثلاً گینڈے کی طاقت کی روایتیں۔ اس مہیب صورت یک شاخہ جانور کو یورپ کے سیاحوں نے شروع میں دیکھا تو بہت ڈرے اور طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ بابر نے انہیں تو باور نہیں کیا، البتہ تسلیم کرتا ہے کہ گینڈا گھوڑے کو سوار سمیت اپنے سینگ پر اٹھا کر اچھال سکتا ہے جس کا خود تماشا دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ سوار جو اس طرح اچھالا گیا ”کرگدن زدہ“ کہلانے لگا تھا۔ ہندوستان کے طرح طرح کے طوطے دیکھے اور ان میں چمکتے رنگوں، سیاہ گردن اور چونچ والے کو بہت پسند کیا جو ایسی باتیں کرتا ہے کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا وہ صرف آوازوں کی نقل کرنی سیکھ جاتا ہے یا سمجھ کر بھی بات کر سکتا ہے؟ ایک ملازم نے کہا کہ سیاہ چونچ کا طوطا پنجرے میں تھا، اس پر ہنستی چڑھائی گئی تو وہ پکارنے لگا ”میرا چہرہ کھولو، مجھے سانس لینے دو۔“ بابر لکھتا ہے ”راست و دروغ برگردن راوی مگر جب جب تک خود نہ دیکھے ایسی بات کا یقین کرنا مشکل ہے۔“

بہت سے گانے والے نیز مردار خوار پرندے دیکھے۔ مور کا گوشت امتحاناً کھایا۔ بہت سی مچھلیاں کھائیں ایک دفعہ مچھیروں کو دیکھا کہ جال کو پانی سے کوئی ایک ہاتھ اونچا لئے کھڑے ہیں، مچھلیاں اڑاڑ کر بھنس جاتی ہیں صرف ایک مچھلی تھی جو گز بھر اوپر سے اچھل کر صاف پار کر گئی۔ ہندوستان کے پھل کچھ بہت مزے دار نہ نکلے سب میں بہتر آم تھا جس کی خربوزے کی طرح تعریف کی جاتی تھی۔ بابر کے نزدیک یہ پال کے ہی اچھے ہوتے تھے لکھتا ہے ”عمدہ قسم کا آم واقعی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن ایسی اچھی قسمیں ہر جگہ بہت کم پائی گئیں۔“

اول اول وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ہندو اپنی جاتی یا طبقے کے نام سے منسوب ہوتے ہیں اور قبائل یا خاندان سے موسوم نہیں ہوتے۔ لکھتا ہے ”ہندوستان کے اکثر باشندے بت پرست ہیں۔ بت پرست کو ”ہندو“ کہا جاتا ہے۔ بہت سے ہندو تنازع کا عقیدہ رکھتے

ہیں۔ کاریگر، مزدور، سرکاری کارندے سب ہندو ہیں۔ ہمارے ملک میں صحرائی لوگ قبائلی نام رکھتے ہیں۔ مگر یہاں شہروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے بھی الگ الگ قومیں بن گئی ہیں۔“

اگرے میں داخل ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے جب بابر نے ہندوستان میں توطن اختیار کرنے کا اعلان کیا اور اسے سن کر اہل عسکر میں بڑی ناگواری پھیلی۔ اور تو اور سب سے ممتاز مشیر خواجہ کلاں جیسا اسے چھوڑ بھاگا۔ بابر لکھتا ہے ”سب سے بڑھ کر ہندوستان چھوڑنے پر خواجہ کلاں تلا ہوا تھا۔“ آخر اسے تحفے اور سوغاتیں بانٹنے اور کابل کا انتظام کرنے کے نام سے بھیج دیا گیا۔“ پھر بھی لوگوں میں بددلی دیکھی تو“ (باضافہ مترجم) انہیں سمجھا بجا کر رضامند کیا۔ ہندوستان میں دارالسلطنت دہلی کا قطب مینار نیچی چھت کے والانوں کے درمیان فلک نما عمارت تھی۔ سارے میدان میں مقبروں کے گنبد جن کے گوشوں پر نازک ستونوں کی برجیاں بنی ہوئی تھیں، غوری اور (بہ تصحیح مترجم) بعد کے ترک سلاطین کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔ سلطان محمود اعظم کی طرح یہ بادشاہ بھی اعلیٰ درجے کے بنا گزرے ہیں اگرچہ بابر کی رائے میں انہوں نے ہندو کاریگروں سے جلدی میں تعمیر کرائی اور کاریگروں کا بھونڈا پن جھلکتا ہے۔ شان و شوکت دکھانے کا شوق بھی زوال کے عناصر سے خالی نہیں۔۔۔۔ بڑی بڑی آبادیاں اکثر ایک برس میں، پانی کے لئے صرف ایک ندی کے سارے بس کئیں اور کسی وبا یا خوف و خطر کے باعث لوگ انہیں پتے میدان کی گرمی اور موسلا دھار بارشوں کے حوالے کر کے ویران چھوڑ گئے۔ کسی انفرادی کی ساعت میں بابر لکھتا ہے کہ ”ہندوستان میں لطف کی چیزیں کم ہیں۔ لوگوں کی صورتیں اچھی نہیں، نہ منسار ہیں نہ آپس میں میل جول کے طریقوں سے آگاہ ہیں۔ مزاج شناسی، ذہن و ذکا سے عاری، آداب مجلسی سے ناواقف ہیں۔ دستکاری میں جدت نہیں نہ سوچ بچار سے کام کرتے ہیں۔ عمارت میں نقشے اور حیات کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ملک میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھے کتے نہیں۔ انگور، خربوزے بلکہ اعلیٰ درجے کے پھلوں میں کوئی پھل بھی اچھا نہیں ہوتا۔ ٹھنڈا پانی برف اور بازاروں میں اچھی قسم کا گوشت یا روٹی نہیں ملتی۔ حمام، مدارس، حتیٰ کہ شمع اور شمع دان نہیں ہوتے موم بتی کی بجائے میلا چیکٹ چراغ دان (ڈیوٹ) ہوتا ہے اس میں ایک ہاتھ سے بتی اکساتے اور دوسرے سے تونبی میں سے تیل ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ کام جن لوگوں کے سپرد ہے، آپ روشنی منگائیں تو وہی دوڑے ہوئے

آئیں گے اور ڈیوٹ جلا کر آس پاس کھڑے ہو جائیں گے۔ ملک میں دریا موجود ہیں مگر نہریں نہیں کٹی گئیں۔ نہ باغوں یا گھروں میں پانی لایا گیا۔ ان کے گھر نہ خوش قطع ہیں، نہ ہوادار۔ کوئی دل کشی نہیں رکھتے۔ کسان اور ادنیٰ طبقے کے لوگ ناف سے نیچے دو باشت کی لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں۔ عورتیں ایک ساڑھی آدھی (بہ تصحیح مترجم) کمر سے لپیٹی ہیں۔ آدھی سر پر ڈال لیتی ہیں۔“ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی خویوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔

”رہیں خوبیاں، تو یہ ایک وسیع ملک ہے۔ سونا، چاندی افراط سے ہوتے ہیں۔ مینہ برستا ہے تو ہوا بہت اچھی چلنے لگتی ہے۔ مگر برسات کی سیل تیر کمان، کتاب، کپڑا بلکہ مکانوں تک کا ناس مارتی ہے۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طرح کے کاریگر کثرت سے ہیں۔ ہر پیشے یا حرفت کی برادریاں معین ہیں، ان میں باپ دادا کے وقت سے وہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔“

بادشاہ اپنی نئی قلمرو سے اتنا بددل تھا، تو اس کی فوج اور بھی مایوس ہوئی تھی فوج کی جان وہ لوگ تھے جو سرد کو ہستانی ملک میں پلے اور اب اپنے وطن کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی یاد انہیں ستا رہی تھی۔ وطن سے نکلے ایک سال ہونے کو آیا اور زیادہ وقت جنگ و جدال ہی میں مصروف رہے۔ اب انعام بھی زر نقد اور اجناس کی صورت میں ملا تو مغل، ترک، افغان سبھی کی قدیم روایت، نیز فطری خواہش تھی کہ کوئی ناشدنی پیش آنے سے قبل اپنی ان غنیمتوں کو حفاظت سے گھر لے جائیں۔ سندھ پار ہندوستان پر پہلی تاختوں کا مقررہ ضابطہ یہی رہا تھا، فوج والوں کے نزدیک اس میں رد و بدل کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

بابر لکھتا ہے کہ ”ہم اگرے آئے تو گرمی کا موسم تھا۔ دہرات کے لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔ ہمیں غلہ اور گھوڑوں کو چارہ نہ ملتا تھا۔ دہاتیوں نے رہنئی اور چوری کا طریقہ ہماری دشمنی سے اختیار کیا۔ آمدورفت بند ہو گئی مجھے انعام و اکرام بانٹنے میں بہت دن فرصت نہیں ملی کہ اضلاع اور تھانوں کے لئے معقول جمعیت مقرر کرتا۔ دوسرے اس سال گرمی کی بڑی شدت ہوئی۔ ہمارے آدمی لوگ کے بیمار ہونے اور مرنے لگے جیسے بادِ سموم سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہ سے اکثر آزمودہ کار سردار اور بیک ہندوستان میں رہنے سے بددل بلکہ واپس جانے کے لئے پوری طرح تیار ہو گئے۔ پرانے اور سند رسیدہ بیگوں کی ایسی شکایت راسخی

سے کرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ بندہ (بابر) ان کے دلی خیالات اور (دوسروں کے) نافرمانی کے طرز عمل میں فرق کر سکتا تھا۔ مگر اس بندے نے پورے مسئلے کو دیکھا، سمجھا اور پھر رائے قائم کی تھی۔ اہل لشکر اور ان میں بھی ادنیٰ۔۔۔۔۔ ادنیٰ نفروں سے بے سوچے سمجھے رائے زنی کرنا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ پھر طرفہ تر یہ کہ ان میں بعض وہ لوگ تھے جنہیں معمولی درجے سے ترقی دے کر ہندوستان ہی میں امارت اور بیگی ملی ہے۔ یہ اعزاز میں نے اس لئے تو انہیں نہیں دیا تھا کہ میرے ارادے کے خلاف تقریر کریں۔“

جب لوگوں میں بد دلی کی خبر سنی تو میں نے سب سرداروں کو شورئی میں بلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ دنیا میں کوئی اقتدار و سیادت بغیر ضروری وسائل کے قائم نہیں رہ سکتے نہ کسی بادشاہ کی حکومت ملک و رعایا کے بغیر ہوا کرتی ہے۔ کئی سال کی محنت مشقت، طولانی سفر کی صعوبتیں، مرنے مارے جانے کے خطرات یہ سب برداشت کر کے ہم نے خدا کی رحمت سے دشمن کے انہوہ عظیم کو زیر کیا اور اس کی وسیع ولایات حاصل کیں۔ اب وہ کونسی طاقت ہمیں مجبور کرتی ہے اور کونسی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ اتنے جوکھوں سے لیا ہوا ملک چھوڑ دیں اور تنگ دستی کی بلا میں واپس کابل چلے جائیں؟ کوئی شخص جو مجھے عزیز رکھتا ہے آئندہ اس کے منہ سے میں ایسی باتیں نہ سنوں۔ لیکن جسے ٹھہرنے کی تاب نہیں وہ شوق سے واپس چلا جائے۔

”ان کلمات سے میں نے ان کے پرآگندہ خیالات دوبارہ درست کئے اور خوش ہوئے ہوں یا ناخوش دلوں سے اندیشے دور کئے۔“

بایں ہمہ نائب اول خواجہ کلاں اپنے خیال پر جما رہا۔ وہ کہتا تھا کہ میری صحت گرتی جاتی ہے۔ چنانچہ نہایت ناخواستہ دل سے باہر نے آخر اسے کابل واپس جانے کی اجازت دی مگر جب سنا کہ خواجہ (بہ تصحیح مترجم) دہلی سے چلتے وقت دیوار پر یہ شعر گھسیٹ گیا ہے کہ

اگر بخیر سلامت گرز ز سندھ شود
سیاہ روئے شوم گر ہوئے ہند شود

تو بہت جھلایا۔ ساتھ چھوڑ کر جانے کی کدورت کم نہ تھی کہ یہ شعر اس پر مستزاد ہوا۔ جواب میں ایک شعر مکمل خواجہ کو کابل بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ ”بابر خدا کا شکر

کر کہ ہندو سندھ کی بادشاہی اس نے عطا کی۔ خواجہ تیری ہمت گرمی کی تاب نہیں لاتی تو جا' غزنیں کے جاڑے کھا۔" مگر یہ کدورت جلد ہی رفع ہو گئی۔ دو سال بعد خواجہ کو ہندوستان کے حالات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ "مجھ جیسا آدمی زمین کاہل کے مزے کس طرح دل سے بھلا سکتا ہے؟ وہاں کے لطیف انگور اور خربوزے کیونکر یاد نہ آئیں گے۔ چند روز ہوتے ہیں لوگ خربوزے لائے اسے میں نے تراشا تو معا" وطن کی بےقراری اور غریب الوطنی کا رنج تازہ ہو گیا اور میں آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔"

اسی حب وطن کی بدولت رود کاہل کا قلعہ، بعید برف پوش پہاڑوں کے زیر سایہ مرغزار، کچنال کے سرخ سرخ پھولوں کا کھلنا خاص طور پر یاد آتا اور دل کو بے چین کر دیتا تھا۔ اکثر سرکاری خطوں میں قلعے اور نیشنل پارک کی جامع مسجد کی مرمت کی ہدایتیں لکھی ہیں۔۔۔۔۔ کسی پیش والاں کی نگہداشت، کبھی باغوں کی درستی، خوش بودار پھولوں کے درخت اور پودے لگانے کی تاکید کی ہے۔ ادھر ہندوستان میں بھی اپنے تیز گشت و سفر کرنے میں بار بار سایہ دار باغ نصب کرنے، آب پاشی کے وسائل مہیا کرنے کے احکام دیتا رہتا تھا۔ بڑے دریاؤں کے پیٹے میں اس قدر کثیر پانی کی مقدار کا ضائع ہوتا، جو کبھی کبھی خشک میدانوں میں پھوٹ پڑتا یا سخت بارشوں کے بعد گدھے پانی کی طغیانی بن جاتا، باہر کو برابر اس کا قلق رہا۔ لکھتا ہے کہ :

"میرا جہاں ذرا زیادہ قیام ہوا، میں نے رہٹ لگا کے ٹالیاں بنوانے کا انتظام کیا اور ان کے کنارے تفریح گاہیں تیار کرائیں۔ اگرے آنے کے تھوڑے دن بعد جہاں کے پار جا کے باغ کے لئے مناسب زمین دیکھی مگر ساری نواح بد نما تھی کہ بیزار ہو کر واپس آ گیا اور دریا کے کناروں کی زشت ہیات کے باعث یہاں "چارباغ" بنانے کا خیال چھوڑ دیا۔ پھر بھی چونکہ اگرے کے پاس اور کوئی جگہ ایسی بھی موجود نہ تھی، ہار کر اسی مقام سے کام لینا پڑا۔ پہلے اس قطعے پر کام شروع ہوا جہاں ہشت پہلو حوض کے قریب اہلی کے درخت تھے۔ بڑا سا کنواں بنا کے زمین میں گلا یا گیا کہ اس سے حماموں میں پانی لے سکیں۔ پھر حوض کو گھیر کر قریب ہی بارہ دری بنوائی جس کے محاذ میں سرخ و سفید پتھر کی حویلی کے اندرونی کمروں کے باہر گلاب اور نرگس کے پھولوں کی قطاریں لگا کر چمن بندی کی گئی۔ حمام کے جبروں میں سفید اور فرش میں سرخ پتھر بیانہ کا لگایا گیا۔ اس طرح ہندوؤں کے دستور کے مطابق ہم نے بھی بغیر اہتمام کے باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ لیکن ان میں ایک وضع داری

پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کی تین چیزیں ہمیں بہت پریشان کرتی ہیں۔ ”گرمی، آندھی، گرد۔“
 نئے حماموں نے تینوں آفتوں سے نجات دلا دی۔ خلیفہ وغیرہ کئی اور سرداروں نے بھی لب
 دریا قطعات ڈھونڈ کر باغ اور حوض بنوائے اور لاہور کی وضع کے رہٹ پانی کھینچنے کے لئے
 لگائے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اس قطع کے باقاعدہ باغ اور عمارتیں نہ دیکھی تھیں،
 انہوں نے جہنا کے اس کنارے کو جہاں یہ باغ وغیرہ بنے، ”کابل“ کے نام سے موسوم کر
 دیا۔“

سردار اعلیٰ کے عزم مصمم میں ضرور ایسی تاثیر تھی کہ اس کے ساتھیوں نے نئی
 سرزمین میں جس سے متفرق تھے، اپنے وطن کی معروف چیزوں کی نقل یہاں تیار کرائی۔ اس
 طرح بابر نے باوجودیکہ بار بار کی بیماری اور مسکرات کے زہر سے کمزور ہوتا جاتا تھا اور
 سب سے بڑا وزیر و ندیم (خواجہ کلاں) اسے چھوڑ گیا تھا، نیز اہل عسکر نہایت بدل ہو رہے
 تھے، اپنے آپ کو اور تمام ساتھیوں کو ہندوستان کے میدانی ملک میں سنبھالے رکھا تا آنکہ
 مینے، دوسرا سال بن گئے۔ اس کے اپنے سرداروں سے یہ کہنا کہ کوئی طاقت ہندوستان
 چھوڑنے پر ہمیں مجبور نہیں کرتی، دانستہ بے انصافی کی بات تھی۔ اپنے اہل و عیال اور
 مانوس طریق زندگی سے دوری واضح طاقت تھی جو انہیں اپنے مغربی پہاڑوں کی طرف کھینچتی
 تھی۔ ان کی بدوی جبلت ابھی تک قوی تھی۔ صرف بابر کی مرضی کا خیال تھا جس نے
 انہیں روک رکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ ان میں ایسے لوگ کم تھے جو علانیہ بادشاہ سے
 بے وفائی کرتے، مگر اگلے سال خود شہزادہ ہمایوں آمادہ ہوا تھا کہ باپ کا ساتھ چھوڑ جائے۔

گوالیار کا (ہتیا پول) ہاتھی دروازہ

جملہ مصروفیتوں کے باوجود بابر تاریخ کی ورق گردانی کرنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ اس
 کتب بینی کا بھی عجیب فائدہ اس نے یہ اٹھایا کہ اپنے رفیقوں کو بڑے بڑے بادشاہوں کے
 جنہوں نے ممالک مغرب سے شمالی ہندوستان پر حملے کئے، قصے سنائے۔ اس نے بتایا کہ
 سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور خراسان و سمرقند کے علاوہ بڑی بڑی ولایات کے مالک تھے
 اور ہمارے پاس غزنیں کابل قندز کی پٹی کے سوا کچھ نہیں دھرا ہے۔ اور یہ علاقہ بھی اتنے
 محدود وسائل معاش رکھتا ہے کہ ہمیں اس کی پرورش کے لئے ہندوستان سے رسد بھیجنی
 پڑتی ہے۔ اب اگر ہندوستان سے ہم دست بردار ہو جائیں، تو خود ہمارے وطن پر کیے

گزرے گی اور اگر وہ کام کریں جو محمود اور تیمور نے نہیں کیا، یعنی ہندوستان کو اپنا گھربنا میں تو کیا کچھ کارنامے انجام نہ دے سکیں گے۔

اس نے دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا کہ اتنی کثیر تعداد کے مقابلے میں ہماری کمزور و قلیل جمعیت کو یہ کامیابیاں مشیت الہی کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ تقدیر کی ایسی کھلی نشانیاں اور خدا کا منشا دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرنا اور واپس پلٹ جانا کس طرح جائز ہو گا؟ اور یہ غالی حجت نہ تھی۔ واقعی بابر اس کی صداقت پر یقین رکھتا تھا۔ سلاطین دہلی کے پر شکوہ مقبروں کو سیر کرتے وقت یقیناً وہ مرعوب ہوا ہو گا اور اسے اخی کے باغ میں اپنے باپ عمر شیخ میرزا کی قبر کا پرانا ڈھیر یاد آیا ہو گا۔

۱۵۲۶ء کے اواخر میں مہارٹیس برسیں تو اس وقت بھی جنگی صورت حال کچھ قابلِ طمینان نہ تھی۔ دریائے سندھ سے جنوب مشرق میں پانچ سو میل فوج آگے بڑھ آئی تھی لیکن بچ پوچھے تو ملک مقبوضہ صرف اسی قدر تھا جہاں ان کی چھاؤنیاں بنی تھیں۔ یعنی ایک ٹک سا راستہ یا گلیاری جو درہ خیبر سے بھیرا، لاہور، سرہند، پانی پت، دہلی، آگرہ، بارہ ٹک اتی تھی۔ فی الواقع بابر نے اپنی فتح ”بھیرا سے بارہ (۵۶) ٹک“ ہی بتائی ہے۔ اس موسم مار کے آنے تک مغلوں کی پیش قدمی بالائی گنگا کے شر قنوج تک ہی ہوئی تھی۔ پادشاہ کے باغ و عمارات کا سلسلہ، نیز وصول مال گزاری کا حلقہ آگرے سے ایک منزل آگے نہیں گیا۔ مفتوحہ پٹی میں بد نظمی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے آگے ہندوستان کے وسیع خطوں سے راہٹ کی آوازیں آرہی یا مہال کی بگڑی ہوئی مکھیوں کی بھن بھناہٹ، جن کے چھتے کو توڑا یا گرا نہیں قابو میں نہیں لایا گیا ہو۔

بابر ان خطرات سے بے خبر نہ تھا۔ لکھتا ہے کہ ”ہمارے آگرے کے داخلے کے وقت ماں کے لوگوں میں اور میرے آدمیوں میں باہم نہایت نفرت اور عداوت تھی۔ کسان اور باہی میرے آدمیوں کو دیکھ کر ہی دور بھاگتے تھے۔ دہلی اور آگرے کے سوا باقی قلعہ بند روں نے اپنے مورچے مضبوط کئے اور انہیں حوالہ نہیں کیا نہ اطاعت قبول کی۔ قاسم نبھلی نے سنبھل اور نظام خاں نے بیانہ میں یہی طریق عمل اختیار کیا۔ میوات میں (بہ تصحیح ترجم) حسن خاں ”نپاک مروک فتنہ و فساد کا سرغنہ تھا“ تاتار خاں، گوالیار میں، حسین ں رابری میں، قطب خان اثاوی میں، عالم خاں کالپی میں ڈٹے ہوئے تھے۔ قنوج اور دریا کے دوسری طرف سارے علاقے پر افغان مخالفوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ نصیر خاں،

معروف اور بہت سے دوسرے امیر وہ تھے جو سلطان ابراہیم کی زندگی ہی میں باغی ہو گئے تھے اور جس وقت میں نے اسے شکست دی تو یہ قنوج اور اس کے آگے کے علاقے پر قابض تھے۔

مشرق میں کنار گنگا کے ان طاقتور باغیوں کے اور مغرب میں راج پوت راجاؤں کے خطرناک جھٹے کے درمیان بابر قریب قریب بیچ میں تھا۔ جنوبی ہند کے وسط میں وجیا نگر کی سلطنت کی اس نے صرف سن گن پالی تھی۔

مذکورہ بالا حالات قدرتی ہی تھے کیونکہ مسلمان سلاطین عظام نے اکثر ”ابر آلود“ پہاڑوں سے پورشیں کیں اور واپس چلے گئے۔ تیمور نے دہلی کو تاراج کرنے کے بعد سمرقند کی راہ لی۔ خود بابر چار دفعہ دریائے سندھ کے پار آیا اور واپس ہو گیا۔ غرض ہندوستان کے دور دست جاگیرداری رئیس اس موقع پر بھی اپنے اپنے قلعوں میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے تھے کہ مغل لوٹ کا مال لے کر رخصت ہو جائے گا۔ ان میں کوئی تنظیم نہ تھی لیکن سرکشی میں سب متحد تھے۔ لیکن ایک سال گزر گیا اور بادشاہ یہیں رہا تو صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ہر اقدام سے یہی بات زیادہ واضح ہوتی گئی۔ لہذا اب ان رؤسائے ہند نے زیادہ تجسس شروع کیا اور سوچ میں پڑ گئے کہ بابر سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ابراہیم لودھی کے زمانے کی خانہ جنگیوں سے پنجاب اور دوآب کے بھی اقطاع عاجز آ گئے تھے۔ بابر اگرچہ ترک تھا لیکن معلوم ہوا کہ جس طرح اپنی قوت پر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح قانون کا بھی احترام کرتا ہے۔ اہل ہند پانی پت کو ابھی نہیں بھولے تھے اور یہ بھی واقعہ تھا کہ کئی مغل آزمودہ کار سپہ سالار ان علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجے گئے جو آئندہ ان کی جاگیر میں دیئے جانے والے تھے۔ تاہم ان جنگ آزمائوں نے بھی زیادہ تر فن فریب سے کام نکالا (اور مغل ایسے داؤ کرنے میں مشہور ہیں) خونریزی کو نیت نہ آنے دی۔ اس کی مثال گوالیار ہے جہاں کے حاکم تاتار خاں کو وہاں کے علماء اور طلبہ ناپسند کرتے تھے۔ پہاڑی بلندی پر یہ قلعہ تو قریب قریب ناقابل تسخیر تھا اور بابر نے اسے لینے کے لئے مختصر سی محلوں فوج بھیجی تھی جس میں نئی بھرتی کے دیہاتی شامل تھے۔ تاہم دوسری طرف سے کافر راجپوتوں کی آمد آمد کا خطرہ ہو گیا تھا۔ بابر کے اہلیچوں نے سمجھایا کہ ایسے کافروں کی چڑھائی کے مقابلے میں ہر مسلمان بالیمان کو متحد ہو جانا چاہئے۔ قلعے کے اندر والے علما نے خفیہ تجویز کی کہ پادشاہ کے آدمیوں کو اندر آ جانا چاہئے اور چپکے

سے ہاتھی دروازے سے کھسک آنے میں مدد دی۔ اندر آتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ تاتار خاں کے بنائے کچھ نہ بنی اور آگرے جا کر پادشاہ کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ جتنا گنگا کے درمیان چند افغان لشکر قریب سے واقعات کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سب سے پہلی عسکری جماعتیں تھیں جنہوں نے بابر کی ملازمت اختیار کر لی اور ایک فوج کی فوج جسے ابراہیم لودھی نے جونپور اور اودھ کی بغاوت فرو کرنے بھیجا تھا، اس نے بھی انہی کی تقلید کی۔ بابر کی برجستہ ذہانت نے کرشمہ دکھایا کہ اس لشکر کے سرداروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا وہ اس کے قدیم الخدمت تھے اور جونپور و اودھ کی بڑی بڑی جاگیریں انہیں عطا کر دیں۔

بابر کی یہ سب تدبیریں وقت سے بازی لے جانے کے لئے تھیں اور گوالیار کے آگے راجپوتوں کے جم غفیر کے جمع ہو جانے سے اس بات کی بہت کم مہلت ملی کہ وادی گنگا کے دشمنوں کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ ادھر اس نے ہمایوں کی ماتحتی میں فوج کے دو جیش روانہ کئے تھے۔ کیونکہ بقول اس کے ہمایوں نے کہا تھا کہ بادشاہ کا آگرے میں قیام ناگزیر ہے۔ ہر چند دو آب کے معرکوں میں کامیابی کا سرا وہ اپنے بیٹے کے سر باندھتا ہے لیکن بظاہر ماتحت سپہ سالاروں کو براہ راست ہدایات بھیج کر پوری مہم پر خود نگرانی کرتا رہا۔ ادھر ان بحرانی ایام میں اسے راجپوتوں سے بھگتنے کے لئے بہت کچھ آگرے میں تیاریاں کرنی تھیں۔ اس کے ترک (رومی) استادوں نے چند نئی اور کلاں تر توپیں ڈھالنے کی بھی کوشش کی۔ لکھتا ہے ”میں نے استاد علی قلی سے ایک بڑی توپ ڈھالنے کی فرمائش کی تھی۔ جب اس نے بھٹیاں اور سامان تیار کر لیا تو آدمی بھیج کر مجھے اطلاع دی۔ پیر کے دن ہم اس کا ڈھلنا دیکھنے گئے قالب کے گرد آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں۔ ہر ایک کی نالی کا منہ اس قالب کی طرف تھا جس میں توپ ڈھلنے والی تھی۔ میرے آنے پر نالیوں کے منہ کھولے گئے اور پگھلا ہوا تانبا سیال شے کی طرح ہر نالی سے بہہ کر چلا لیکن تھوڑی دیر میں قالب کے بھرنے سے پہلے یکے بعد دیگرے سب نالیوں سے مصالحہ آنا رک گیا۔ یا تو اس (تانبے) کی مقدار میں کمی تھی یا بھٹیاں ٹھیک نہیں بنی تھیں۔ استاد علی قلی کو اس درجہ غیرت آئی کہ چاہتا تھا اس پگھلے تانبے میں خود کو گرا دے۔ میں نے اس کی دل جوئی کی بلکہ خلعت دے کر شرمندگی مثالی۔

دو دن بعد قالب ٹھنڈا ہو گیا اور اسے کھولا گیا تو استاد علی قلی بہت خوش ہوا اور فوراً مجھے اطلاع دی کہ توپ کی نال پوری بغیر خرابی کے تیار ہو گئی، البتہ باردت کا خانہ بنا کر اس

میں جوڑنا پڑے گا اور میں یہ کر سکتا ہوں۔ پھر نال کو نکال کر تراش خراش کے لئے کاریگروں کو دیا اور خود خانہ بنانے میں مصروف ہوا۔

باہر کو یہ بات یاد تھی چنانچہ کچھ روز بعد جب اس کا عقبی خانہ تیار ہو گیا تو اس کے دغنے کی آزمائش دیکھنے گیا۔ یہ (آگے چل کر) ”غازی“ توپ کھلائی۔ جب چلائی گئی تو بغیر نال پھٹے، بھاری گولہ سولہ سو گز پھینکا، جو اس زمانے میں بہت لمبا پرتاپ تھا۔ اس مرتبہ استاد کو نلعت فاخرہ، عربی گھوڑا اور تلواریں کی پیٹی (کمر انعام ملی۔

ہمایوں کی سرکشی

ترک مندس توپیں ڈھال رہے تھے، ہمایوں کی فوجیں شبشب شرق میں بڑھ رہی تھیں، خود پادشاہ آگرے میں راجپوت جتھے کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھا کہ ایک خط اس نے حرم سرائے کابل کو بھیجا جس نے وہاں کی بیویوں میں بڑی تشویش اور پریشانی پیدا کر دی۔ یہ خط اپنی ترک میں بھی پورا نقل کر دیا ہے :

”گندشتہ جمعے عجیب واقعہ پیش آیا۔ تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم لودھی کی بد نصیب ماں نے سنا کہ میں نے بعض ہندوستانی کھانے کھائے تھے۔ صورت یہ ہے کہ تین چار مہینے قبل میں نے ابراہیم کے باورچیوں کو بلایا۔ پچاس ساٹھ میں سے چار چھانٹ کر ملازمت میں رکھے کہ ہندوستانی کھانے تیار کریں گے جو اس وقت تک میں نے نہیں کھائے تھے۔ ابراہیم کی ماں نے یہ سن کر اٹاؤے سے احمد ”چاشنی گیر“ کو بلایا (ہندوستانی) (بہ نصیحت مترجم) بکاول کو بھی ”چاشنی گیر“ کہتے ہیں اور اسے کوئی تولہ بھر زہر کی پڑیا ماما کے ہاتھ بھیجی۔ احمد یہ پڑیا میرے باورچی خانے کے ایک ہندوستانی باورچی کے پاس لایا اور اسے چار پر گئے جاگیر میں دلوانے کا وعدہ کیا اگر کسی طرح وہ زہر میرے کھانے میں ملا دے۔ ابراہیم کی ماں نے ایک اور ماما بھی بھیجی کہ دیکھ کر آئے۔ پہلی ماما نے زہر احمد کو دے دیا ہے یا نہیں۔

حسن اتفاق سے باورچی نے زہر پتیلی میں نہیں ڈالا بلکہ رکابی میں چھڑکا۔ کیونکہ میرا حکم تھا کہ چاشنی گیر سالن پتیلی سے نکال کر ہندوستانی باورچی کو پکھایا کریں۔ مگر نالائق چاشنی گیروں نے رکابی میں سالن کے بعد نگرانی نہیں کی۔ چینی کی رکابی میں جو پھلکے لائے جاتے ہیں۔ باورچی نے کچھ زہر ان پر چھڑک دیا اور اوپر میں گھی میں بگھاری ہوئی بوٹیاں رکھ دیں۔ اگر بوٹیوں پر بھی چھڑک دیتا تو بہت خرابی ہوتی۔ مگر وہ گھبرا گیا اور آدھا زہر چولھے میں گیا۔ جمعے کی نماز سے فارغ ہو کر دسترخوان چنا گیا۔ میں نے خرگوش کے گوشت

کی رکابی سے کچھ کھایا۔ گاجریں پکی تھیں، وہ کھائیں پھر چند لقمے زہر والی رکابی سے لے کر کھائے پہلے تو کوئی چیز بے مزہ نہیں معلوم ہوئی، لیکن گوشت کی بوٹیاں کھائیں تو طبیعت بگڑ گئی۔ ایک دن پہلے خشک گوشت ("رقاق") پکوا کر کھایا اور وہ بے مزہ معلوم ہوا تھا، میں سمجھا کہ اسی کے باعث متلی ہو رہی ہے۔ دو تین دفعہ ابکائی آئی۔ قریب تھا کہ دسترخوان پر ہی تے ہو جائے آخر اٹھ کر آبدار خانے میں گیا۔ جاتے جاتے ابکائیاں آئیں۔ پھر وہاں تے کی۔ کھانا کھا کے مجھے پہلے کبھی تے نہیں ہوئی تھی اور زیادہ شراب پی کر بھی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ لامحالہ شبہ پیدا ہوا اور حکم دیا باورچیوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ ڈالی ہوئی غذا کتے کو کھلائی اور اسے نظر میں رکھا تو دوسری صبح اس کا پیٹ ابھر گیا اور ایسا علیل رہا کہ پھر مارتے تھے تو بھی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔ بارے دوپہر کو وہ اٹھ بیٹھا اور مرنے سے بچ گیا۔ میرے دو ایک سپاہیوں نے بھی زہر والی رکابی سے کھایا تھا۔ وہ بھی تے کرتے رہے۔ ایک کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ شکر ہے ہم سب بچ گئے۔

میں نے سلطان محمد، بخشی کو تفتیش کا حکم دیا اور جب باورچی کو سخت مار لگانے چلے تو اس نے سارا حال ایک ایک کر کے بیان کر دیا۔ پیر کو دربار کا دن تھا، میں نے سب امیروں، وزیروں اور عمائد کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سردربار وہ دو مرد اور دونوں عورتیں لائی گئیں اور ان سے جرح کی گئی۔ انہوں نے پورا واقعہ اور اس کی تفصیل سنا دی۔ چاشنی گیر (احمد) کے ٹکڑے کرا دیئے۔ باورچی کی کھال کھنچوا دی گئی۔ ایک عورت کو ہاتھی کے پاؤں سے پکڑ لیا، دوسری کو بندوق سے اڑا دیا۔ مادر ابراہیم کو حراست میں رکھوایا گیا (بعد میں یہ کابل بھیجی گئی اور اس نے دریائے سندھ میں اپنے آپ کو گرا دیا)

ہفتے کو ایک پیالہ دودھ کا میں نے پیا اور اتوار کو تریاق فاروق ملا کر پیا۔ پیر کو مسهل لیا۔ کالا کالا صفرا سا خارج ہوا۔ خدا کا شکر ہے، ہم زندہ سلامت رہے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی سب تفصیل میں نے یہ سمجھ کر کہ (کابل میں) تشویش نہ ہو، خود لکھ دی ہے۔ یہ بلا ساتھ خیر کے ٹل گئی۔ اب کسی کو خوف و پریشانی کی ضرورت نہیں (شعرتی)

”چوٹ کھائی“ بیمار ہوا“ زندہ ہوں

موت کا مزا چکھا تو زندگی کی قدر ہوئی“

یہ خط منگل کو لکھا۔ ”میں چار باغ (آگرہ) میں ہوں۔“ پھر برابر لکھتا ہے کہ ”انہی

دنوں میں بیانہ کے فوجدار ممدی خواجہ کے آدمی پے بہ پے آنے شروع ہوئے اور خبر لائے کہ رانا سانگا کا آنا یقینی طور پر معلوم ہو گیا حسن خاں میواتی بھی اس سے جا ملنے کے لئے تیار بتایا جاتا ہے۔ اب اور سب باتوں سے پہلے اس کا تدارک ہونا چاہئے۔ پوری فوج کے آنے سے پہلے ہی کچھ کمک بیانہ پہنچ جانی ضروری ہے۔“

بابر پہلے ہی ہمایوں کے سبک پا لشکروں کو مشرق سے واپس آنے کا حکم دے چکا تھا، جہاں نصیر خاں اور اس کے جوہنور و اودھ کے حلیفوں کو مغلوں نے اپنے ہندوستانی پٹھان وفاداروں کی معیت میں بری طرح کھدیڑا تھا۔ یہ آزادی کے دعویٰ دار بابر کے الفاظ میں ”باغی“ تھے۔ صبا رفتار مغل سواروں نے گنگا کو عبور کیا اور نصیر خاں کی فوجوں کو گھاگرا تک دباتے ہوئے چلے گئے۔ باپ کا حکم ملا تو ہمایوں نے چند دستے چھوڑ کر کہ غیر منظم افغانوں کی خبر رکھیں، واپس کوچ کیا اور کالپی کے راستے پھیر کھا کے آگرے آیا۔ کالپی کے رئیس کی طرف سے کچھ کھنکا تھا، اسے ہمراہ لیتا آیا۔ یہ پوری مہم جس سے بابر کا مقصد مشرقی حلیفوں کو آگرے سے دور دھکیل دینا تھا آندھی کی تیزی سے چلی اور بڑی آن بان سے تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے سمجھنا مشکل ہے۔

ہمایوں جنوری ۱۵۲۷ء میں آگرے کے زیر تکمیل چار بارغ میں باپ کے حضور میں باریاب ہوا۔ حسب معمول اعزاز و اکرام تحسین و آفرین سے جس میں بابر بیٹے کے ساتھ کبھی بخل نہ کرتا تھا، نوازا گیا۔ مگر یہاں یا شاید چند روز بعد اس نے اپنی دور دراز ولایت بدخشاں کو جانے کی اجازت مانگی۔ بابر زہر خورانی کی پوری جزئیات لکھتا ہے، بخلاف اس کے بیٹے کی اس متمدانہ درخواست کی نسبت قریب قریب سکوت کر جاتا ہے۔ ایسی اجازت کہ جس وقت ساری فوج مارا مار راجپوتوں سے لڑنے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی شہزادہ ہمایوں اپنی مضبوط بدخشاںی جمیعت کے ساتھ چلا جائے، کسی طرح نہ دی جاسکتی تھی۔

ہمایوں نے ایسے نازک موقع پر باپ کو چھوڑ دینے کا خیال بھی کس طرح کیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ممکن ہے من مہرجی شہزادے کی خواجہ کلاں سے کوئی قرارداد ہو گئی ہو۔ خواجہ چند مہینے پہلے تک اس کا اتالیق و مشیر تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اور کئی سردار بابر کو واپس کابل لے آنا چاہتے تھے۔ ہمایوں کی نسبت بزدلی کا شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اس جنگ میں اپنی ماں سے کئی دن مشورے کرنے کے بعد وہ بادل ناخواستہ شریک ہونے آیا تھا۔ پھر جنگ میں ان سن رسیدہ آزمودہ کار سرداروں کے زیر نگرانی رہنا بھی اسے

پسند نہ تھا، جو بابر کی ہر ہدایت کو قرآن و حدیث کے حکم کی طرح مانتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بدخشانی سپاہی تقریباً ۱۴ مہینے سے وطن چھوڑے ہندوستان میں مصروف جنگ رہے وہ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ اس نفرت انگیز ملک میں مزید مخدوش لڑائیاں لڑنے سے قبل جو کچھ مال متاع حاصل کیا تھا، اسے لے کر خیریت سے واپس چلے جائیں۔ مگر ممکن ہے ان میں سے کوئی سبب بھی نہ ہو۔ بجز اس مراقی شہزادے کی نا تجربہ کاری اور پریشان خیالی کے۔۔۔۔۔ بہر حال بابر نے وعدہ کیا کہ اس جنگ کے فوراً بعد ہمایوں کو بدخشاں جانے کی رخصت دے دی جائے گی۔ اسی زمانے میں غفو و کرم کی ترنگ میں آکر اس نے حسن خاں میواتی کے بیٹے کو جو یرغمال میں زیر نگرانی تھا، آزاد کر دیا بلکہ خلعت اور مراحم شاہانہ کے وعدوں سے مطمئن کر کے آگرے سے رخصت کیا۔ حسن خاں بیٹے کی طرف سے بہت پریشان تھا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مغلوں کا شریک حال رہے یا راجپوتوں کے جتنے میں جا ملے۔ بیٹے کے سلامت آتے ہی وہ راجپوتوں کی طرف چل پڑا۔

اسی کے ساتھ خبر آئی کہ وہ نیم مسلح جوق جو بیانیہ کی مقامی فوج کی مدد کے لئے گیا تھا، دشمن کے امنڈتے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور مقامی جمعیت سمیت سیدھا واپس چلا آ رہا ہے۔

”آٹھ ستاروں کا خلاف جمع ہونا“

اب تک جس قدر حریف مغلوں سے لڑے، راجپوتی جیتا ان سب سے قوی تر قسم کا تھا اور بیانے سے بھاگنے والوں نے اقرار کیا کہ وہ راجپوتوں سے خوفزدہ ہیں۔

راجستھان کے رئیس اور راج آپس میں برابر لڑتے رہتے تھے لیکن ایک بیرونی دشمن کے مقابلے میں پوری طرح متحد ہونے کی قابلیت سے عاری نہ تھے۔ مسلم پادشاہ کے خلاف انہوں نے پورا شگن کر لیا تھا۔ ان میں سات بڑے راجا اور شاید سو کے قریب چھوٹے رئیس کل اسی ہزار سواروں کا لشکر اور کئی سو جنگی ہاتھی لے کر آ گئے تھے۔ نام اور القاب کی فہرست پڑھے تو پرانی رزمیہ مثنویاں یاد آ جاتی ہیں کہ سلسلہ وار میواڑ کے جھنڈوں کے پیچھے چتوڑ، رتھنپور، چند میری کے جنگجو چلے آ رہے ہیں۔ راجپوتی بہادری کا جوش دلوں میں بھرا ہے۔ دیس کے مالک ہونے کا زعم رکھتے ہیں اور اس وقت مسلمان حملہ آوروں سے اپنی جہنم بھوی کو بچانے آئے ہیں۔ راجپوتوں کا حوصلہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ جنگ میں صرف

اس وقت قدم ہٹاتے ہیں جب کہ دست بدست مقابلے میں ان کی صفیں پارہ پارہ ہو جائیں۔ انہیں حسن خال میواتی وغیرہ اتحادیوں پر اسی قدر بھروسہ ہے کہ کامیابی میں ساتھ دیں گے اور مصیبت میں کام نہیں آئیں گے۔

راجپوتوں کا سرخیل، بابر کی طرح سپاہیوں کا محبوب ہے۔ رانا سانگا، سگرام سنگھ چتوڑی لڑکپن سے معرکے لڑتا رہا اور ایک ہاتھ، ایک ٹانگ اور ایک آنکھ انہی آویزشوں کی نذر کر چکا ہے۔ اس کے مرتے وقت کہا جاتا ہے کہ جسم پر اسی زخموں کے نشان گئے جاسکتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ ”رانا سانگا کو حکومت اپنی ہمت اور تلوار کے زور سے حاصل ہوئی تھی۔“ کسی سپاہ کی ہمت قومی اسباب اور نسلی روایات پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ پھر اس موقع کے سپہ سالار کی قابلیت پر جیسے ہنی بال نے رومہ پر فوج کشی کی تو گو اس کا لشکر بہت مختلف عناصر کا مجموعہ تھا اور مقابلے میں رومی فوجیں زیادہ متحد اور قومی شعور سے منکیت تھی تاہم اس کی ذاتی فوقیت بازی لے گئی۔ مگر ان سب امور کے علاوہ کسی جنگ سے پہلے کے واقعات اور عجیب و غریب افواہوں کا بھی جو پڑاؤ میں الاؤن کے گرد اثراتی پھرتی ہیں، اچھا خاصا اثر ہوا کرتا ہے۔ اب آگرے میں لشکر کے حوصلے تھے کہ پست ہوئے جاتے تھے۔ بابر کو بھی اس بات کی خبر تھی۔ زمانہ حال کی فوج دشمن کی اتنی زیادہ تعداد کے مقابل ہوتی تو غالباً ہمتا کے کنارے آگرے کے گرد خندقیں کھود کر مدافعتیہ جنگ کرنے کو ترجیح دیتی۔ مگر بابر اس قسم کی ذرا سی کمزوری بھی دکھاتا تو دو آب کے میدان اور قلعے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ محض تاخیر کی بدولت بیانہ ابھی نکل چکا تھا۔ پس پیش قدمی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر راجپوت جتھے سے لڑنے چل پڑا۔ ہر اگلی منزل پر کونٹیں کھدواتا، احتیاط سے قدم بڑھاتا اور دشمن کی بدلتی منزلوں اور لشکر گاہوں کی پوری طرح خبریں منگواتا تھا۔ پانی پت کی طرح اس کے متحرک مورچے ساتھ ساتھ تھے اگرچہ یہاں قوی تر سوار فوج کا سامنا درپیش تھا۔ بعض ہندو رئیس جنہوں نے حال میں اطاعت و ملازمت قبول کر لی تھی، بابر نے ان پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ انہیں عقب میں دور کے قلعوں کی (جیسے سنبھل) حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا۔

جنگ کا پہلا مقابلہ نقصان پر منتج ہوا۔ قراول کی ایک جمعیت جو دیکھ بھال کے لئے گئی تھی، بے احتیاطی سے دور تک بڑھے چلی گئی۔ دشمن چوکس تھا۔ ”مگر یہ لوگ کتواہر کے راستے پر آگے پیچھے دیکھے بغیر چلے“ اور گھوڑے دوڑا کر ہندوؤں کے چند بڑے گروہوں پر

جا پڑے۔ نتیجے میں ہر طرف سے گھیرے میں آ گئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے امدادی لشکر نے بڑھ کر انہیں وہاں سے نکالا اور بچا کر لے آیا۔ لیکن اسی اقدام نے راجپوتوں پر آئندہ رسالے کی کسی دوش کو روک دیا، جن کے لشکر اب مغل لشکر سے کوئی چھ کوس کے فاصلے کی ہستی کنواہہ کے گرد مجتمع ہو رہے تھے۔

بابر نے ایک تالاب کے کنارے توپوں کے سامنے خندق کھدوائی اور دستور سابق کے مطابق گاڑیاں (ارابے) رسیوں سے بندھوا کر دفاعی خط تیار کیا کہ لوگوں کے حوصلے مضبوط ہوں۔ بڑی توپ ”غازی“ (۵۷) ڈھالنے والے استاد علی رومی کو اپنے نائب مصطفیٰ رومی سے نٹس تھی۔ لہذا بابر نے ان عثمانی استادوں کو الگ الگ صف لشکر کے انتہائی سروں پر متعین کیا۔ کانٹے کے دونوں بازوؤں پر ہمایوں اور عالم خاں نامزد ہوئے لیکن اصل قیادت کابل کے آزمودہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ چین تیمور کو اپنے پاس قول یا قلب لشکر میں رکھا تھا۔

پادشاہ لوگوں کے دل بڑھانے کا موقع ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ سواروں کا قافلہ کابل سے آنے کی اطلاع ملی تو اس کی پیشوائی کے لئے کئی رسالے بھیجے کہ پرچم لہراتے ہوئے جائیں اور دھوم دھام سے ساتھ لائیں، تاکہ دشمنوں کو خیال ہو کہ کوئی بڑی کمک آئی ہے۔ اسی قافلے کے ساتھ اونٹوں کی قطار بھی غزنیں سے آئی اور وہاں کی شرابوں کے علاوہ ایک جہاں گرد نجومی کو بھی لائی۔ اس نے اہل لشکر کی بددلی کو دیکھ کر ویسی ہی : ی بری پیش گوئیاں کرنی شروع کیں۔

”ایسے زمانے میں جب کہ فوج میں فکر و تشویش پائی جاتی تھی اور بعض واقعات بھی نامساعد پیش آئے تھے۔ یہ کم بخت شریف نجومی آگیا اور مجھ سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر اور جس کسی سے ملتا، یہی کہتا تھا کہ۔ ”آج کل ساٹھ ستارے مغرب میں ہمارے مقابل آ گئے ہیں۔ جو کوئی مشرق سے لڑنے جائے گا شکست کھائے گا۔“ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی یہ باتیں سن کر اور بھی ہمت پست ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اس کی ہفوات پر بالکل توجہ نہ کی اور اپنی جگہ تدابیر میں کوئی تبدیلی یا فرق نہ آنے دیا۔“ بابر کو ابھی تک اپنے لڑکپن کی وہ شکست یاد تھی جو نجومی کی جھوٹی پیش گوئی کی بدولت اندجان کی ندی کے پل پر کھائی تھی۔ البتہ (بہ تصحیح مترجم) میوات پر تاخت کرنے کا منصوبہ نہ چل سکا تو اس نے اپنے نفس کے محاسبہ پر توجہ کی۔ لکھتا ہے کہ ”پیر کو میں سوار ہو کر نکلا تو اسی گشت میں خیال آیا کہ کتنے

دن سے توبہ کا ارادہ کر رہا ہوں جو پورا نہیں ہوا اور گناہوں کی سیاہی دل پر چڑھتی رہی۔ میں نے کہا ”آہ“ اے نفس کب تک گناہوں میں تو سرشار رہے گا اور زندگی برباد کرتا رہے گا۔ بس۔ توبہ کر۔“

چنانچہ پڑاؤ پر واپس آتے ہی شیر نے اعلان کیا کہ آج سے میں نے قاتل حیات شراب ترک کی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ سونے چاندی کے شاہی ساغر و سیو توڑ کر فقرا اور مساکین میں وہ سیم و زر تقسیم کر دیا جائے۔ اسی توبہ کی یادگار میں ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ سب سے پہلے بادشاہ کی تقلید شراب سے توبہ کرنے والا رات کا چوکیدار تھا جس کے بعد کئی سو امرا سردار و سپاہیوں نے شراب خوری سے توبہ کی۔ شراب کے سیوزمین میں لٹھا دیئے اور غزنیں سے جو شراب آئی تھی، اس میں نمک ڈال کر سرکا بنایا گیا۔

اس توبہ کے بعد بابر اپنی قسم پر قائم رہا۔ ایک عام فرمان بھی جاری کیا گیا پوری عمل داری میں شراب کی فروخت ممنوع کر دی گئی۔ درباری شاعر شیخ محمد زین نے یاد دلایا کہ آپ نے منت مانی تھی کہ خدا، رانا سانگا پر فتح دے گا تو مسلمان رعایا کا محصول معاف کر دوں گا۔ بابر کو بھولا وعدہ یاد آیا اور معافی کے فرمان پر بھی دستخط کئے لیکن جنگ کے بعد یہ جزئیہ پھر بھلا دیا۔

توبہ و انابت کے باوجود جس میں بابر مخلص و صادق تھا، ظاہری حالات میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ لکھتا ہے کہ ”ان دنوں کوئی شخص ہمت و حوصلہ مندی کی بات نہیں کہتا۔ جن وزیروں مشیروں سے صلاح نیک کی توقع ہے، کوئی کلمہ خیر زبان سے نہیں نکالتے۔ وہ امرا جو بڑی بڑی جاگیریں ہضم کر چکے ہیں کوئی مدد نہیں دیتے۔ بجز ایک خلیفہ کے جو برابر حق رفاقت ادا کر رہا ہے اور کسی کام میں فرو گذاشت ہونے نہیں دیتا..... ادھر فتنے ہیں کہ ہر طرف سر ابھار رہے ہیں۔ دشمنوں میں سے حسین خاں نے راپری کو جا دیا۔ قطب خاں نے چندلور پر قبضہ جمایا (لب جمنہ) خواجہ زاہد سنبھل چھوڑ کر چلا آیا۔ گوالیار کا قلعہ اس نواح کے ہندوؤں نے آگھیرا اور عالم خاں جسے کمک دینے بھیجا تھا، ٹل کر اپنی جاگیر کو چل دیا۔ ایک مردک رستم خاں نے جمنہ پار کے ترکش بندوں کو جمع کر کے کول کو لے لیا۔ بہت سے ہندوستانی عمائد بھاگ گئے۔ بارے کا حسن خاں ہندوؤں سے جا ملا۔ میں نے ان میں سے کسی شخص کی جانب اعتنا نہ کی بلکہ اپنے (جنگی) کام میں مصروف رہا۔“

ہرچند بابر واضح الفاظ میں نہیں لکھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متعدد قلعوں کا ہاتھ سے نکل جانا کچھ کم فکر کی بات نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی آگرہ کنواہ کے راستے ہی میں ہے اور دشمن کے (بے ضابطہ) حلف خود آگرے کے آس پاس آگے ہیں اور جیب کترنے میں مصروف ہیں۔ ان کی کامیابی مزید بے وفائی اور فراری کا باعث ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر بیرونی مسلم اور دہلی ہندو کے اس مقابلے میں قوت کا پلڑا آگرے کی بجائے کنواہ کے پڑاؤ کی طرف جھکا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے والے یہی رائے لگا رہے ہیں کہ بابر کو شکست کا سامنا ہے اور وہ کوئی تدارک نہیں کر رہا، بخلاف اس کے رانا سانگا نے فتح کے بہت کافی اسباب جمع کر لئے ہیں۔

بابر نے اپنے امراء اور سرداروں کو جمع کر کے دو ٹوک تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اہل لشکر کو ترغیب و تحریک دینے کا یہ واقعہ سب سے بہتر ایک عورت (گلبند) کے قلم سے بیان ہوا ہے:-

”اب جو دشمن اتنے قریب آگیا تو اس کے قلب ہمایوں کو یہ (اجتماع کی) تدبیر سوچھی۔ امرا اور خوانین سلاطین، چھوٹے بڑے، امیر غریب سبھی اس کی تقریر سننے کے لئے آگئے۔ تب اس نے کہا ”کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہمارے اور ہمارے دلیں اور وطن کے درمیان کئی مہینے کا سفر کا فاصلہ حائل ہے۔ اگر ہمیں خدا ناخواستہ، یہاں شکست ہوئی تو ہمارا ٹھکانا کہاں رہے گا؟ ہمارا مادری وطن کہاں، ہمارا شہر کہاں ہے۔ ہم اس وقت اغیار و اجانب کے بیچ میں ہیں۔ ہر اعتبار سے ضروری اور بہتر ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ تمہارے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر فتح ہوئی تو ہم خدا کی راہ میں غازی ہوں گے، اگر فتح نہ ہوئی تو جان دے کر شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں نجات و فلاح ہماری ہے۔ ہمارا قدم آگے ہی پڑے گا۔ ہمارا نام نیک ہمیشہ یادگار رہے گا۔“

یہ بابر کا پرانا نظریہ تھا: نیک نامی کی موت کہیں بہتر ہے بدنامی کی زندگی سے۔ اس میں کسی بناوٹ کا دخل نہ تھا۔ حقیقت میں وہ یہی سمجھتا تھا اور اسی اذعان کی تاثیر تھی جو سارے لشکر میں دوڑ گئی۔ انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر شیب خاطر قسمیں کھائیں کہ مر جائیں گے، میدان سے منہ نہ پھیریں گے۔ ہر جگہ اسی قول و قسم کا ہنگامہ سا برپا تھا۔ نجومی کے احکام اور بڑی بڑی فالیں، وقت کے وقت ہوا ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔ پھر بابر نے اپنے آدمیوں سے وعدہ کیا کہ رانا سانگا سے جنگ کے بعد جو زمینیں بھی وطن کو واپس جانا چاہے

گا اسے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

چند گھنٹوں تک پورے لشکر گاہ میں دینی جہاد کا جوش و خروش نظر آتا تھا۔ لیکن کنواہہ کی سڑک کے دوسری جانب ہندو پڑاؤ میں بھی ایسے ہی جذبات (بلا اعلان) طاری تھے۔

بابر نے بلا تامل فوج کو میدان کار زار میں نکلنے کا حکم دیا۔ یہ فارسی نوروز، ۱۳ مارچ ۱۵۲۷ء (۹۳۳ھ) کا دن تھا۔ توپ اور اربابوں کی قطاریں جو رسوں اور زنجیروں سے آپس میں جکڑ کر باندھی گئی تھیں، حرکت میں آئیں۔ نئی خندقیں کھودنے والے آگے آگے اور تھکنے، مرتب صفوں میں شتابے جلائے ہوئے عقب میں بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم چل کر راجپوتی پڑاؤوں اور ان کے اگلے رسالوں تک پہنچ رہے تھے۔ اوپر آسمان سے کوئی دیکھنے والا شاید ایسا مشاہدہ کرتا کہ ایک سوسار کسی چیتے پر حملہ کرنے کے لئے ریگلتا ہوا چلا آتا ہے۔

”میدان کار زار کنواہہ“

پانی پت کی طرح اس جنگ کی نسبت بھی خود بابر نے کچھ زیادہ نہیں لکھا اور سرکاری شاعر شیخ زین کا ”فتح نامہ“ فصاحت و بلاغت کی لفاظی میں اصل واقعات کا انکشاف ہونے نہیں دیتا۔ تاہم ابہام کے پردوں سے بعض صحیح جزئیات نکل آتی ہیں۔ بابر کی متحرک قطار کے درمیان فاصلے چھوڑ کر ان میں بڑی بڑی چوٹی تپائیاں پیوں پر چلائی جا رہی تھیں۔ عین کارزار کے دن ان سب کو نیم کندہ خندقوں کے پیچھے جو وقت کے وقت کھودی گئیں، ایک زنجیرے میں متحد اور پیوستہ کر دیا گیا تھا۔ شیر کا حکم تھا کہ اس حد سے باہر کوئی سپاہی نہ بڑھے۔ اور پوری صف کا خود اس نے سوار ہو کر معائنہ کیا کہ ہر سوار کو اپنے اپنے مقام پر مستعد رہنے کا جائزہ لے۔ راجپوت زرہ پوش جنگی ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے بڑھے اس لئے ان کی رفتار شروع میں ست تھی۔

پانی پت کے مقابلے میں یہاں فوج کی ردیف کو بہت گہری صفوں میں مجتمع کیا تھا لہذا پورا لشکر، طویل پتلی قطار کی بجائے دشمن کو چوکور اور چھدرا چھدرا نظر آتا ہو گا۔ سامنا دتے ہی سب سے پہلے توپوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں پر گولہ باری کی اور مفلوم ہوتا ہے بڑی توپوں کے درمیان زنبورکوں نے زاویوں میں ترچھی باڑیں چلائیں۔ آخر راجپوتی رسالوں نے جو پر جوش یورشیں کیں تو منگلوں کی تیر باری نے ان کا منہ پھیر پھیر دیا۔ بابر

کے سپاہی اپنی قسم کے پابند رہے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی جگہ سے قدم نہ ہٹائیں گے اور مریں گے یا مارے جائیں گے۔

دوپہر کی تیزی نے بھی گھسان کی جنگ میں کوئی کمی نہ ڈالی۔ راجپوتی دلاوری یکے بعد دیگرے حملے پر حملے کر رہی تھی، کیونکہ ایک لشکر ہٹتا تو دوسرے راجہ رانا کے رسالے اس کی جگہ لیتے اور حریف پر ٹوٹ کر جا بڑتے تھے۔ عصر کے وقت تک بابر اپنی ردیف کے تمام دستے جنگ کے میدان میں جھونک چکا تھا اور ابھی تک اس کے جناحی لشکروں کو دونوں بازو برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ مہلت نہ ملی تھی کہ پھیر کھا کے دشمن کی پشت پر جا ٹکلیں۔ شاید ازسرنو صفوں کی درستی، زخمیوں کو پیچھے لے جانے اور گھوڑوں کو سستانے میں تھوڑا سا وقفہ واقع ہوا تھا کہ اٹھنے میں پادشاہ نے غیر متوقع حکم یہ دیا کہ پورا لشکر وقت واحد میں راجپوتوں پر حملہ کرے۔ ایک دم زنجیر بند اراہوں کے درمیان کے کھلے حصوں سے سوار نکل پڑے۔ توپوں کو آگے کھینچا گیا۔ تینگیوں نے سرعت سے پیش قدمی کی۔ اس چال کا فوری اثر ظاہر ہوا۔ راجپوتوں کے بلے تھلے لشکروں نے بظاہر اس براہ راست تھپیڑ کو روکنے کی تیاری کی اور وسط کی طرف سٹے تھے کہ اسی لمحے مغلوں کے جناحی جھپٹے پوری قوت سے چلے اور ہندوؤں کو تین طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ابھی تک مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے لیک صفیں متزلزل ہو گئیں اور خود ان کے حملے بالکل رک گئے۔ اب اس عظیم لشکر کے اجزا ادھر ادھر گھیرے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رانا سانگا زخمی ہو کر میدان سے ہٹا لایا گیا تھا۔ سورج چھپتے چھپتے راجپوتوں نے میواڑ کے پہاڑوں کے رخ بھاگنا شروع کیا۔ مگر کہتے ہیں رانا سانگا نے قسم کھائی تھی کہ فتح کئے بغیر شہر میں واپس نہ آئے گا، لہذا اس نے چوڑ جانا قبول نہ کیا۔

غروب آفتاب کے قریب بابر دشمن کو بھگاتا ہوا اس کے لشکر گاہ میں پہنچ گیا جو مغلوں کی صبح کے وقت کی صف بندی سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر تھا۔ وہ ایک کوس اور آگے گیا اور پھر ”رات ہو جانے کی وجہ سے نماز عشا کے وقت تک اپنے اردو میں واپس پہنچ گیا۔“

راجپوتوں کی روایات کی رو سے ان کے لشکر کا بڑا حصہ میدان میں کھیت رہا۔ مقتولوں میں ان کے بہترین بہادروں کے نام آتے ہیں: ڈوگر پور کا راول، برادری کے دو سو منچلوں کے ساتھ۔ سلمبرا کا راجہ چنداوت برادری کے تین سو عزیزوں کے ساتھ۔ مارواڑ کا راج

کمار اپنے سرداروں کے ساتھ۔ سونی گڑھ کا راؤ۔ چوہان رئیس، روسائے میواڑ اور بہت سے دوسرے نامی لوگ سب مارے گئے۔ انہی مقتولوں میں حسن خاں میواڑی بھی تھا۔ مغل فتنمندیوں نے مقتولوں کے بریدہ سروں کا میدان میں ”کلمہ منار“ تیار کیا اور بابر کو ”غازی“ یعنی ایک دینی جنگ کے فاتح کے لقب سے ملقب کیا۔ بے شبہ اس کی سپہ سالاری نے وہ معرکہ سر کیا جو نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ رانا سانگا اپنے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور سال بھر کے اندر مر گیا۔ اس کی اولاد میں بھی کسی کو پھر ہندوستان میں مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پانی پت میں بابر نے شمالی ہند کے مسلمان بادشاہوں کی قوت توڑ دی تھی۔ کنواہہ میں اس نے راجپوت جتھے کا دم خم نکال دیا۔

”بجز تقدیر الہی کچھ نہیں ہوتا“

پانی پت کے بعد بابر نے سوار لشکر تیزی سے آگرے تک دوڑائے تھے۔ کنواہہ کے بعد ایسا کوئی اقدام نہیں کیا۔ ممکن ہے دن بھر کی شدید خونریزی میں فوج کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا ہو جتنا کہ اس کے بیان سے منکشف ہوتا ہے وہ اپنے سرداروں کی سستی کی شکایت کرتا ہے لیکن مغل فوج کا راجستھان کی تپتی وادیوں میں گھسنے سے رکنے کا بڑا سبب گرمی کی آمد آمد ہوا۔ آزمودہ کار سپہ سالاروں کو قلعوں کی بازگشت کے لئے جو افراتفری کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے، بھیجنا ضروری تھا۔ بابر نے اپنے پرانے داؤ سے کام لیا کہ مستحق سپاہیوں کو جاگیریں دے کر روانہ کیا کہ جائیں اور خود ہی ان کو مفتوح کریں۔ پھر اپنے وعدے کا، اگرچہ بادل ناخواستہ، ایفا کیا کہ اکثر سرداروں کو جنہوں نے کابل کے سرد پہاڑوں کو واپس جانا چاہا، اپنے غنائم اور جمعیت کے ساتھ واپسی کی اجازت دے دی۔ خواہش کے اعتبار سے خود بادشاہ بھی وہاں کی یاد سے بے قرار تھا۔

بہر حال یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک تہائی صدی تک خوفناک دشمنوں کے مقابلے میں رہنے کے بعد شیر کو یہ سکون میسر آیا کہ افق سے کسی نئے خطرے کے سر پر آجانے کی تشویش نہیں رہی۔ اب وہ رات کو زہ پینے بغیر سو سکتا تھا۔ آس پاس مخالفت اور بدسگال لوگوں کی کمی نہ تھی اور بہت سے مسائل حل طلب باقی تھے، لیکن اسے ان کی چنداں فکر نہ تھی۔ خدا کی رحمت اور فضل پر بھروسہ بڑھ گیا تھا جس نے توبہ کرنے والے مومنین کو دگنی سنگی تعداد کے کافروں پر فتح کامل عطا کی اور وہ اعتقاد رکھتا تھا کہ دوسری پریشانیوں میں

بھی وہی خدائے رحیم و قدیر اس کی مدد فرمائے گا۔ ترک میں اگلے چند ماہ کے حالات بہت قتل و قتل تحریر کئے گئے ہیں لیکن ان کی تہ میں ایک نیا اعتماد جھلکتا ہے اگرچہ پادشاہ کے دور اندیش دنیا دار امرا اس شیریں خیالی میں اس کے ہم خیال نہ تھے۔

”فتح نامہ“ نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ”فتح کی سب سے پہلے مبارک باد دینے جو لوگ آئے انہی میں محمد شریف نجومی بھی آیا جس نے طرح طرح کی بد فالیاں نکال کر مجھے آزار دیا تھا۔ میں نے بھی برا بھلا کہہ کر دل کا بخار نکال لیا۔ لیکن کافر نعمت، منحوس، خود پسند اور ناپسندیدہ مزاج ہونے کے باوجود، قدیم الحمد متہ تھا اس لئے میں نے ایک لاکھ (دام) انعام اور ملک سے چلے جانے کا حکم دے کر اسے رخصت کیا۔“

”(بہ تصحیح مترجم) طاہر خاں کی نسبت یہ سمجھ کر کہ اچھی کارگزاری کی ہے، میں نے الور کا پرگنہ اور پچاس لاکھ دام عطا کئے۔ لیکن اس نے بد دماغی سے انکار کیا اور معلوم ہوا کہ وہ کارگزاری بھی اصل میں چین تیسور سلطان کی تھی۔ پس میوات کا پرگنہ اور پچاس لاکھ سے دیئے گئے اور الور تردی بیگ کے نام کر دیا جس نے مینے پر اوروں سے عمدہ کام انجام دیا تھا۔ الور کا خزانہ ہمایوں میرزا کو دے دیا۔ رانا سانگا سے جہاد کے وقت جب لوگوں سے حلف لیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ جو کوئی ہندوستان سے جانا چاہے گا اسے رخصت دی جائے گی۔ ہمایوں کے سارے لشکری بد خشاں یا کوہستان پار کے تھے اور ایک دو ماہ سے زیادہ کبھی اپنی ولایت سے باہر نہیں رہے تھے۔ لڑائی سے قبل ان کی روش اچھی نہیں رہی تھی۔ دوسرے ولایت کابل میں سپاہ بہت کم رہ گئی تھی۔ ان سب وجوہ سے میں نے ہمایوں کو کابل جانے کی اجازت دے دی۔“

(آگے چل کر) ”اطلاع ملی کہ ہمایوں نے دہلی کے راستے جاتے ہوئے، کئی کوٹھوں کا قتل تروایا اور بغیر میری اجازت روپیہ نکلوا لیا۔ مجھے اس سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ نہایت رنج ہوا اور میں نے سخت ست کلمات اسے لکھے۔“

یہاں ہمایوں کے ناقابل فہم مزاج اور محرکات کا سوال پھر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ بابر نے بیٹے کے جانے کو عدا اس طرح لکھا ہے کہ گویا وہ معمولی ضابطے کی بات تھی اور اس کا سبب بد خشیوں کا وطن کی یاد سے مضطرب ہونا تھا۔ بلکہ بد خشاں کی بجائے زیادہ تر کابل بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ تاہم خلاف توقع ان خزانوں کے قتل تروانے سے جو شاہی ضرورتوں کے لئے اس نے مقتل کر دیئے تھے، اسے بہت ناگواری ہوئی۔ یہ کام بد خشاں بطور

خود نہ کر سکتے تھے اور نہ ہمایوں کے کسے بغیر دہلی کے حکام اس کی اجازت دیتے۔ پھر اس شہزادے کو اپنی معرکہ آرائی کا صلہ بھی کچھ کم نہیں ملا تھا۔ حصار کے اقطاع کے علاوہ دہلی آگرے کی بے حساب دولت جس میں کوہ نور ہیرا شامل تھا، اسے مرحمت کی گئی اور بوقت رخصت الور کا خزانہ دیا گیا تھا۔ غرض ممکن ہے اس کا یہ فعل خواجہ کلاں کے شعر سے بڑھ کر (جو اس نے کابل جاتے وقت قیام ہندوستان کی مذمت میں دہلی کی تفصیل پر لکھا تھا) ہندوستان میں رہنے کی مخالفت کا ثبوت ہوا اور امرا کی کوئی خاص ٹولی ہمایوں کو بھی اسی رائے پر لگا لائی ہو کہ ہندوستان کو لوٹنے کے بعد چھوڑ دینا چاہئے؟ مقفل خزانے کھول کر ہمایوں نے غالباً صرف تھوڑی سی منتخب چیزیں لے لی تھیں اور دو مہینے ہی گزرے تھے کہ بابر نے اسے بدخشاں میں خلعت خاص اور گھوڑا بھیجا اور گویا قفل شکنی کے قضیہ نا مرضیہ کو بھلا دیا۔

”ایک رات جو سہ کے قریب پہاڑ کے ٹکڑے پر ایک چشمے کے کنارے قیام ہوا۔ شامیانے نصب کرا کے یہاں گناہ معجون کا شغل کیا (واضح رہے کہ ترک مے نوشی کے وقت دوسری مسکرات سے بابر نے توبہ نہیں کی تھی) اس چشمے سے فوج کے گزرتے وقت تردی بیگ نے اس کی بہت تعریف کی تھی (تردی بیگ کو جو پہلے فقیر ہو گیا اور اب بابر کا ہم پیالہ تھا، اس کے حسب خواہش پہاڑی قلعہ جاگیر میں دیا گیا تھا) یہ چشمہ حقیقت میں بہت خوب تھا۔ ہندوستان میں نہریں بنائی جاتیں۔ دیہاتی لوگ چشموں ہی پر پانی لینے جاتے ہیں یہاں کے چشمے بھی ہمارے ملک کے چشموں کی طرح جوش مار کر نہیں بتے بلکہ ان میں سے پانی رستا رہتا ہے۔ تاہم یہ چشمہ اچھا ”نیم آسیا“ پانی دے رہا تھا اور وہ بہہ کر دامن کوہ کے مرغزار تک پہنچتا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں بھی شبہ نہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے گرد بہشت پہلو حوض بنا دیا جائے۔ جس وقت ہم چشمے پر بیٹھے معجون کے سرور کا مزا لے رہے تھے، تردی بیگ بار بار اس کی تعریف کرتا اور کہتا کہ میں نے اس کو یادگار بنا دیا ہے۔ اس کا کوئی مناسب نام بھی تجویز کرنا چاہئے۔ عبداللہ نے تنگ آ کر کہا ”اچھا تو اس کا نام ”شہابی چشمہ“ پندیدہ تردی بیگ“ رکھ لو اس پر خوب تمقے اڑے تردی بیگ فقیر ہو گیا تھا“ میں نے طریق درویشی کی بجائے اسے سپہ گری کے راستے پر ڈالا۔ سالہا سال تک وہ میری خدمت میں رہا مگر اب پھر اس کے سر میں فقری کی ہوا بھری اور مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دے دی اور کامران کے لئے تین لاکھ دے کر اسے (قدھار) روانہ

کیا۔

اس عٹے کے ساتھ تردی بیگ کے ہاتھ بابر نے اپنے دور افتادہ رفیقوں کو ایک قطعہ بھی لکھ کر بھیجا۔ اسے خاص توجہ اور خوبی سے اس نے نظم کیا تھا۔ (ترجمہ):

”ان رفیقوں کو، جنہوں نے ہوائے کابل کی یاد میں ہندوستان کی
مشقت و صعوت چھوڑ کر عاجلانہ وطن کی راہ لی، وہاں کی خوشیاں
اور عزیزوں کی صحبت مبارک ہو۔

مگر ہم جو یہاں رہ گئے، تمام زہمتوں کے باوجود، شکر ہے کہ ہم
بھی زندہ سلامت ہیں۔ ہمارے عیش و راحت کے دن گزر گئے،
تمہارے ایام زہمت!“

اگلی برسات میں دوسرے سپہ سالار و حکام نے بھی اپنی جاگیروں پر جانے کی رخصت
مانگی اور غالباً امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے صرف پادشاہ اور خلیفہ رہ گئے جو ایک حد
تک خواجہ کلاں کا قائم مقام ہو گیا تھا۔ لیکن برسات ختم ہوتے ہی پھر لشکر کو جمع کیا گیا کہ
مفتوحہ علاقوں کی حدود کو معین اور محفوظ کیا جائے۔ اس لشکر کو خود بابر ۲۷ جنوری ۱۵۲۸ء
(ربیع الثانی ۹۳۳ھ) کو لے کر پہلے جنوب میں چندیری کی طرف چلا جو سرحد راجستان کے
پہاڑوں کا مشہور قلعہ تھا۔ یہ ابراہیم لودھی کے قبضے میں رہا اور جنوبی سرحد کی کلید سمجھا جاتا
تھا۔ دوسرے راجپوت رئیسوں کو بابر سبق دینا چاہتا تھا جو رانا سانگا کے مرنے پر حسب
عادت باہم جنگ و جدال میں مصروف تھے۔ چندیری کو حوالے کر دینے کا مطالبہ وہاں والوں
نے مسترد کر دیا۔

بابر لکھتا ہے کہ ”چندیری اچھے شاداب علاقے میں واقع ہے اور اس کے قریب آب
رواں موجود ہے۔ پہاڑی کے اوپر اس قلعے کے اندر پہاڑ تراش کر ذخیرہ آب تیار کیا گیا
ہے۔ یہاں امیر غریب سبھی کے مکان پتھر کے بنے ہیں۔ امرا کے مکانوں میں باریک نقش و
نگار بنائے گئے ہیں۔ چھتوں پر بھی مٹی کی کھیرل کی بجائے پتھر کی پٹیاں لگائی جاتی ہیں۔ بالا
حصار کے سامنے پانی کو تین حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے یہاں پانی بہت اچھا اور میٹھا
مشہور ہے۔ ندی کے پٹے میں بھی پتھر کی سلیں کی سلیں پٹی پڑی ہیں جس سے تعمیر کا بخوبی
کام لے سکتے ہیں۔ آگرے سے چندیری کا فاصلہ سڑک سڑک نوے کوس جنوب میں اور
قطب تارے کی بلندی یہاں ۲۵ درجے ہے..... چین تیمور کو چھ سات ہزار آدمی دے کے

آگے روانہ کر دیا تھا..... ہم نے کبوا میں پڑاؤ کیا اور ناظروں کو بیل داروں کے ہمراہ روانہ کیا کہ راستہ ہموار کریں اور جنگل جھاڑی صاف کر دیں۔ تاکہ چھکڑے اور بڑی توپیں آسانی سے گزر سکیں۔ کیونکہ کبوا سے چندیری تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں.....

پھاڑ کی چوٹی پر چندیری کا قلعہ اور نیچے شہر بستا ہے۔ شہر کے گرد بھی شاہراہ کے اوپر فصیل بنی ہوئی ہے۔ اسی سڑک پر میں نے خود جا کر جگہ جگہ اپنے سردار اور سپاہی معین کئے۔ استاد رومی نے بیرونی فصیل کے باہر اپنی بڑی توپ ”غازی“ کی جگہ تجویز کی مگر یہ اونچی نہ تھی۔ بیل داروں نے اس کے لئے چبوتری بنا دی۔ پھر تمام سرداروں کو حکم دیا گیا کہ سیڑھیاں اور ڈھالیں لے کر قلعے پر حملہ کے لئے تیار ہو جائیں۔

اسی روز میدان ہی میں خلیفہ میرے پاس خط لے کر آیا جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری مشرقی فوجیں بغیر تیاری کے حریف سے جا بھڑیں۔ شکست کھائی اور لکھنؤ چھوڑ کر قنوج میں ہٹ آئیں۔ خلیفہ کو بہت پریشان دیکھ کر میں نے اس کی تشفی کی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ جب تک چندیری کا معرکہ درپیش ہے تم یہ خبر منہ سے نہ نکالنا۔ کل ہم حملہ کریں گے اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے؟

چندیری والوں نے ساری طاقت بالا حصار میں جمع کر رکھی تھی اور شہر کی بیرونی فصیل پر صرف دو دو چار چار پہرہ دار مقرر کئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہمارے آدمی ہر طرف سے اس فصیل پر چڑھ گئے۔ معدودے چند پہرہ داروں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ بھاگ کر بالا حصار میں چلے گئے۔

علی الصباح میں نے ہر شخص کو اپنی جگہ تیار رہنے اور جس وقت میں علم اور نثارے کے ساتھ برآمد ہوں حملہ کر دینے کا حکم دیا۔ لڑائی کا زور بندھنے سے پہلے میں علم اور نثارے کیوں کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس گولہ باری کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ توپ کی بیشک نیچی اور فصیل پتھر کی نہایت مضبوط تھی۔ اس بالا حصار سے ایک دہری دیوار نیچے کے حوضوں تک بنی ہوئی تھی اور حملے کے لئے یہی جگہ مناسب تھی۔ یہ کام قلب کی فوج رکاب کے تفویض ہوا تھا۔ ہماری یورش ہر سمت میں ہوئی لیکن سب سے بڑی جمعیت نے اسی مقام پر دھاوا کیا۔ ہندوؤں نے ہمارے بہادروں پر پتھر پھینکے۔ جلتی آگ پھینکی لیکن وہ نہ رکے اور آخر جوق کا سردار شاہم بیگ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دہری دیوار بالا حصار کی فصیل سے ملی ہوئی

تھی۔ بہت سے اور سپاہی ہجوم کر کے یہیں آ گئے اور دہری دیوار جو راستے کے پٹے کا کام دیتی تھی، اسے چھین لیا۔

بالا حصار کے اندر ہندوؤں نے اتنی مزاحمت بھی نہ کی جتنی اس پٹے اور فصیل پر کی تھی بلکہ جلدی سے اندر بھاگے اور ذرا دیر میں بالکل ننگے ہو کر نکلے اور پھر لڑنا شروع کیا۔ ہمارے کئی سپاہی مارے گئے اور بہت سے فصیل چھوڑ کر بھاگے۔ ہندوؤں کے ایک دم اندر بھاگنے کا سبب یہ تھا کہ وہ سمجھے قلعہ نہیں بچ سکتا، لہذا پہلے انہوں نے اپنی بیویوں اور پاتروں کو جا کر مارا پھر جنگے ہو کے لڑنے مرنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے اپنے اپنے مقام سے دوبارہ حملہ کیا اور ہندوؤں کو فصیل پر سے مار ہٹایا۔ تب ان میں سے دو تین سو ہندو (راجہ) میدنی راؤ کے محل میں گھسے اور وہاں اس طور سے اپنے آپ کو ہلاک کیا کہ ایک شخص تلوار لے کر کھڑا ہوا اور دوسروں نے خوشی خوشی اپنی گردنیں اس کے آگے کاٹنے کو جھکا دیں۔ اس طرح ان کی بڑی تعداد واصل جنم ہوئی۔

عنایت الہی سے یہ مشہور قلعہ، دو تین گھڑی میں کسی سخت جنگ اور شاہی نوبت و علم آگے بڑھائے بغیر فتح ہو گیا۔ مقتول ہندوؤں کے سروں کا کلمہ منار چندیری کے شمال مغرب میں ایک ٹکڑے پر بنوانے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح کسی خاص تعجب کا اظہار کئے بغیر بابر نے راجپوتوں کی مجنوناہ بہادری کا ذکر ختم کیا ہے آئندہ ان سے بھگتے کی اور کوئی نوبت اسے نہیں آئی۔

”دکنگاہ پر ایک پل“

جاں نثار خلیفہ کی پریشانی بے جا نہ تھی۔ بہرچند اس کا تقرر ابھی باضابطہ نہیں ہوا تھا، تاہم بننے والی سلطنت کا وہ گویا وزیر اعظم تھا۔۔۔۔ اگرچہ یہ سلطنت بھی ہنوز اس کے آقا کے خانہ داغ ہی میں تیار ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ بہر حال اس کی چشم تصور کے سامنے ایک وسیع کشور کا عجیب منظر پھیلا ہوا تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ اور گروہ، کچھ مطیع و فرماں بردار، کچھ باغی اور لڑائی پر تیار، آزادی کے کپے یا بادل ناخواستہ محکوم، الگ الگ بولیاں بولنے والے بھرے تھے اور ان سب کو کسی مرکز پر جمع رکھنے والی پادشاہ کی مضبوط قوت ارادی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ ان میں سب سے سرکش مشرق کے افغان رئیس تھے جو شوریدہ مزاجوں کی فوج لے کر قنوج پر چڑھ آئے تھے۔ قنوج سے سردار فوج کے لئے

آگرہ صرف دو دن کی مسافت پر تھا، حالانکہ پادشاہ وہاں سے سات دن کی منزل پر دور ایک مفتوحہ قلعے کے وسائل آب رسانی دیکھنے میں منہمک تھا۔

تاہم شیر نے چندیری میں زیادہ تساہل نہیں کیا بلکہ آگرے کی بجائے سیدھا، جتنا پار اودھ اور لکھنؤ کی طرف جہاں بغاوت کا زور تھا، پلٹ پڑا۔ لشکر شاہی کی آمد آمد سن کر باغی لشکر جلدی سے گنگا کے پار اتر گئے اور اس عظیم دریا پر مقابلہ کرنے کی تیاریاں کیں جسے کشتیوں کے سوا عبور کرنا، ان کی دانست میں ممکن نہ تھا۔ انہیں اپنے ہاتھیوں پر اور اپنے سرغنہ بازید اور معروف پر پورا بھروسہ تھا کہ شاہی فوج کھلی کشتیوں میں دریا سے اتری تو گھاٹ پر مار مار کے اسے پسا کر دیں گے۔ ادھر بابر اور اس کے مہندس سمجھتے تھے کہ آنگا پر بھی کشتیوں کا پل باندھا جا سکتا ہے۔ استاد علی رومی کو یقین تھا کہ اپنی منتخب توپوں سے میں اس کام میں مدد کر سکتا ہوں:-

”جہرات کو ہم قنوج کے پاس سے گزرے اور گنگا کے مغربی کنارے پر خیمہ زن ہوئے۔ طلایہ کے سواروں نے اوپر، نیچے گشت لگا کے کشتیاں پکڑیں اور چھوٹی بڑی تیس یا چالیس لے آئے۔ میر محمد جالہ بان (تختہ پل تیار کرنے والا) کو مناسب جگہ جہاں پل باندھا جائے اور ضروری مسالاجع کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ پڑاؤ سے کوس بھر نیچے جگہ دیکھ کر آیا۔ چند مستعد ناظروں کو حکم ہوا کہ کام شروع کرائیں۔ استاد علی نے اسی جگہ کے قریب اپنی توپ نصب کی اور خوب پتھر کے گولے برسائے (اس کا حریف) مصطفیٰ ترک بھی اراہوں پر اپنی توپیں لایا اور ذرا آگے ایک ٹاپو پر انہیں جما کے گولہ باری کرتا رہا۔ پل کے سرے سے اوپر کے رخ ایک دم سے تنگنی برابر گولیاں چلاتے رہے۔

ملک قاسم مغل اور تھوڑے آدمی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار ہوئے اور کچھ دیر خوب لڑے..... حتیٰ کہ قاسم کی جرات بڑھی کہ وہ دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پہنچا اور تیر باری کی۔ اس پر پڑاؤ سے ایک جمعیت ہاتھی لے کر نکلی اور قاسم کو بھاگنا پڑا۔ وہ کشتی میں چھب گیا تھا لیکن ہاتھی نے آکر کشتی کو ڈبو دیا۔ اس معرکے میں قاسم مارا گیا۔

”پل بندھنے کے دنوں میں استاد علی پتھر کے گولے خوب چلاتا رہا۔ پہلے دن آٹھ، دوسرے دن سولہ چلائے اور پھر تین چار دن اسی رفتار سے چلاتا رہا۔ یہ گولے اس بڑی توپ سے دانے گئے جس سے رانا سانگا کافر کی لڑائی میں کام لیا اور ”غازی“ نام رکھا گیا تھا۔ استاد نے ایک اور اس سے بھی بڑی توپ بنائی تھی۔ مگر وہ پہلا گولہ دانے ہی میں

پھٹ گئی۔ ہمارے متفکینوں نے مل کر جو باڑیاں ماریں ان سے دشمن کے بہت سے سپاہی بلکہ ہمیر کے بھاگتے ہوئے مزدور اور سرہٹ دوڑتے گھوڑے مارے گئے۔

”افغان پل بندھنے میں تاخیر پر تمسخر کرتے تھے۔ لیکن وہ چار شنبہ کو تیار ہو گیا اور میں اس کا سرا دیکھنے گیا۔ جمعرات کو مکمل ہوتے ہی لاہوریوں اور پیادوں کی ایک جمعیت سبقت کر کے پل سے دوسری طرف اتر گئی ان کی تعداد کم تھی اور لڑائی بھی زیادہ نہیں ہوئی لیکن جمعے کو قلب اور مینے میسرے کے بہت سے سپاہی پار ہو گئے اور ادھر سے افغان بھی ہتھیار باندھ کر ہاتھیوں سمیت مقابلے میں نکلے۔ عشا کے بعد تک فریقین میں لڑائی ہوتی رہی۔ مگر اس رات میں نے حکم دیا کہ جو لوگ پار اترے تھے سب واپس اپنے پڑاؤ پر آجائیں۔“

باہر اعتراف کرتا ہے کہ ہفتے کی سرفوج کو واپس لانے کا عجیب سا خیال اس لئے آیا تھا کہ ٹھیک ایک سال قبل وہ نو روز سہ شنبہ کے دن سیکری سے فوج لے کر چلا اور چار دن بعد رانا ساگا سے لڑ کر غالب آیا تھا۔ اب گنگا پر بھی پل اترنے کے لئے چلا تو نو روز تھا اور اس کے دل میں آئی کہ اور چار دن ٹھیر کر ہفتے ہی کے دن افغانوں پر حملہ کرنا سازگار ہو گا۔

”(اگلے) ہفتے لکھنؤ گیا۔ گومتی کے پار منزل ہوئی۔ اس ندی میں جا کر غسل کیا۔ معلوم نہیں پانی میرے کان میں چلا گیا یا سردی کا اثر تھا کہ سیدھا کان گنگ ہو گیا اور کئی دن تکلیف رہتی۔ اودھ سے ایک دو کوچ باقی رہے تھے کہ چین تیمور کا ہرکارا پیام لایا کہ دشمن سرد ندی کے پار ڈٹا ہوا ہے۔ بادشاہ ملک بھجوائیں۔ میں نے قراچہ کے ماتحت کوئی ایک ہزار شمشیر زن روانہ کئے اس کے پہنچنے پر جب ان فوجوں نے ندی پار کی تو ادھر صرف پچاس سوار اور تین چار ہاتھی تھے جو فوراً فرار ہوئے۔ چند کے سر کاٹ کر بھیجے گئے بائزید کا پیچھا گیا مگر وہ ایک جنگل میں گھس کے بچ گیا۔ چین تیمور آدھی رات میں کوئی چالیس کوس تک پیچھا کرتا رہا اور اس کے اہل و عیال کے پڑاؤ تک گیا لیکن وہ بھاگ چکے تھے۔ تاہم اس نے ہر طرف سوار دوڑائے اور محمد باقی وغیرہ دشمنوں کو اس طرح کھدیڑتے پھرے جیسے بھیڑیا بکری کو۔ تاآنکہ بائزید کے بال بچے مل گئے اور گرفتار کر لئے گئے۔

میں انتظامات درست کرنے کی غرض سے اودھ کے قریب اسی مقام پر چند روز ٹھیرا۔ یہاں والوں نے سات آٹھ کوس اوپر کے علاقے میں بتایا کہ شکار خوب ہوتا ہے۔ میر محمد

جالہ بان کو بھیجا گیا کہ سرد اور گھاگرا ندیوں کے گھاٹ دیکھ کر آئے۔ جمعرات کو میں شکار کے ارادے سے سوار ہوا۔“

یہاں پھر بار کے روزنامے سے پانچ ماہ سے زیادہ کے حالات گم ہو گئے ہیں لیکن آئندہ اور آخری ہفتوں کی سرگزشت سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقی ندیوں پر مقابلہ کرنے والے مغلوب کر لئے گئے۔ معلوم ہوتا ہے اسے امید تھی کہ یہ آخری معرکہ آرائی ہوگی۔ اس سال ۱۵۲۸ء کی گرمی (۹۳۳ھ) میں اس کی سلطنت بدخشاں کے پہاڑوں سے لنگا گھاگرا کے سنگم تک پھیل گئی تھی جو سڑک سڑک ایک ہزار میل (پانچ سو کوس) کی مسافت تھی۔ لہذا اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کے طور طریق کی نسبت وضاحت کر دے کہ وہ آئندہ کیا ہو گا؟

مغل اعظم کی سلطنت

گلبدن بیگم کا سفر آگرہ

جنگی مقابلوں کے ختم اور برسات کے بعد ”پادشاہ ہندوستان“ نے اپنے اہل و عیال کو کابل سے بلوایا۔ دو سن رسیدہ خلائیں جو سمرقند کی خانماں خرابی میں ساتھ تھیں، پہلے ہی نو مفتوحہ ملک میں آچکی تھیں۔ بابر نے چنگیزی خاندان کے جملہ افراد کو دوبارہ آگرہ میں آنے کی دعوت دی تھی، وہ اسی بلاوے پر آئی تھیں۔ لیکن کابل سے تمام اہل و عیال کو بلوانے کے معنی یہ تھے کہ بابر کابل سے تعلقات قطع کر رہا ہے۔ بڑے بیٹے تو خواجہ کلاں کے مشورے کے مطابق اپنی اپنی ولایتوں میں مقیم رہے۔ ورنہ محل سرا کے باقی سب افراد نے رخت سفر باندھا اور نوکروں اور پاسبانوں کی معیت میں خیبر کے راستے پر چل پڑے۔

ہر ایک کی آرزو تھی کہ پادشاہ کے لئے کوئی تحفہ لے کر حاضر ہو اور ہر ایک مشتاق تھا کہ باریابی کے وقت کیا پاتا ہے؟ گلبدن بیگم چھ برس کی تھی، یعنی قریب قریب اتنی بڑی جتنا کہ خود بابر پہلی دفعہ سمرقند جانے کے وقت تھا۔ وہ اپنی اصلی ماں کی بجائے بڑی بیگم ماہم کے ساتھ روانہ ہوئی اور خانزادہ بیگم، بی بی مبارک وغیرہ دوسری بیگمات کچھ روز بعد چلیں۔ ممکن ہے اس علیحدگی کا سبب اہل حرم کا اندر خانہ مناقشہ ہو۔ بہر حال منہی گلبدن کے دل میں تو سب سے زیادہ لویہ لگی تھی کہ باپ سے آگرے میں کب ملنا ہوتا ہے۔ لکھتی ہے: ”یہ حقیر پر تقصیر ماہم بیگم کے ہمراہ والد ماجد کے حضور میں ادائے آداب کے لئے گئی۔ جب ہم کول کے چنیا باغ میں پہنچے تو دو پاکلیاں اور تین سوار ملے جو والد نے ماہم کے لئے بھیجے تھے چنانچہ وہ فوراً کول سے آگرے روانہ ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت خود انہیں لینے باغ مذکور تک آنا چاہتے تھے۔ مغرب کے وقت کسی نے آکر پادشاہ کو اطلاع دی کہ ملکہ راستے پر دو کوس دور رہ گئی ہیں۔ یہ سن کر والد نے گھوڑا لانے کا بھی انتظار نہیں کیا بلکہ پیدل چل

پڑے اور اس مکان کے قریب ماہم سے ملے جو بعد میں میری ماں کو دیا گیا۔ بیگم پاکی سے اترنا چاہتی تھیں مگر پادشاہ نے پاکی ٹھہرنے نہ دی اور اسی طرح خود بھی خدم کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں اپنے محل تک لائے۔

ماہم نے پادشاہ سے ملاقات کے وقت حکم دیا کہ مجھے اگلے دن صبح کو آداب بجالانے کی غرض سے حضور میں لایا جائے۔ اس روز ہمارے جلو میں پادشاہی نوسوار، نو کوتل گھوڑے پالکیوں کے گرد، اور بیگم کے تقریباً سو ملازمین اعلیٰ درجے کے گھوڑوں پر سوار لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے۔ قابل دید نظارہ تھا۔ والد کے وزیر خلیفہ اپنی بیوی سلطانم کے ساتھ نئے حمام تک پیشوائی کو آئے۔ میری بڑی دوا نے باغ خورد پر مجھے پاکی سے اتارا اور مسند بچھا کر اس پر مجھے بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ خلیفہ آئیں تو میں ان کی کھڑے ہو کر تعظیم دوں اور گلے ملوں۔ چنانچہ وہ آئے تو میں نے اٹھ کر معافقہ کیا۔ پھر ان کی بیوی سلطانم آئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ان سے کس طرح ملا جائے۔ میں دوبارہ اٹھنا چاہتی تھی کہ خلیفہ نے منع کیا اور کہا یہ تمہاری خادمہ رہ چکی ہیں، ان کی تعظیم کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی آپ کے والد کا احسان ہے کہ اپنے قدیم خادم کی عزت بڑھائی اور آپ سے میری تعظیم کرا دی اور مجھے ملنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کرنا ہمارا فرض ہے۔

”خلیفہ نے ۶ ہزار چاندی کے سکے اور ۵ گھوڑے خود نذر کئے اور سلطانم نے تین ہزار نقد اور ۳ گھوڑے پیش کئے پھر اس نے کہا غریبانہ ماحضرتیار ہے اگر آپ نوش فرمائیں تو اپنے خادموں کی عزت بڑھائیں گی، میں نے قبول کیا۔ وہ مجھے بہت اچھے مکان میں لے گئے۔ جہاں شہ نشین پر گجراتی مقیش کا سرخ شامیانہ اور منقش بلیوں کے سارے قنات بندھی تھی۔ یہاں (خلیفہ کی حویلی میں) دسترخوان بچھایا گیا اور طرح طرح کے کباب قورے اور نان و شربت اور فواکہ چنے گئے۔ چاشت کا یہ کھانا کھا کر میں پھر پاکی میں سوار ہوئی آداب بجالانے باوا حضور کے سامنے گئی۔ میں نے ان کے پاؤں چومے۔ انہوں نے تھوڑی دیر مجھے گود میں بٹھایا اور بہت سی باتیں پوچھتے رہے۔ اس حقیر کینز کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی.....“

گلبند اس روز بھاری بھر کم ”ناشتے“ کے بعد جس باپ سے ملاقی ہوئی وہ اس شخص سے مختلف تھا جو چار برس پہلے کابل سے ہندوستان روانہ ہوا تھا۔ ماہم نے اپنے سفر میں پانچ مہینے لگا دیئے تھے۔ جس کا شاید یہ سبب ہو کہ وہ ہمایوں کے بغیر ہندوستان جانے سے رکتی

تھی۔ بہر حال ملکہ اور اس کی سوتیلی بیٹی کے اسی زمانہ سفر (دسمبر ۱۵۲۸ء تا جون ۱۵۲۹ء) میں نئے مقبوضات کا بابر نے انتظام درست کیا اور ادھر اپنے گھر کا بندوبست کرنے میں برابر مصروف رہا۔ ان آخری دو سال میں اس نے کوئی نئی مہم اور فوج کشی نہیں کی اگرچہ ان حوصلہ مند یوں کا شوق ابھی تک معدوم نہ ہوا تھا۔ مگر اتنے بڑے ملک اور کثیر رعایا کے زیر نگیں آنے کے بعد لا محالہ اسے زیادہ وقت ان کے معاملات کے انصرام میں دینا پڑتا تھا اور ادھر یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ نئی سلطنت میں اس کی اولاد کا قیام کیا ہو گا۔ اس سلسلے میں ضروری تھا کہ بیٹوں سے جو اب بڑے ہوتے جاتے تھے، زیادہ قریبی رابطہ قائم کیا جائے۔ وقت کی اس ضرورت کی بناء پر اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ ہمایوں کو ایک نصیحت آمیز خط بدخشاں بھیجا۔ تقریب یہ ہوئی کہ ہمایوں کے ہاں لڑکا، جس کا نام الامان رکھا گیا تھا، پیدا ہوا تھا۔ مضمون یہ ہے:-

”ہمایوں کے نام، جسے دیکھنے کا آرزو مند ہوں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔
خدا کا شکر ہے اس نے تم کو بیٹا عنایت کیا۔ خدائے بزرگ و برتر ہمیشہ تمہیں ایسی ہی خوشیاں دکھائے۔ تم نے اس کا نام ”الامان“ رکھا ہے۔ خدا مبارک و مسعود فرمائے۔ لیکن تم جو مسند آرائے حکومت ہو، تم کو جاننا چاہئے کہ عوام اسے ”المن“ (بہ معنی حملہ گر) یا ”المان“ (پناہ یافتہ) تلفظ کرتے ہیں۔ خدائے قدیر زمانہ دراز تک اسے اپنی امان میں رکھے اور اقبال مسند کرے۔

تمہارے لئے بڑے کام کرنے کا وقت آتا ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ کامران کے ساتھ مہر و مروت سے کام کرنا نہ بھولنا۔ تم کو معلوم ہے کہ ہر چیز میں اس کے پانچ حصے کے مقابلے میں تم کو چھ حصے دیئے گئے ہیں۔ آئندہ ضبط نفس کو ہاتھ سے نہ دینا اور اس سے خوش دلی کی مفاہمت ہمیشہ قائم رکھنا۔ ذمہ داری کا بوجھ بڑے بیٹے پر ہی ہوا کرتا ہے۔

مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔ گزشتہ چند سال میں تمہارے بہت کم خط آئے اور آدمی ایک بھی نہ آیا۔ میں نے جسے تمہارے پاس بھیجا تھا، اسے پلٹ کر آنے میں ایک سال لگ گیا۔ کیا یہ صحیح

نہیں ہے؟ تم خطوں میں اپنے عزیزوں سے جدائی کا شکوہ لکھتے ہو۔ یہ شکوہ بے جا ہے۔ حضرت سعدی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ”بند و سلاسل میں بھی اپنے حال پر قانع رہ۔ جریدہ سفر میں بھی اپنی منزل خود تلاش کر۔“

بادشاہوں کو پابند رہ کر، تنہا کام کرنا ہوتا ہے۔ انہیں تنہائی کی شکایت نہ کرنی چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ تم نے میرے حکم کی تعمیل میں خط لکھ دیا۔ مگر اسے دوبارہ پڑھا بھی تھا؟ اگر پڑھتے تو مطلب نہ سمجھ سکتے۔ مجھے اس کا مطلب نکالنے میں کافی درد سری ہوئی۔ کیا تم نے نثر میں کوئی معما تیار کیا ہے یقیناً ایسا نہ ہو گا۔ پھر ججے، اگرچہ ما۔ قریٰ تو ہیں مگر اچھے نہیں ہیں۔ غرض ابہام کی وجہ سے خط کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور اس کا سبب مسجع لفاظی ہے۔ آئندہ الفاظ میں تکلف و تصنع سے پرہیز کرو۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف لکھنا چاہئے تمہیں لکھنے میں بھی زحمت نہ ہو گی اور پڑھنے والے کو بھی پریشانی نہ ہو گی۔

اب تم ایک کار اہم شروع کر رہے ہو۔ تجربہ کار سرداروں سے مشورہ کرو اور ان کی صلاح مانو۔ دن میں دو مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی اور امیروں کو مشاورت کے لئے بلایا کرو۔ ان کا آنا اتفاق پر منحصر نہ رکھو۔ جو مسئلہ زیر غور ہے اس کی ہر بات اور کارروائی کا تصفیہ کرنے میں پہلے ان لوگوں سے مشورہ لے لینا چاہئے۔ مکرر یہ کہ خواجہ کلاں مدت سے میرے خاندان کا ہمراز و رفیق ہے۔ تمہارے معاملے میں بھی اسے ہم راز رہنا چاہئے۔ خدا کے فضل سے تمہارے معاملات میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور کچھ دن بعد تمہیں کامران کی غالباً ضرورت نہ رہے گی۔ اس صورت میں اسے میرے پاس آنے دینا۔

ایک اور بات یہ کہ تسخیر کابل کے بعد سے ہمیں فتوحات پر فتوحات نصیب ہوئیں۔ اس لئے قبضہ کابل کو میں بہت مسعود خیال

کرتا ہوں اسے اپنے خالہ (ملک شاہی) میں داخل کر لیا ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی طمع نہ کرے۔

جب تک سپاہ پوری طرح تیار اور مجتمع نہ ہو جائے، کوئی فوج کشی نہ کرنا۔ بیان شیخ کو زبانی بھی سمجھا دیا ہے وہ سب باتیں تم سے کہے گا۔۔۔۔۔ اس سب کے بعد مکرر دعائے خیر اور اشتیاق دید تحریر کرتا ہوں۔

نوشتہ روز پنجشنبہ۔ اسی مضمون کے خط کامران اور خواجہ کلاں کو لکھے اور روانہ کئے گئے ہیں۔“

بظاہر اس خط کا ہمایوں نے جواب نہیں بھیجا۔ وہ دل کی بات کم کسی کو بتاتا تھا اور اپنے مستقبل کی جستجو نجوم کی علامتوں میں کرتا تھا۔ حیدر میرزا جو اب بڑا ہو گیا تھا، انہی دنوں کاشغر سے آیا۔ لکھتا ہے کہ ہمایوں پر ایک ”مولانا“ کے برے اثرات بہت بڑھ گئے تھے اور وہ انہوں نے کھانے لگا تھا۔ تاہم ”کاراہم“ کی ذمہ داری لینے میں اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یعنی بدخشاں اور کابل کی فوجیں جمع کر کے ازبکوں کے خلاف بڑھا جو اس کی سرحدوں پر برابر فتنہ و فساد اٹھاتے رہتے تھے۔ اصل میں تقدیر کا چکر ان شمال مغربی اقطاع میں دوبارہ پھرتا نظر آتا تھا۔ خراسان میں شیبانی کے جانشین ازبک سردار عبید خاں کو ایرانی شاہ شمسپ نے پسا اور قتل کر دیا تھا اور بابر، جس کا بیان ہے کہ عبید خاں کو جادو گروں نے گہرا کیا، اسے ایک خدا ساز موقع سمجھا کہ بیٹا سمرقند لینے کی ایک اور کوشش کرے کیونکہ خود وہ ہندوستان چھوڑ کر یہ مہم نہ لے جا سکتا تھا۔

لیکن ہمایوں اور اس کا بھائی قوت و فراست کسی میں بھی باقی ماندہ سلاطین ازبک کے ہم پلہ نہ نکلے۔ ہمایوں نے سرحدی قلعہ حصار کو پھر جھپٹ لینے میں خاصی استادی دکھائی لیکن سمرقند کے قریب تر مقامات میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ احساس ناکامی لئے ہوئے واپس چلا آیا۔ یہ بھی یقینی ہے کہ ماں کے خط نے جو تاکید ”اگرے بلا رہی تھی“ اسے سوچ میں ڈال دیا ہو۔ پھر حسب عادت مہینوں گوگو میں رہ کر وہ بغیر اطلاع بدخشاں سے چل پڑا اور اپنے کم عمر بھائی ہندال کو بلا کر اپنا قائم مقام بنا دیا۔ بابر کو خبر بھی نہ کی تھی لیکن جب اس کو معلوم ہوا تو اس نے ہمایوں کے فیصلے کو بے تامل منسوخ کر دیا۔ خود ہمایوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ولی عہد سلطنت بدخشاں سے اسپ سوار ایک دن میں کابل پہنچ گیا جو فی

الواقع بڑا کارنامہ تھا۔ کابل سے اس نے آگرے کی راہ لی۔

یہ سال '۱۵۲۹ء بیرونی دنیا میں جس کی مغل درباروں کو ابھی خبر تک نہ تھی، کئی قابل ذکر واقعات کا حامل گزرا ہے۔ عثمان لی، سلطان سلیمان اعظم نے بار برداری کی گاڑیاں جلا دیں اور توپیں لے کر وی آنا کی شہر پناہ سے ہٹ گیا کہ اپنی توجہ مشرقی سمندروں کی طرف معطوف کرے کیونکہ اب وہاں پرتگیزی بیڑے دور دور تک گشت لگا رہے تھے اور البوکرک کی درخشاں بحر نور دی سے گوآ میں ان کا مضبوط گڑھ اور گنگا کے دہانے نیز چاٹ گام اور سیامی ساحل پر جگہ جگہ بحری چوکیاں بن گئی تھیں۔ لیکن گوآ کے فرنگی تاجروں کا ابھی تک صرف جنوبی ہند کی سلطنت وجیا نگر یا شاہان بنگالہ سے سابقہ پڑا تھا۔ البتہ ان کے سفیر و سوداگر (اکثر یہ دونوں کام ایک ہی جماعت انجام دیتی تھی) شاہ ٹمساپ کے شائستہ دربار تک، کبھی مسجد کبور والے تمبریز میں اور کبھی اصفہان میں رسائی حاصل کر رہے تھے۔ تمبریز میں سن رسیدہ بہزاد ابھی تک نوجوان انجلیکو کی سی چابک دستی سے قلمی تصویریں بنا رہا تھا اور وہاں کے بڑے کتب خانے کا منتظم تھا۔ سفیر سوداگروں کو ایران کی روز افزوں خوش حالی اور بیداری میں چڑھتے سورج کی حرارت محسوس ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے شیبانی کی ساختہ سلطنت جو ازمندہ وسطی کی بدوی حکمرانی کی آخری یادگار تھی، مغربی یورپ سے دور پڑی تھی اور اس کا رابطہ تھا بھی تو یا اندرونی غیر متحدن اقوام سے اور یا ماسکو کے ایسے تاجروں سے جو دور دور گشت لگاتے ہوئے ادھر جا نکلتے تھے۔ عجیب واقعہ ہے کہ پہلا فرنگی جو ہندوستان کے مغل دربار میں وارد ہوا ایک ترک امیر البحر تھا کہ پرتگیزیوں کو گوآ سے نکال باہر کرنے کے ارادے سے بیڑا لے کر چلا مگر طوفان نے اس کے جہازوں کو برباد کر دیا اور خود اسے ساحل ہند پر لاپہینکا۔ لیکن یہ واقعہ بھی بابر کے بعد اگلی نسل یعنی ہمایوں کے آخری عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

جملہ سلاطین، خوانین، عمائد و امراء نذر لاتے ہیں

اس اثنا میں بابر نے بہ حیثیت بادشاہ اپنا پہلا دربار منعقد کیا۔ ان شباب رو ایام میں اس کا روزنامہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا ہے۔ اس جشن عام یا تماشا کرانے کی وجوہات کی وہ کوئی صراحت نہیں کرتا نہ یہ لکھتا ہے کہ مہمانوں کو کس طرح دعوت دی گئی تھی۔ جشن ترک مغل نمونے کے مطابق اور بظاہر فتوحات کے اعلان کے نتیجے میں منعقد ہوا تھا جسے ہر

طرف نشر کیا گیا تھا۔ اسی قسم کا سابقہ اعلان وہ صلائے عام تھی جو بابر نے آل چنگیز و تیمور کو آگرے آنے کی دی تھی۔ اپنے تیسرے فرزند عسکری کو بھی اس نے انہی دنوں بلوایا اور شمشیر و کمر، شاہانہ خلعت، توغ و علم وغیرہ سپہ سالاری کے جملہ لوازم دے کر نوازا تھا۔ جشن منانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو گئی کہ بادشاہ کے پہلے پوتے کی ولادت کا باضابطہ اعلان کیا جائے۔

غرض جو سبب بھی ہو، یہ نمائش پادشاہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ کرائی گئی تھی اور اس سے قبل جہاں تک معلوم ہے۔ بابر نے ایسا دربار عام نہیں کیا تھا۔ ہندوستان میں آئندہ مغل سلاطین کے دربار جس شان سے منعقد ہوئے اس کے مقابلے میں آگرے کا بابر کی جشن بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بابر اس سے نہایت لطف اندوز ہوا اور اسے بڑا عمدہ ہنگامہ بتاتا ہے:-

”ہفتے کے روز باغ میں جشن ہوا۔ خس پوش بنگلے میں میری نشست تھی۔ دائیں جانب محترم علماء اور سمرقند سے آئے ہوئے دوسرے ملا اور حفاظ بیٹھے۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر شامیانہ تان کر قزل باش سفیروں کو جگہ دی تھی۔ میرے قریب ہی عسکری، خواجہ کلاں، خلیفہ اور خواجہ عبید اللہ احراری کے ایک پوتے تھے۔ بائیں جانب ازبک سفیر اور (راجستان و بنگالہ) کے ہندو (وکلا) تھے۔ دسترخوان بچھائے جانے سے پہلے تمام سلاطین، عمائد و امراء نے زر سرخ و سفید و سیاہ اور دیگر اجناس (بارچہ) نذر گزرائیں۔ میں نے زیر انداز بچھوا کر حکم دیا کہ یہ نذر ان پر انبار کر دی جائیں۔ جس وقت نذریں گزارنی جارہی تھی، سامنے دریا کنارے مست اونٹوں ہاتھیوں اور مینڈھوں کو لڑایا گیا اور پہلوانوں کی کشتیاں کرائی گئیں۔

(بہ تصحیح مترجم) کھانے سے فراغت کے بعد خواجہ کلاں کو تن زیب کا جامہ جس پر کارچوبی پھول تھے، عنایت کیا گیا۔ ازبک و ارغون سفیروں کو زر و نعت کے نیم آستین دیئے۔ بڑے سفیروں کو ایک ایک مشقال سونا چاندی۔ علی ہذا دو بڑے خواجہ (مشائخ) کو زر و نفقہ تول کر عطا کیا گیا..... معصومہ (بیٹی) اور ہندال آگرے میں نہ تھے، ان کے نوکروں کو خلعت اور سینہ بند مرحمت ہوئے۔ میر محمد جالہ بان نے گنگا کا پل باندھنے میں قابل تعریف کام کیا تھا، اسے اور دو بہادر تشکیکوں کو ایک ایک خنجر دیا۔ استاد علی رومی کے فرزند اور پیتہ سدھانے والے ولی کو بھی خنجر عنایت ہوئے۔

اندجان سے میرے ساتھ گھریا تاج کر دشت و صحرا چھاننے والے رفیقوں کو (جو فرغانہ چھوڑنے کے بعد کوہ سیاہ کی گھاٹیوں میں میرے ہمراہ پھرے) نقرتی کام کے لباس اور دوسرے عطیات دیئے گئے۔

اُش نوشی کے وقت ہی ہندوستانی بازی گروں اور ننوں کو حکم ہوا کہ اپنے کرتب دکھائیں۔ یہاں کے نٹ ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ پہاڑوں کے پار ہماری ولایات میں انہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک تماشا یہ ہے کہ ایک حلقہ پیشانی پر، دو دو اپنے گھٹنوں، انگلیوں اور پاؤں کے انگوٹھی پر لگا کر وقت واحد میں انہیں گھماتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) مور چال چلتے وقت ایک ہاتھ بھی زمین سے اٹھا لیتے ہیں اور اس میں اور ادھر پاؤں میں حلقے ڈال کر پھراتے ہیں۔ ہمارے ہاں دو نٹ ایک دوسرے کو پکڑ کر قلا دکھاتے ہیں مگر یہاں والے تین تین مل کر کئی قلائیں لگاتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک نٹ ۶، ۷ گز کا بانس پیٹ پر رکھ کر سیدھا بلند کرتا، دوسرا اس پر چڑھ کر اوپر کھیل تماشے دکھاتا ہے۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک لڑکا نٹ کے سر پر چڑھتا ہے، نیچے والا اسے لئے لئے کرتب دکھاتا ہے اور یہ لڑکا سر کے اوپر اچھل کود دکھاتا اور برابر اپنا توازن قائم رکھتا ہے۔ ذرا نہیں لڑکھڑاتا۔ کئی رنڈیاں بھی اس موقع پر آئیں اور اپنا ناچ دکھایا۔

مغرب کے قریب سونے چاندی اور مسی سکے کی بکھیر کرائی گئی۔ اس کے لوٹنے میں بڑا شور اور چھینا جھپٹی ہوئی، لطف آگیا۔ مغرب اور عشا کے درمیان پانچ چھ معزز مہمانوں کو رات کی نوبت بجنے تک میں نے اپنے پاس بٹھایا پھر کشتی میں دریا کی سیر کی۔ دوسری صبح باغ ”ہشت بہشت“ میں آگیا۔

”دوشنبہ“ جب عسکری مسلح لشکر کے ساتھ سفر پر جانے کے لئے تیار ہوا تو رخصت ہونے حمام میں میرے پاس آیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔“

پادشاہ کے اس پہلے دربار میں بعض باتیں ضرور خلاف معمول نظر آئیں گی۔ بیرونی ممالک جن سے ابھی تک سفارتی تعلقات پوری طرح متعین نہیں ہوئے، ان کے سفیروں کی رسمی خاطر تواضع واجبی سی کی گئی۔ اسی طرح ہندوستان کے کسی رئیس، راجہ کو عطاءے خلعت و اعزاز کا ذکر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں پرانے رفیقوں کو بہت کچھ انعام و اکرام دیئے جاتے ہیں۔ وہ ان قبائلی سرداروں تک کو اس موقع پر نہیں بھولتا جنہوں نے پہلی مرتبہ کابل آتے وقت پہاڑوں سے گزرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ علی ہذا، رئیس و

راجہ کی بجائے جالہ بان چیتے کے شکاری، توپچی، تنگی مراحم خسروانہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ یہ بات کہ اس کی زندگی اور بڑے بڑے کارنامے چند مردوں اور خواتین کی وفاداری سے ظہور میں آئے، بابر کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی اور نہ اپنی ابتدائی زندگی کے سوانح جو فرغانہ کے دیہات اور کھیتوں میں، پہاڑی چراگاہوں کے قبائلی لوگوں میں گزرے تھے اسے کبھی فراموش ہوئے کیونکہ اس وقت جاہ طلب طبقہ امرا کے افراد عموماً اس کے چھپے ہوئے دشمن تھے۔ اس کی تزک میں بار بار یہ جملہ آتا ہے اور اسی سے گلبدن بیگم نے نقل کرنا سیکھا ہے کہ میرے آدمیوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ، امراء اور عوام (دونوں) تھے۔ اوائل سولہویں صدی کی دوسری خود نوشت سوانح میں تلاش کیجئے تو شاز و نادر ہی یہ جملہ آپ کی نظر سے گزرے گا۔

اگرے کے جشن عام میں ”خواجگان“ یعنی بزرگان مشائخ کی جماعت محض تبرک نظر آتی ہے۔ سمرقند کے دنوں میں بارہا بابر کو ان کا سارا ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ خواجہ کلاں جو دونوں بڑے بیٹوں کے مشیر کی خدمت انجام دیتا تھا، کابل سے بلایا گیا تھا۔ ایسے ارباب تدبیر کے مقابلے میں دیکھنا تھا کہ آئندہ اس کے فرزندوں اور دربار اگرہ میں دینی ذہنیت والوں کا کتنا دخل رہ سکے گا۔

ہندوستان کی معاشرت میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی گہری خلیج موجود تھی۔ دہلی کے لودھی سلاطین میں ہندو راجاؤں کا استبدادی مذاق آگیا تھا۔ اسلامی نہ سہی، ترکی نقطہ نظر سے ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق انوکھی چیز تھی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اسے اہل حرفہ میں تقسیم کار کا ایک عجیب طریقہ سمجھ کر روا رکھا تھا۔ مجموعی طور پر ابراہیم کی جابرانہ حرص و آز، سکندری لودھی کے مذہبی تعصب اور رانا سانگا کی نخوت کے مقابل بابر کی روا داری اور مروت نہایت نمایاں تھیں۔ بایں ہمہ پہاڑ پار کا قلندر بادشاہ ابھی تک ایسے وسائل نہ رکھتا تھا کہ اپنی تخت گاہ کے زیر انداز سے آگے تک اپنے اثرات کو وسیع و استوار کرے۔ ادھر وقت کا دھارا تیزی سے بہا جا رہا تھا۔

حکومت چلانے کے اقدامات

اگرے کے ”تماشے“ میں ایک گروہ کی غیر حاضری نمایاں تھی۔ چین تیمور، کوکلتاش، جنگ جنگ وغیرہ آزمودہ کار سپہ سالار جنہوں نے ہندوستان کی لڑائیاں جیتیں، انعام لینے کو

حاضر نہ تھے۔ انہیں سندھ کے مبہم خطے کی تسخیر اور تنظیم کے لئے جنوب مغرب میں بھیجا گیا تھا جہاں دریائے سندھ کے کنارے ریگستان بن گئے ہیں اور بے سرے دیہاتیوں کو آئے دن بلوچوں سے سخت گتھا رہتا پڑتا تھا جو لڑائی کی سن گن پاتے ہی غول کے غول چھاپے مارنے آ جاتے تھے۔ مذکورہ بالا سردار وہ لوگ تھے کہ پانچ سال پیشتر بابر کی طرف سے لاہور میں متعین رہے اور ملتان و سندھ کے اضلاع سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔

ابھی تک مصروف پادشاہ کے پاس حکومت کرنے کا آلہ صرف یہ تھا کہ فوجی سرداروں کو جاگیر دار بنا کر اضلاع میں بھیجا جاتا اور وہ اپنے لشکر سے سرکشوں کو قابو میں لا کر ایک قسم کا امن و انتظام قائم کرتے اور مال گزاری وغیرہ موصول کر لیا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بادشاہی سپاہ ابھی تک میدان میں تھی اور غیر عسکری عمال کا بھی کوئی نہ کوئی فوجی عمدہ ہوتا تھا۔ خزانچی دلی ایک لشکر کا سالار بھی تھا اور بوڑھا کتاب دار عبداللہ کنواہہ کی جنگ میں لڑنے آیا تھا۔

اطمینان سے سوچنے کی فرصت ملتے ہی بابر نے حکم دیا کہ آگرے سے براہ لاہور کابل تک کی سڑک ناپی جائے۔ ہندوستان کا یہ راستہ جس سے وہ آیا، ابھی تک یہاں کے قیام کے لئے ناگزیر زنجیر تھی اور اس کی سلامتی پر فاتح کی سلامتی کا انحصار تھا۔ سڑک کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ سب سے مقدم یہ تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنا کے ڈاک کے چھ گھوڑوں کی چوکیاں حفاظت کے لئے تیار کی جائیں۔ یہ چوکیاں جہاں بادشاہی خالصہ علاقے میں نہ تھیں، وہاں متعلقہ جاگیرداران کی تعمیر اور نگہداشت کے خرچ کے ذمے دار قرار دیئے گئے۔ ہر نئے کام کے سلسلے میں لازماً دوسری ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ سڑک کے فاصلے اور برجوں یا میناروں کی بلندی ناپنے کی غرض سے مغل عمال کو مقررہ پیمانے مہیا کئے گئے جو ہندوستان میں کابل کے پیمانوں سے مختلف تھے۔ اس ”یوں ناپو“ کے نقشے میں فاصلے کی پیمائش کا حساب قدموں سے، قدموں کا بائشوں سے، ان کا چار ایشوں سے اور آخر میں ہر انگشت کا چھ دانوں سے مقرر کیا گیا۔ ہندوؤں کے اعداد جو لاکھوں کروڑوں سے چل کر مہا سنگھ تک جاتے تھے، اول اول مغلوں کی خاصی پریشانی کا باعث ہوئے جنہیں اپنے وطن میں سیدھے سادھے سینکڑے اور ہزار ہی تک کا حساب کرنا ہوتا تھا۔ ان کے زیورات عموماً چاندی پر فیروزہ، پکھراج اور قلیل تر یاقوت کے نگ جڑ کر بنائے

جاتے تھے۔ ہندوستان اور راجستھان میں الماس، زرد اور بڑے بڑے موتیوں کی آب و تاب دیکھ کر وہ کسی قدر متعجب ہوئے لیکن ابھی اس دولت کی زیادہ حرص ان میں نہ ہوئی تھی۔ ہندوستان کے قیمتی کپڑے تن زیب، زر، سفید وغیرہ بھی انہیں کار آمد کی بجائے نمائشی زیادہ معلوم ہوئے البتہ ان کی خواتین ان کی فریفتہ ہو گئیں۔

سب سے بڑی ضرورت مواصلات کا سلسلہ قائم کرنے کی تھی اور اس باب میں مغلوں نے مقامی انتظام کو ترقی دی۔ تیز رفتار سوار ڈاک چوکی کے گھوڑوں سے کام لیتے اور باہر کے متحرک دربار کو اس کے عمال سے باخبر رکھتے تھے۔ ڈاک کا اس نے خاص عامل مقرر کیا جسے یاہول کہتے تھے اور وہ اس کے تحریری احکام بہ عجلت ہر جگہ پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔ ملک کے دوسرے آئین اور محکمے ابھی تک بد نظمی کی حالت میں تھے۔ وصول محاصل اور سکے کی بھی یہی حالت تھی اور زبان کا مسئلہ بھی کچھ کم ٹیڑھا نہ تھا۔ کیونکہ مغلوں میں مذہبی روایات کی عربی کے ساتھ ادبی اور مجلسی زبان فارسی اور زیادہ مانوس چغتائی ترکی تھی، اگرچہ اس کا اب رواج کم ہوتا جاتا تھا۔ ان معیاری السنہ کو ہندوستان میں پشتو، ہندوستانی اور راجپوت اور بنگالیوں کی زبانوں سے سابقہ پڑا اور پہاڑی اور میدانی علاقوں کی بہت سی بولیاں ملیں چونکہ فوجی چھاؤنیاں ابھی تک نظم و نسق کا بھی مرکز تھیں لہذا ان کے آس پاس وہ مخلوط مشترک بولی تیار ہونے لگی جس میں اہل عسکر فارسی اور ہندوستانی جملے ملے جملے بولتے تھے۔ اردو یا لشکر کی یہی نئی زبان شمال مغربی ہندوستان کی اردو بننے والی تھی۔ (۵۸) باہر کو جو کابل تک سب سے خود ہی باتیں کیا کرتا تھا، ہندوستان آکر ترجمان ساتھ رکھنے پڑے۔ اسی طرح نئی نئی ہنگامی ضرورتوں کے واسطے اس نے مستعد اور کارواں اشخاص کا انتخاب کیا۔ چونکہ حکومت کا باقاعدہ نظام نہ تھا۔ اس نے ذمہ داری کا ایک وقتی سلسلہ بنا لیا جیسے توپوں کا متعلق جملہ کام استاد علی قلی کی نگرانی میں تھے، اسی طرح آگرے کی عمارات میں مزدوروں پر راج کاریگر مقرر کئے اگرچہ سرکاری تعمیر کا کام ابھی بڑے پیمانے پر مشکل سے شروع ہوا تھا۔

محاصل کی وصولی میں اس کے جاگیردار سرداروں نے وہی قدیم طریقہ جو کاشتکار و زمین دار کے درمیان چلا آتا تھا، بحسن قبول کر لیا۔ کم سے کم اصول یہی تھا اور اس پر عمل ہر علاقے میں کی بیشی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اثاثہ کے مددی خواجہ جیسے بڑے جاگیرداروں کو واقعہ ”کیا مالہ ادا کیا جاتا تھا“ اس کا انحصار بارش، فصل، رعایا کی خوش حالی بد حالی اور پھر

محصل کی مستعدی پر تھا۔ دور کے (دلی) زمیندار جو اپنے دیہات کے مالک تھے، بادشاہی خزانے کو عموماً (پیداوار کا) عشر ادا کرتے تھے مگر یہ بھی اگرے سے ان کے قریب یا بعید ہونے پر منحصر تھا۔ سرحدی رئیس، امیر، سالانہ خراج بھیجتے تھے۔ یہ اکثر قلیل زر نقد رسم پوری کرنے کے لئے ہوتا تھا، جیسا کہ یوسف زئی اور افریدی قبیلوں کے سردار جو خود چھاپے مارنے میں ماہر تھے۔ لہذا بابر کی تاختوں کو نہیں بھولے تھے۔ پنجاب کو خانہ جنگی کی وبا سے نجات نہیں ملی تھی اور ملک سندھ یا مشرق میں لنگا کے دو آبوں سے ابھی کوئی مالیہ وصول نہ ہوتا تھا۔

ڈرے ہوئے لوگوں میں امن و اطمینان قائم کرنے اور بہتری کی امیدیں دلانے کی غرض سے یا جیسا کہ خود لکھتا ہے ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے بابر کو پہاڑی قلعوں سے دریا کے بیلوں تک مسلسل سفر کرنا پڑتا تھا اور لا محالہ فرماں روائی گھوڑے کے زین پر بیٹھ کر ہو رہی تھی۔ مقامی مالی نظامات کو بدستور رہنے دینے کی وجہ بھی غالباً یہ تھی کہ کسی تبدیلی سے نئی مشکلات پیدا ہو جاتیں لہذا نسبتاً کم تر خرابی کو برداشت کر لیا۔ پھر جنوبی سرحد کی حفاظت کا مسئلہ بھی طے کرنا تھا جس کی صحیح حد بندی نہیں ہوئی تھی۔ بابر نے پہلے ادھر توجہ کی۔ رانا سانگا کے بیٹے بکرماجیت سے رتننبور کا بڑا قلعہ لے لیا اور عوض میں اسے زیادہ دور کا علاقہ (باغ گزاری کے وعدے پر) عنایت کیا۔ اسی زمانے میں گوالیار کی دوبارہ سیر کی۔ یہ شہر اور قلعہ سرسبز دامن کوہ میں بلندی پر واقع اور اس کا بت خانہ مشہور تھا۔ جس میں چٹان تراش کر ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں بنائی تھیں۔

لکھتا ہے کہ ”پھلواڑی کے باغ سے سوار ہو کر ہم گوالیار کے مندر دیکھنے چلے۔ بالائی منزل میں پتھر کی کرسی ہی سے بتوں کو اوپر تک تراشا گیا ہے اور نیچے کے بت خانوں میں چٹانیں تراش کر مورتیاں بنائی ہیں۔ یہاں کی سیر کر کے میں شمالی جانب بڑے باغ میں گیا جسے رحیم داد نے ہتیاپول (ہاتھی دروازے) کے باہر بنایا ہے۔ وہاں اس نے کھانا تیار کرایا تھا۔ اس دعوت میں عمدہ عمدہ کھانے پنے گئے تھے اسی کے ساتھ چار لاکھ کی مختلف اشیاء اور زر نقد (رحیم داد نے) نذر گزارنا۔

چار شنبہ کو ہم آبشار دیکھنے گئے۔ اسے گوالیار سے چھ کوس پر بتاتے ہیں لیکن مجھے سواری میں مشکل سے اتنا معلوم ہوا۔ ظہر کے بعد ہم آبشار پر پہنچ گئے۔ یہاں پہاڑ کی چٹانوں سے پانی بہہ کر ایک حوض میں آتا ہے۔ اتنے فاصلے پر جتنی گھوڑے کی چرائی کی

رسی لمبی ہو۔ مقدار میں ایک پن چکی چلانے کے لائق۔ ہم نے آبشار کے اوپر بیٹھ کر معجون کھائی پھر ایک اور ٹکڑے پر جا کر گویوں کا گانا سنا۔ ہمراہیوں کو جنہوں نے پہلے نہ دیکھے تھے میں نے آبنوس کے درخت دکھائے..... مغرب کی نماز کے بعد ہم سوار ہو کر راستے میں ایک مقام پر دو گھڑی سوئے اور پھر دن کی پہلی نوبت کے وقت گوالیار کے بڑے باغ میں پہنچ گئے۔“

شیر ابھی تک وقت سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی رات چھت کے نیچے بسر کرتا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ گیارہ برس کی عمر سے میری دو عیدیں کبھی ایک مقام پر نہیں آئیں!

اس نے ہندوستان کو توڑنے یا بتوں کی صورتیں بگاڑنے کا اقدام نہیں کیا جیسا کہ محمود یا سکندر (لودھی) پہلے بادشاہوں نے کیا تھا۔ کنواہہ میں فتح پانے کے بعد ہندوؤں کو بھی اپنی رعایا کا ایک عنصر سمجھ کر اپنے دامن حکومت میں لینا قبول کیا (جیسا آئندہ اس کے پوتے اکبر نے) گوالیار کے مندروں کی نسبت لکھتا ہے کہ بتوں سے قطع نظر، ان کے مکانات مسلمانوں کے مدرسوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مجالس شوریٰ میں بھی اپنے امرا کے ساتھ اب ہم ”امرائے ہند“ کو شریک ہوتا سنتے ہیں۔ رتھنپور کی تحویل کے سلسلے میں اس نے خاص طور پر وہاں کے ایک پرانے ہندو ملازم کے بیٹے دیوا کو بلایا اور بکراجیت کے سفیروں سے گفت و شنید کر کے ”انہی کے طور طریق کے مطابق“ قلعہ حوالے کرنے کی شرائط طے کرنے کا کام سپرد کیا۔ انہی ایام میں ہرات کے دور دراز رشتہ داروں کو ایک خط میں تحریر کرتا ہے کہ ”باغیوں کی جانب سے ہندوستان میں اطمینان ہو گیا اور مشرق یا مغرب میں ہندوؤں کی طرف سے بھی فکر نہیں رہی۔ تائید الہی شامل حال رہی تو جو کچھ پیش نظر ہے اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن تدبیر کروں گا۔“

”ہندوستان میں ایسے خربوزے“

مذکورہ بالا کلمات شیر کے دلی یقین کا پتا دیتے ہیں۔ تمام ناجنس مقبوضات کو ایک منظم سلطنت کی شکل میں لانے کا عظیم کام انجام دینے میں لوگ اس کے شریک تھے، ان سب میں معلوم ہوتا ہے، باہر سب سے کم فکرمند تھا۔ تاہم ایک خط میں خواجہ کلاں کو اپنی دلی آرزو صیغہ راز میں منکشف کرتا ہے کہ کسی طرح کابل آنے کی فرصت مل جائے :- ”اپنی مغربی ولایت میں آنے کا اتنا اشتیاق رکھتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ ہندوستان کے

معاملات اب خاصی طرح درست ہو گئے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب خدا چاہے تو ملک میں کامل امن اور انتظام قائم ہو جائے گا۔ جیسے ہی یہ ہو گیا، میں کابل کی جانب چل پڑوں گا۔ وہاں کی راحت و مسرت کس طرح فراموش کر سکتا ہوں۔“ پھر لکھتا ہے کہ کوہستان (بدخشاں) کا خربوزہ تراشا تو وطن کی یاد اس قدر غالب آئی کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بعض دفعہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر واقعی بابر اس خیال میں تھا کہ جتنا جلد ہو سکے خواجہ کلاں اور ہمایوں سے جا ملے اور تمام مغربی لشکروں کو جمع کر کے ایک مرتبہ اور سمرقند و ہرات واپس لینے کی آخری کوشش کرے۔ یہ خیال ان لفظوں سے ناشی ہوتا ہے کہ ”جو کچھ پیش نظر ہے، اسے حاصل کروں گا۔“ لیکن ایسا قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ دو مہینے قبل سمرقند کی مہم اس نے (خواجہ کلاں کے حسب مشورہ) اپنے دو بیٹوں کے تفویض کی تھی اور غالباً اسے امید تھی کہ پوری طرح کامیاب نہ ہونے پر بھی وہ کچھ فوائد اور شہرت و ناموری حاصل کر سکیں گے۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جب ضرورت نہ رہے تو کامران کو باپ کے پاس آگرے بھیج دیا جائے۔ اس خط کی تحریر کے وقت ہمایوں واقعہ ”کوچ کر کے لب آمو پہنچ گیا تھا اور بابر نے انہی دنوں آگرے میں پہلا جشن یا تماشا کرایا تھا۔

مختصر یہ کہ بابر کے خطوں کا مطلب اسی قدر تھا جو اس نے تحریر کیا۔ وہ پھر بیمار ہوا اور درحقیقت بہت تھک گیا تھا۔ کابل کے مانوس پہاڑوں میں آنے کا اشتیاق ---- ”جو بیان سے باہر ہے“ آرام لینے کی خاطر تھا ہمایوں اور کامران دونوں کو اس نے صراحتاً ”لکھ دیا تھا کہ کابل پادشاہ کا خالصہ علاقہ ہے۔ اسے لینے کی وہ طمع نہ کریں۔ اسی کے ساتھ اپنے پسندیدہ خربوزوں سے محروم ہونے کی تلافی اس نے وہ کی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا، یعنی بلخ سے بیج منگا کر آگرے کے ہشت بہشت باغ میں کاشت کرائے اور جب وہ تیار ہوئے تو انہیں کھا کر بہت خوش ہوا۔ لکھتا ہے ”ایسے انگور اور خربوزے ہندوستان میں پا کر میرے دل کو نہایت تسکین اور مسرت ہوئی۔“

خواجہ کلاں کے اسی خط، مورخہ فروری ۱۵۲۹ء وطن کے خربوزوں کی یاد پر اشک بہانے کے بعد، یکایک وہ مزاج شناس وزیر کو کابل کی حکومت، اس کے برج و بارہ کی مرمت، باغوں کی نئی قلم بندی اور اپنے اہل حرم سرا کو ہندوستان منتقل کرنے کی ہدایتیں دیتا

ہے۔ انہی ہدایات کے درمیان ماضی کی اور یادیں، شوریدہ سرشاعر بنای (ہراتی) کا ایک لطیفہ اور مے کشی کے سرور رفتہ کا قلق بھی معرض تحریر میں آ جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ ”تم نے کابل کے حل طلب مسائل کی بابت تحریر کیا ہے۔ میں نے پوری توجہ سے غور کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ایک اقلیم میں کئی کئی حاکم ہوں تو اس کا نظام استوار نہیں رہ سکتا۔ اسی بنا پر میں نے اپنی بڑی بہن اور بیگمات کو ہندوستان بلوایا ہے (بہن سے خازنہ بیگم مراد ہے اور اس جملے سے حرم سرا کے اندر کشاکش کا پتا چلتا ہے) کابل اور اطراف کابل کو میں نے خالصہ قرار دیا اور اس کی ہمایوں اور کامران کو اطلاع دے دی ہے۔ میرے یہ خط دونوں شہزادوں کو وہ لوگ پہنچائیں جو صاحب فہم و فراست ہیں لیکن علاقے کی حفاظت اور رسد رسانی میں کسی بد نظمی کا عذر میں آئندہ سنتا نہیں چاہتا۔ اگر اب میں نے سنا کہ بالا حصار کی فسیلیں مضبوط نہیں ہیں، سامان رسد سے گودام اور نقد سے خزانہ معمور نہیں ہے تو اس کوتاہی کا الزم آں رکن سلطنت (خواجہ کلاں) کی گردن پر ہو گا۔

خاص طور پر جو کام کرنے ہیں، ان کی فہرست ذیل میں لکھتا ہوں۔ ان میں بعض امور خصوصاً خزانہ معمور رکھنے کے بارے میں پہلے بھی تم کو لکھا جا چکا ہے :-

اول : قلعہ کی مرمت۔

دوم : غلے کی بہم رسانی۔

سوم : سفیروں کے جو آتے جاتے ہیں قیام اور سربراہی کا مناسب انتظام۔

مسجد جامع کی تکمیل، کارواں سرائے، حمام کے حجروں کی مرمت نیز بالا حصار کے پیش والان کی تکمیل کے لئے جسے استاد علی حسن بھٹی کی پکی اینٹوں سے بنا رہا تھا اور جو دیوان عام کے ہم سطح نیز اسی نقشے کے مناسب ہونا چاہئے۔ ان سب کاموں کے لئے محاصل کا جتنا روپیہ مطلوب ہے، لے لیا جائے۔

مزید برآں کابل خورد کا بند، بت خاک ندی کا تنگ گزرگاہ پر پانی روک کر مکمل کیا جائے اور غزنیں کے بند کی مرمت کرائی جائیں۔

مزید برآں، خیاباں کے باغ کے لئے پانی کافی نہیں ہے۔ ایک پن پچی (آسیا) بھر، نہر ضرور اس میں کٹ کر لائی جائے۔

خواجہ بستہ کے جنوب مغرب میں میں نے نہر نکالی اور ذخیرہ آب بنا کے ہر طرف نئے پودے لگائے تھے یہاں سے ندی کے پار تک میدان نظر آتا ہے اس لئے اسے ”منظر“

کہتے ہیں۔ وہاں اچھے سے اچھے درخت لگانے اور ایسی چمن بندی کرنے کی ضرورت ہے کہ حواشی پر خوش رنگ و خوش بو پھولوں کی جھاڑیاں ہوں اور عمدہ نقشے کے مطابق انہیں نصب کیا جائے۔

سید قاسم کو تمہیں مدد دینے کے لئے مقرر کیا ہے۔ تنگیوں کو مشق کراتے رہنے میں کوئی نہ کرنا اور استاد محمد امین کی اسلحہ سازی کے کام میں کمی نہ آنے دینا۔

اس خط کے ملتے ہی بڑی بہن اور بیگمات کو کابل سے روانہ کر دو۔ دریائے سندھ تک انہیں پہنچا جاؤ۔ خط پہنچنے کے بعد ایک ہفتے سے زیادہ ان کی روانگی میں دیر نہ ہونی چاہئے۔ پوچھو کیوں؟ تو سبب یہ ہے کہ ان کو لانے کے لئے جو لشکر جائے گا، اس کا قیام بھوکے علاقے میں ہو گا اور دیر تک انتظار میں ٹھیرا تو علاقے کی خرابی کی باعث ہو گا۔

اپنے رات کے چوکیدار عبداللہ کو میں نے لکھا ہے کہ توبہ کے شاداب باغ میں آکر بھی میرا دل تشنگی کے صحرا کی یاد میں بیقرار رہتا ہے۔ قطعہ :

”ترک شراب سے سوگوار ہوں
کام کرنے کی ہمت نہیں پاتا
لوگوں کو پشیمانی ہے اور توبہ کر رہے ہیں
میں نے توبہ کی اور پشیمان ہوں۔“

”بنائی کی حاضر جوابی اس وقت یاد آئی۔ ایک دن اس نے ایسا لطیفہ سنایا کہ میر علی شیر پھڑک گیا۔ جیبہ جو پنے تھا اس میں بہت عمدہ گھنڈیاں تھیں۔ کہنے لگا، تو نے ایسا مزے کا لطیفہ سنایا کہ یہ جیبہ اتار کے تجھے دے دیتا مگر گھنڈیوں نے روک دیا۔ بنائی نے کہا، گھنڈیوں سے کیا رکاوٹ ہے، رکاوٹ تو ان کے کاجوں نے ڈالی ہے۔۔۔۔۔ راست و دروغ برگردن راوی۔۔۔۔۔ خدارا دگلی سے برا نہ مان جانا۔ وہ قطعہ بھی جو اوپر نقل کیا، سال بھر پہلے میں نے لکھا تھا۔ توبہ کرنے کے بعد دو سال تک بزم شراب کے لئے میرا دل لوٹا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس برس یہ خیال بد دل سے دفع ہوا۔ شاید یہ حضرت خواجہ (احرار) کی کتاب نظم کرنے کی برکت ہے۔ تم بھی کیوں نہیں شراب چھوڑ دیتے؟ یاران عزیز کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا ایسا ہی پر لطف ہے جیسی ان کی صحبت۔ لیکن تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے والا کون رہ گیا ہے؟ اگر شیر حیدر اور علی قلی جیسے ہم نشین ہیں، تو شراب کشی پر لعنت بھیجتا

کچھ دشوار نہ ہونا چاہئے! باقی بہت بہت سلام اور شوق ملاقات۔

(آخر میں) یہ خط پنج شنبہ کو لکھا گیا۔ کیا کیا خیال آتے رہے کہ ضروری ہدایتوں کے درمیان اتنی بہت سی اور باتیں شامل کر دیں۔ زبانی پیاموں کے ساتھ، خط شمس الدین محمد کو دیا اور رخصت کیا۔ وقت شب، پنجشنبہ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خط، شیر کی اپنے پرانے وطن کو خیر یاد کہتا تھی۔ اگرچہ خیر باد کہتے وقت دل کڑھ رہا تھا لیکن بظاہر اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان سے کبھی واپس نہ جا سکے گا اور زندگی کا خاتمہ بھی قریب نظر آتا تھا۔ ماہم اور اپنی بہن، بیٹیوں کو اس نے بلا تاخیر آگرے آنے کا حکم دیا گو کہ یہ سفر پورا کرنے میں انہوں نے بہت دیر لگائی۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہندال جسے بابر نے دیکھا نہ تھا، وہ بھی ہمایوں کے پاس بدخشاں میں رہا۔ اس خط کے لکھتے وقت بھی بابر اپنے معمول کے مطابق عاجلانہ کوچ کر رہا تھا کہ مشرق میں نئے دشمنوں کے مقابل عسکری کی امداد کریں۔

گنگا میں کشتی رانی

ابھی بارشیں ہو رہی تھیں۔ بعض دفعہ اندھیری چھا جاتی اور ہوا خیموں اور جنگل کے درختوں پر ایسے تھپڑے مارتی جیسے کسی جادوگر نے اسے انتقاماً لہکا دیا ہو۔ بابر کبھی کبھی افیون، نیز معجون کے نشے سے دل بہلاتا ہوا برابر کوچ کرتا رہا کہ گنگا کے پار مختصر عسکری سے جا ملے اگرچہ ایک دن اسے گھوڑے کی بجائے پاکی میں سفر کرنا پڑا۔ آگے چل کر وہ اکثر چٹائی کشتیوں میں راستہ طے کرتا جو فوج کے ہمراہ چڑھے ہوئے دریاؤں میں لائی جا رہی تھیں۔ چند بڑی توپیں اور ارابہ دار زنبوریں بھی انہی بار برداری کی کشتیوں میں چڑھائی گئی تھیں۔

”سہ شنبہ کو ہم نے کوچ کیا۔ لشکر گاہ کے سامنے ایک ٹاپو سے دریا میں سبزہ زار نظر آیا۔ میں کشتی میں سیر کو گیا اور پہر گئے واپس آیا۔ یہاں دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ میں سوار ہو کر بے خبر جا رہا تھا کہ گھوڑا چٹنی ہوئی زمین سے گزرا یکایک زمین دھنسی، میں اچھل کر کنارے کے رخ کودا۔ گھوڑا بھی نہیں دھنسا لیکن، اگر میں زین پر بیٹھا رہتا تو شاید وہ اس کراڑے کے اندر دھنس جاتا۔ آج ہی میں نے تیر کر گنگا پار کی۔ ہاتھ گنتا گیا۔ تینتیس ہاتھ میں پار ہوا اور دم لئے بغیر واپس تیر آیا اور سب دریا پہلے تیر کر میں نے پار کئے تھے“

سوائے گنگا کے۔

ایک رات پہلا پھر گزرا اور (بہ تصحیح مترجم) تراویح کی نماز ہو چکی تھی کہ ایک ایکی دل بادل اٹھے اور ایسا طوفان آیا کہ خدا کی پناہ۔ میں اس وقت دربار کے خیمے میں لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کاغذ اور کتاب کے اجزا سمیٹ سکوں، خیمہ پیش چوبہ سمیت مجھ پر آپڑا۔ خدا نے مجھ بچایا اور کوئی چوٹ نہیں آئی۔ کتاب کے اجزا سب بھیگ گئے۔ انہیں جمع کرنے میں بڑی دقت اٹھائی پھر انہیں چوکے کے بندے پر بچھایا اور اوپر کبلی ڈال دیئے۔ کوئی نیم ساعت میں طوفان فرو ہوا تو میرے سونے کا خیمہ پھر نصب کیا گیا اور شمع روشن کی۔ بڑی مشکل سے آگ جلائی گئی۔ میں رات بھر نہ سویا۔ صبح کی نوبت پہنچنے تک کتابوں کے اجزا اور اوراق سکھانے میں مصروف رہا۔“

اس پریشان کن طوفان کے آنے سے چند روز ہی قبل حسن اتفاق سے خواجہ کلاں نے عرضی بھیج کر یہ خلاف معمول سی درخواست کی تھی کہ ”وقائع“ بابر کی پوری نقل اسے کابل ارسال کی جائے۔ یہ بادشاہ کے اور کوئی احوال و وقائع نہیں ہو سکتے، غالباً ترک ہی مراد ہو گی۔ بابر نے لکھا ہے کہ اس نے خود ”ایک نقل کی تھی“ وہ خواجہ کلاں کے پاس ارسال کی۔

چڑھی ندیوں کے پار کوچ جاری تھا مگر اس میں بھی سرکاری ہرکارے بلخ تک کی دور دراز سرحدوں کی خبریں لاتے رہتے تھے۔ تبریز سے سفیر آنے کی نیز ماہم کے منزل بہ منزل بڑھنے کی اطلاعات اسی کوچ میں ملتی رہیں۔ البتہ تاکید کے باوجود ہمایوں نے کوئی خط باپ کو نہیں لکھا۔

شیر کا بری اور دریائی لشکر نئے، دشوار گزار علاقے سے بنارس پر بڑھ رہا تھا۔ ”نمننا“ اس نے ایک افغان سردار شیر خاں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی ملازمت میں آیا پھر دغا دے کے نئے باغیوں سے جا ملا۔ (یہ شیر خاں وہی تھا جو آئندہ سنین میں شیر شاہ کے نام سے مشہور اور مغلوں کا نانی گرامی حریف بلکہ ہمایوں کے حق میں اسی قدر خوفناک ثابت ہوا جیسا شیبانی، بابر کے واسطے بلائے جان ہو گیا تھا) ایسی ناگوار خبروں سے اسے کچھ پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ سرسری احکام نافذ کئے کہ دو ترکش بند دستے ترک اور ہندی سرداروں کے ماتحت جنگ جنگ کے بیٹے کے ہمراہ یورپ کے لوگوں کی ہمت بندھانے شاہی فرمیں لے کر جائیں۔ بڑے بڑے مغل سپہ سالار مخ چین تیمور مغرب میں چھوڑ دیئے تھے۔ معلوم ہوتا

تھا کہ آخر پادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں قوت آ جانے پر اعتماد ہو گیا اور اب وہ دشمن کی کثرت تعداد کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کوچ کے بعض واقعات کا مزہ لے لے کے ذکر کرتا ہے۔ جیسے ایک شیخی خور پہلوان کا ہر ایک سے کشتی لڑنے کا دعویٰ کرنا اور پہلی ہی پکڑ میں پکھڑ جانا۔ تاہم بابر نے دل وہی کے لئے اسے بھی انعام دیا۔ ہاتھیوں کا حلقہ بنا کے شیر و کرگدن کے شکار کو جانا اور سارا جنگل چھاننے کے باوجود کوئی شکار نہ ملنا۔ ایک عثمان لی ترک بھنسیوں کا نیا علاج تجویز کرتا ہے کہ مروجوں کو جوش دے کر بھاپا کیا جائے۔ بابر نے یہ عمل کیا تو بڑی چمراہٹ محسوس کی (اگرچہ فائدہ ہوا) کشتی میں ایک مگرچہ آ پڑتا ہے اور دیکھنے دکھانے کے لئے گرفتار کیا جاتا ہے۔ گل نیلوفر کا کھلنا سن کر اس کے تالاب پر بادشاہ گیا کہ بیچ لائے۔ ندیوں کے سنگم پر دشمن کے علاقے میں اس طرح داخل ہوا جیسے نئی جگہ کی سیر کو جاتے ہیں۔

ہمارا لشکر کرم ناس ندی کے کنارے اترا۔ کہتے ہیں ہندو اس کے پانی کو چھونے سے وہم کرتے ہیں۔ اسے پار کرنے کی بجائے گنگا کے کنارے کنارے سامنے سے نکل جاتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس ندی کا پانی جس کسی کو لگ جائے اس کا ”کرم“ یعنی نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ نام رکھا ہے۔ میں کشتی میں بیٹھ کر اس ندی کے اندر دور تک گیا پھر واپس آکر گنگا کے شمالی کنارے پر کشتیاں ٹھیرا دیں۔ لشکر میں پہلوانوں کی خوب کشتیاں ہوئیں۔ میرے ساتی محسن نے دعویٰ کیا کہ ایک ایک کر کے چار پانچ سے لڑوں گا۔ پہلے کو تو اس نے دبا لیا مگر دوسرے سے بیٹھنی کھائی۔ بہت شرمندہ ہوا۔“

بار بار علیل ہونے اور سخت درد کی تکلیف اٹھانے، آندھی طوفان آنے کے باوجود جس میں اسے روزنہاچہ تک لکھنا دشوار ہو جاتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ بابر کس اطمینان کے ساتھ جملہ امور پر قابو رکھتا ہے۔ سیاسی داؤ بیچ کرنے میں پہلے اناڑی تھا، اب خوب ماہر ہو گیا ہے۔ مقابلے میں مشرقی افغان حریفوں کے لشکر بڑے ہیلے سرداروں کے زیر قیادت تھے جیسے سلطان بایزید، محمود خاں برادر ابراہیم لودھی اور تازہ وارد شیر خاں (سوری)۔ لیکن بابر ان سب کو گھیرتا۔ کھدیڑتا چلا جاتا تھا۔ اس کے اعلانات مقامی لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ پادشاہی لشکر میں بھرتی ہوں اور باغی جتھوں سے افغانی سردار برابر ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے اردو میں چلے آ رہے تھے۔ چنار، بنارس، غازی پور جہاں سرکشوں کا جہاد ہوا تھا، اب سب زیر تلکس آ چکے تھے۔

پھر بھی اصلی خطرہ آگے آ رہا تھا۔ نصرت شاہ والی بنگال و بہار نے آگرے کے جشن میں تحائف بھیج کر اظہار دوست داری کیا تھا لیکن اب بنگال اور بہاری فوجیں لگنا اور گھاگرا کے مقام اتصال کے اوپر جمع ہو رہی تھیں کہ پہلے پسا ہونے والے لودھی افغانوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکیں لیکن جب نصرت شاہ نے (جسے بابر ”بنگالی“ لکھتا ہے) بایزید، محمود خاں اور شیر خاں کو اپنے لشکر گاہ میں باریاب کیا تو بابر سمجھ گیا کہ اب بنگالی سپاہ باغیوں کے تعاقب میں میرے آگے بڑھنے میں مزاحم ہو گی۔ بایں ہمہ اسے ان سب متحدہ حریفوں کا سامنا کرنے سے بھی منہ پھیرنا منظور نہ تھا۔ یوں وہ جنگ کرنی نہ چاہتا تھا۔ اس نے نصرت شاہ کو لکھا کہ ”میرا خاص مقصد امن و صلح ہے۔“

مگرچ یہ ہے کہ اس کا دلی مقصد کچھ اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ اپنے تیسرے سیزدہ سالہ فرزند عسکری کو (جسے پچھلے دونوں سپہ سالاری کا توغ و علم دے کے آگرے سے بھیجا تھا) اسی قسم کی ناموری سے ہم کنار کرائے جیسی ہمایوں کو پانی پت کی جنگ میں میسر آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عسکری کے واسطے کوئی معرکہ جیتنا ضروری تھا اگرچہ وہ پانی پت جیسی خونریز جنگ لڑنی نہ چاہتا تھا اور اپنی مخلوط فوج پر جو نوجوان سپہ سالاروں کے ماتحت تھی، غالباً زیادہ اعتماد بھی نہ رکھتا تھا۔

بہر حال دریاؤں کے سنگم پر اس نے وہ مقصد پوری طرح حاصل کر لیا جس کا خواہاں تھا اور کامیابی بھی اس کمال اور آسانی سے پائی گویا مغل فوج تھی کہ خود اس کے بنائے ہوئے ٹانگ کے مطابق اداکاری کر رہی تھی۔

عسکری کے واسطے نیک شگون

جاسوس، بنگالی سپاہ کی تعداد و اسلحہ کی خبریں لائے کہ مغلوں سے زیادہ بھی ہے اور مستعد پیادہ فوج کے ساتھ آتشیں اسلحہ سے بھی مسلح ہے جو غالباً تجارتی بندرگاہوں پر پر گیزیوں سے خریدے گئے تھے۔ طلائے کے سواروں نے اطلاع دی کہ اتحادی حریفوں نے دو دریاؤں کے سنگم کے پیچھے مضبوط مورچے بنائے ہیں اور کناروں کی زمین دھنسی، میدانوں کھیتوں میں کچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے گھوڑوں کے لئے اچھی نہیں حالانکہ مغلوں کا بھروسہ سوار فوج پر ہی زیادہ تھا مگر لڑ کر دریا پار کرنے میں وہ خوب منجھے ہوئے تھے۔ یہ بات نصرت شاہ کو معلوم نہ ہو گی مگر اس کے لودھی حلیفوں نے تو شاید خبردار کر دیا

ہو گا۔

تیز رو گھاگرا کے گنگا میں مگر نے کے مقام پر پہنچنے سے پہلے بابر نے کئی دن یوں گزارے کہ پھیر کھا کے ایک مقامی بزرگ (منیری) کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا اور مضعل گھوڑوں کو چھانٹ کر پیچھے بھیجا کہ سستا کے، کھلا پلا کے تازہ دم کئے جائیں۔ خود بھی تندرست نہ تھا، لہذا ایک کشتی میں مقیم رہا جس پر دید بانی عرشہ بنایا گیا اور ”آسائش“ موسوم کیا تھا۔

عسکری کا لشکر گنگا کے دوسرے یعنی شمالی کنارے کوچ کر رہا تھا اور بابر دائیں کنارے پر تھا۔ لہذا مقام جنگ پر ملنے کی غرض سے فوجوں کو کشتیوں میں اتار کر اس مثلث میں جمع کیا گیا جو گھاگرا اور گنگا کے اتصال پر بنا ہوا تھا۔ چونکہ دشمن مثلث کی راس پر خیمہ زن تھا اس لئے مغلوں کے حق میں یہ موقع سازگار نہ تھا۔ بنگالیوں کی عظیم لشکر گاہ ایک مورچہ بند ٹاپو کے پیچھے تھی اور دریا کے کنارے ان کی کشتیوں کا بیڑا پھیلا پڑا تھا۔ سنگم کے آس پاس سے، جالہ بانوں نے بابر کو بتایا کہ گھاگرا یا گنگا کو پایاب عبور کرنا ممکن نہیں۔ پادشاہ نے عسکری کی سپاہ کو دریا سے دور رکوا دیا اور اپنے لشکروں کو لئے ہوئے کنارے تک بڑھ آیا۔ چند روز تیاریوں میں گزرے۔ فوج والوں نے استاد علی رومی کی بڑی توپ ”غازی“ اور دوسری چھوٹی توپوں نیز تنفکیوں کے واسطے دھس دھسے ندیوں کے سنگم پر بنائے۔ استاد مصطفیٰ کو گنگا کے جنوبی کنارے پر دوسرے دھسے بنانے کا کام سپرد ہوا جہاں سے زنبورکیں اور توڑے دار ہندوقیں دشمن کے بیڑے اور ٹاپو پر آتش باری کر سکتی تھیں۔ جب ادھر ادھر باڑیں چلنی شروع ہوئیں تو بابر نے عسکری اور تمام سرداران سپاہ کو بلا کر شورٹی کیا۔ اس نے کہا ”یہاں دریا اترنے کی جگہ اچھی نہیں ہے پس ہماری قلیل فوج یہاں انتظار کرے گی اور بڑے لشکر کو اوپر جا کر ہلدی گھاٹ سے گھاگرا کو عبور کرنا اور پھر بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ میں خود دو لشکروں کو لے کر مثلث کے زاویے میں ٹھہروں گا۔ ایک کے مورچے دوسرے کے عقب میں رہیں گے اور عسکری کو چار لشکر دے کر (یعنی دو تہائی سپاہ سے) دو تین میل اوپر کے رخ بھیجا جائے گا کہ گھاٹ سے پار اتر جائے، جہاں پایاب جگہ تھی یا گھاگرا کا پاٹ کم اور کشتیوں کو پار کرنا آسان تھا۔ گھاٹ پر کشتیاں پہلے سے جمع کی جا رہی تھیں۔ مگر دشمن ابھی تک ہلدی گھاٹ کے سامنے نظر نہیں آیا تھا۔

”جب تک عسکری دشمن سے ملاقی ہو، استاد علی قلی اور استاد مصطفیٰ اپنی بڑی توپ، زہور کوں اور ”فرنگیوں“ (چھوٹی توپ کا نام) سے اور ہندو قوتوں سے برابر غنیم کو اپنی طرف متوجہ رکھیں گے۔ توپیں لگا کے پار گولے چلاتی رہیں گی اور ہم تیار اور منتظر رہیں گے کہ عسکری کی سپاہ نزدیک پہنچ جائے تو خود بھی دریا اتر کر دشمن پر جا پڑیں۔

پہلے دن صبح کے وقت دریاؤں کے آر پار گولہ باری شروع ہوئی تو بابر سے اپنی بڑی توپوں کی کارگزاری دیکھے بغیر نہ رہا گیا۔ لکھتا ہے کہ ”میں سوار ہو کر کوئی کوس بھر عین سنگم کے زاویے پر گھوڑے سے اترتا اور استاد علی کی چھوٹی توپوں کی باڑیں چلتی دیکھ کر خوش ہوا۔ اس نے پھر کے گولوں سے دو کشتیوں کو نشانہ بنایا جو ٹوٹ کر ڈوب گئیں۔ مصطفیٰ نے بھی اپنے مورچے سے ایسا ہی کیا۔ میں نے حکم دیا کہ بڑی توپ بھی صف جنگ میں لائی جائے اور کئی سیال مدد دینے کے لئے مقرر کئے۔ پھر پڑاؤ کے قریب ایک ٹاپو پر جا کر معجون کھائی..... دوسری صبح ”بہادر“ نام کی کشتی میں بیٹھ کر گولہ اندازی کے موقع تک گیا اور ہر ایک کو اپنے کام پر لگایا۔ نماز ظہر کے قریب ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ بڑی توپ میں گولہ بھر لیا گیا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟ میں نے حکم دیا اسے تو داغ دو اور دوسرا گولہ بھر کر میرے آنے تک ٹھہرو۔ پھر نماز عصر کے قریب ایک بنگالی ڈونگے میں بیٹھ کر دمے تک گیا اور استاد کے ایک بڑا گولہ اور دوسرے چھوٹے گولے چلانے کا معائنہ کیا۔ بنگالی بھی توپ چلانے میں شہرت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں اس کا امتحان لیا لیکن دیکھا کہ وہ کسی خاص نشانے پر گولہ نہیں مارتے، جہاں تہاں چلاتے رہتے ہیں۔“

اس عرصے میں عسکری کی سپاہ گھاگرا کو شمال میں پار کر آئی تھی اور دریا میں جا بہ جا کشتیوں کی آویزشیں ہو رہی تھیں۔ بنگالیوں نے یہ کوششیں بھی کیں کہ لڑکر دریا کے پار بابر کی فوج سے آہٹیں ادھر بابر نے انہیں پیچھے دھکیلنے کے لئے دستے پر دستہ دوڑایا اور حکم دیا کہ بڑھتے ہوئے دوسری طرف عسکری سے جا ملیں۔ اس عمل سے مغل سپاہ کا زور ہلدی گھاٹ یعنی شمال کی جانب ہوتا چلا گیا۔ تیسری صبح سویرے سویرے یہ خبر جس کا بابر کو اشتیاق تھا، آگئی کہ مغلوں کی گولہ باری اور دوسری طرف کشتیوں کو جنگی تدبیر سے لڑانے کی بدولت دشمن کا سارا بیڑا ہماؤ کے رخ نیچے بھاگ رہا ہے۔ ”ہماری (یعنی عسکری کی) تمام سپاہ دریا کے پار اتر گئی، کوئی باقی نہیں رہا اور اب سب بنگالی سوار اس کے مقابلے کو نکل آئے ہیں۔“ اسی لمحے بابر کشتی چھوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور جملہ سرداران سپاہ کو

حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے سب کے سب بلا تاخیر دریا کے پار ہو جائیں۔ وہ بھی عجیب نظارہ ہو گا کہ صبح کی مدھم روشنی میں سپاہیوں کے جوق در جوق چٹی کشتیوں میں لد لد کر اور سوار ڈوگلوں میں سوار گھوڑوں کو پانی میں تیراتے ہوئے دریا اتر رہے تھے۔ لاہوری اور ہندوستانی (پیادے) تیر تیر کر یا نرسلوں کے مٹھوں کی مدد سے پانی میں چل کر پار ہوئے۔ بابر کے الفاظ میں ”کوئی ناشدنی واقعہ نہ ہوا۔“ ایک سپاہی کو اس نے دیکھا کہ تیرنا نہیں جانتا، گھوڑے کی ایال کے سہارے پار ہوا۔

تاہم دوسرے کنارے پر اتنا آسان کام نہ تھا۔ بنگالی اژدہام کر کے آگئے تھے کہ آنے والی کشتیوں اور طرح طرح سے دریا پار کرنے والوں کو کنارے پر روکیں اور چڑھنے نہ دیں۔ بابر اپنے ایک سردار کی تعریف کرتا ہے کہ کس طرح چند سواروں کو لے کر اترا اور گھوڑے پر چڑھ کر پیادہ بنگالیوں کے ہجوم پر ہتھا جا پڑا کہ اتنے میں اس کے ساتھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ بارے دریا اترنے کی یہ برجستہ چال چل گئی مغلوں نے دوسرے کنارے پر قدم نکال لئے۔ بابر نے یساول دوڑا کر حکم بھیجا کہ ”سب ٹکڑیاں یکجا ہو کر غنیم کے بازو پر حملہ کریں۔ اس کی صفوں میں در آئیں۔“

یہ واقعہ بجائے خود قریب قریب خرق عادت تھا کہ سوار سپاہی دریا کے پار جا اترے جہاں ان سے بڑی تعداد میں پیادے آتشیں اسلحہ لئے موجود تھے۔ پھر اترنے اور صفیں باندھ کر نصرت شاہ کے بازو اور عقب میں حملہ کرنے سے انہیں کون روک سکتا تھا جس کی اصل سپاہ عسکری کے لشکروں کا مقابلہ کرنے چلی جا رہی تھی۔

بابر جانتا تھا کھیل کا خاتمہ کس طرح ہو گا۔ بنگالے کی فوج پر جو تین طرف سے ضرب لگی تو بے تحاشا چوتھے کھلے رخ سے بھاگی۔ لودھی خاندان کے سلاطین بنگالے کے پرچم چھوڑ کر جان سلامت لئے فرار ہوئے۔ بابر اپنی کشتی میں پلٹا کہ اب اس پر سوار ہو کر مفرور دشمن کے خیمہ و خرگاہ کا معائنہ کرے۔ پھر دریا کے پار آئے۔ لکھتا ہے ”میں نماز ظہر کے لئے وضو کر رہا تھا کہ میرے سردار واپس آئے۔ میں نے ان کی تعریف کی اور انعام و عنایات کا امیدوار بنایا۔ عسکری بھی آیا۔ یہ اس نے پہلا معرکہ دیکھا تھا۔ شگون اچھا ہوا۔“ ”زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بعض افغان رئیس اظہار اطاعت کے لئے حاضر ہوئے۔ نصرت شاہ کے اطمینان خاطر کی غرض سے اسے لکھ بھیجا کہ میرا مقصد خاص بھی امن و صلح ہے اور اب حالات سازگار ہیں، شرائط صلح طے ہو سکتی ہیں۔ چند روز میں شاہ بنگال کے دو

موقع شناس اپہی آئے اور بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ نصرت شاہ آپ کی شرائط ماننے کے لئے تیار ہے۔ قریب قریب انہی دنوں میں چین تیمور سلطان کا قاصد پیام لایا کہ بلوچیوں کو دریائے سندھ کے مغرب میں دور تک دھکیل دیا گیا اور اب وہ دریا سے کوئی چھ سو کوس دور ہٹ گئے ہیں۔ اس طرح مشرق اور مغرب دونوں سروں کی جنگ انجام کو پہنچی۔ اب ہندوستان کا بادشاہ بلا حجت تمام شمالی ہند کا مالک تھا اور اس کا حریف کوئی نہ رہا تھا۔ بابر اقرار کرتا ہے کہ چیں تیمور کی اطلاع سن کر ”بڑی خاطر جمع ہوئی۔“

”شبشب واپسی“

اب اس نے بلا تاخیر آگرے کی جانب باگ موڑی۔ بارش ختم ہو گئی تھی لیکن طوفان پر طوفان آتے رہے گنگا کے کنارے ادھر ادھر پہنچے کچے سرکشوں کا قلع قمع کرنا اور بایزید اور لودھی سلطان کے تعاقب کا کام باقی تھا۔ مگر بابر کو آگرے کی لو لگی تھی جہاں بیٹیاں اور ماہم اب پہنچنے والی تھیں۔ گریزا باغیوں کا پیچھا کرنے کا فرض اس نے عسکری اور مشرقی سپاہ کے دوسرے سپہ سالاروں کے تفویض کیا۔ ایک موقع پر یہ سن کر کہ ان میں سے کوئی دریا کی طغیانی دیکھ کر پار جانے سے ٹھکتا ہے، بابر نے فوراً عتاب آمیز تاکید حکم بھیجا ”جس طرح بن پڑے، دریا کو اتر جاؤ۔ مقابلہ بڑی تعداد سے ہو تو دوسروں کو اپنے ساتھ لو مگر کام کرنے میں ہرگز سستی اور بے دلی نہ دکھاؤ۔“ اسی قسم کا حکم اس نے گنگا اور گھاگرا اترنے کے وقت نافذ کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں خود اس کا طرز عمل تیس برس سے ایسا ہی رہا تھا۔

راستے میں پھر ندیاں، دریا طے کرنے تھے جو ان دنوں طغیانی پر تھے۔ اس سفر میں روزانہ بھی کسی کسی دن اختصار سے ہی لکھا جاسکا۔ پھر بھی کہیں کہیں ذاتی کوائف آ جاتے ہیں۔ جیسے اقامتی کشتی ”آسائش“ میں کچھ وقت گزارنا۔ ختم ماہ رمضان پر گھٹا کی وجہ سے نیا چاند دکھائی نہ دینا۔ ایک ٹاپو پر رات کو ٹھیرنا جہاں سیلاب آ گیا اور دوسرے ٹاپو پر جانا پڑا۔ ایک جگہ دہاتیوں کا شعلیں جلا کے مچھلیاں خالی ہاتھوں سے پکڑنے کا تماشا جس میں بابر شریک ہوا اور خود بھی ایک مچھلی ہاتھ سے پکڑی لکھتا ہے :

”اس علاقے کی طرف سے ہماری خاطر جمع تھی لہذا ہم سہ شنبہ کو راتوں رات آگرے چلے اور ایسی تیزی سے چلے جیسے چھاپہ مارنے جاتے ہیں۔ صبح تک سولہ کوس طے

کر کے دوپہر کالپی کے پرگنے میں آرام لیا۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام ہوتے چل پڑے اور تیرہ کوس طے کر کے تیسری گھڑی رات بہادر خاں کے مقبرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر سویا، صبح کی نماز سویرے سے پڑھ کر پھر عاقلانہ چل پڑے۔ دن ڈھلے تک سولہ کوس چل کر اوداؤہ جا لیا۔ یہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی۔ پھر بھرات گزری تھی کہ پھر چل پڑے راستے میں تھوڑی دیر سونے کو ٹھیرے اور پھر دوپہر تک چل کر راپری میں دوپہر کو آرام لیا۔ ظہر کے بعد (ہفت بجنے کو) سترہ کوس طے کر لئے اور رات کی دوسری نوبت بجتے بجتے آگرے کے ہشت بہشت باغ میں گھوڑے سے اترے۔

جمعے کی صبح بخشی سلطان محمد اور دیگر عمائد حاضر ہوئے۔ نماز جمعہ پڑھ کر میں نے جتنا کو عبور کیا اور قلعے میں داخل ہوا اور پھوپھوں سے جا کر ملا۔

بلخ کا ایک کاریزی خربوزے کاشت کرنے پر مقرر کیا تھا۔ آج وہ چند خربوزے لایا۔ چھوٹے ہیں مگر بہت اچھے نکلے۔ ایک دو آکستانوں میں جو میں نے ہشت بہشت میں لگائے تھے، انگور بھی بہت عمدہ ہوئے۔ شیخ گھورن نے انگور کا ٹوکرا مجھے بھجوا دیا۔ یہ انگور بھی برے نہیں ہیں۔ ہندوستان میں ایسے خربوزے اور انگور پیدا ہونا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ہفتے کو آدھی رات کے وقت اطلاع آئی کہ ماہم آ رہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ کابل سے وہ (اور بیٹیاں) اسی روز چلی تھیں جس روز میں پورب کو فوج لے کر روانہ ہوا۔ ”اس طرح دو منزلہ سہ منزلہ کر کے باہر نے پچھلے ۳۸ گھنٹے میں ۱۵۶ میل طے کئے اور اہل و عیال کا خیر مقدم کرنے آگرے پہنچ گیا، جنہوں نے کابل سے آنے میں پانچ مہینے لگائے۔

یہاں پھر تزک منتشر یادداشتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اور تاریخیں بھی صرف کہیں کہیں دی گئی ہیں۔ ان میں چین تیمور کے عین اس وقت کہ کشتیاں ہو رہی تھیں آتا مذکور ہے اور یہ کہ گوالیار کے حاکم رحیم داد پر بے وفائی کا شبہ ہونے سے قریب تھا کہ باہر خود ادھر چل پڑا گو خلیفہ نے اسے باز رکھا۔ ماہم کے ہمایوں کی طرف سے ہدیہ لانے کا ذکر آتا ہے لیکن اس کے سوا ہمایوں یا ہندال کی نسبت کچھ تحریر نہیں بنے بڑے بھائی نے (باپ کی بغیر اطلاع) بدخشاں بلوا لیا تھا۔

تزک میں آخری اندراج ۷ ستمبر ۱۵۲۹ء (۳- محرم ۹۳۶ھ) کا یہ ہے: ”رحیم داد کی بداعمالی کو معاف کر دیا گیا۔ اس کی جگہ شیخ گھورن (جو نیلوفر کا بیٹا اور تازہ انگور لایا تھا) اور

نور بیگ گوالیار بھیجے گئے کہ وہ وہاں کا انتظام ان کے سپرد کر دے۔ آئندہ جو کچھ پیش آیا، وہ گلبدن یا خواند میر وغیرہ مورخوں کے ہاں ملتا ہے۔ خواند میر ہندوستان کی عظیم تر سلطنت کے پادشاہ کی سرپرستی میں آ رہا تھا۔ گلبدن ان دنوں باپ کے پاس تھی اور خاندان کے واقعات کو آخری مہینوں میں اہل حرم نے جس طرح مشاہدہ کیا، وہ کیفیت اسی خاتون کے ہمایوں نامہ سے نقل کی گئی ہے۔

”خاندان میں موت آتی ہے“

گلبدن کو اس نئی دنیا اور نئے دربار میں آکر باپ کے ملنے سے جو بے پایاں خوشی ہوئی تھی، اس کا نقش برابر دل پر قائم رہا اگرے کے طول طویل سفر میں جب کہ فوجی بدرقہ ساتھ تھا۔ ننھی گلبدن کو بادشاہ کے سامنے جانے سے بہت خوف رہا لیکن جب سے اس نے اٹھا کر اپنی گود میں لیا اس وقت سے، ایک ہفت سالہ بچے کے جملہ معصوم جذبات کے ساتھ وہ باپ سے وابستہ ہو گئی۔ اسے پدرانہ شفقت کی نئے وطن میں مانوس و مستقل ہونے تک ضرورت بھی تھی۔ وہ اپنی ماں دلدار بیگم اور بھائی ہندال سے جدا کر لی گئی اور ماہم کے زیر تربیت تھی۔ اب اگرے میں ماہم سب سے بڑھ کر دو نئی آنے والیوں کے پیچھے پڑی رہتی تھی جو گورے رنگ کی چرکس کنیریں تھیں اور محل میں کھلے بال اچھالتی پھرتی تھیں۔ وہ ماہم کی زیادہ پروا نہ کرتی تھیں کیونکہ بادشاہ کی منظور نظر تھیں اور کسی معمولی آدمی نے نہیں، ایران کے شاہ ہمسپ نے انہیں بابر کے پاس بھیجا تھا۔ گلنار اور نارگل ان کے نام بھی طرفقی سے خالی نہ تھے۔ رات کو ان میں سے ایک یا دوسری پادشاہ کی طلبی پر اس کے حجرے میں چپکے سے آ جاتی تھی۔

مگر ان کنیروں پر پیچ و تاب کھانے سے بھی ماہم کی توجہ دوسری پریشانیوں سے نہیں ہٹ سکتی، جن کا گلبدن پورا اندازہ نہ کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے فرزند ہمایوں کے اگرے میں موجود نہ ہونے کی فکر کھائے جاتی تھی۔ کئی سال میں شوہر کو دیکھا تو مسلسل جنگ و سفر کے باعث اسے بہت مضطرب پایا اس کے بار بار بخار آ جانے کا، پھر مریحوں کے بھپارے سے سوزش ہونے کا سن کر نہایت مشوش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس حال میں وہ بزرگوں کے اقوال نظم کرتا تھا۔ ایک اور تشویش یہ کہ دوسری بیوی کے فرزند عسکری پر خاص نظر عنایت ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ غرض شوہر کے بارے میں یہ سب توہمات

ماہم کو اندیشہ مند کرتے تھے۔ قیام کابل کی ساری مدت میں وہ حرم سرا کی تنہا مالکہ رہی تھی، اب اس کی خاطر پر آگندہ اور وہم پرست ہونے کی وجہ سے چار سال پہلے بچے کے مرنے کا غم بھی نہیں بھولی تھی، پس وجدانی طور پر اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ نئی شان و عظمت خاندان پر کسی آنے والی مصیبت کی نشانی ہے۔ خود بابر ایسا کوئی خطرہ محسوس نہ کرتا تھا۔ ادھر گلبدن ان باتوں کو مشکل سے سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے جلیل الشان باپ کو، کچھ کر ہی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی مگر ماہم کے عتاب کے خوف سے اسے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ کم سے کم ایک مرتبہ اس نے ماہم کو اپنے بادشاہ باپ پر بھی اعتراض کرتے سنا اگرچہ وہ بے نتیجہ رہا۔ لکھتی ہے کہ ”قیام آگرہ کے سارے زمانے میں میرے والد کا معمول تھا کہ ہر جمعے کو اپنی پھوپھوں سے ملنے جاتے تھے (جو بیوی بچوں کے آنے سے پیشتر آگرے آگئی تھیں) ایک دن سخت گرمی تھی۔ حضرت بیگم نے بیقرار ہو کر کہا ”آج ایسی لو چل رہی ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس جمعے آپ ان کے پاس جانا ناغہ کر دیں؟ وہ ہنسکیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھیں گی۔“ والد حضرت نے کہا ”ماہم، تعجب ہے تم ایسی بات کہتی ہو۔ میری پھوپھوں کے باپ رہا نہ کوئی بھائی۔ میں بھی ان کی خاطر داری نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟“

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کابل سے دوسری شاہی خواتین، مع خانزادہ بیگم اور بی بی مبارکہ نئے دارالسلطنت میں پہنچ گئیں۔ بابر نے پہلے سے اطلاع دی اور انتظام کر دیا تھا مگر ان کی آمد بھی ماہم کی تسکین و تقفی نہ کر سکی۔ گلبدن لکھتی ہے ”کابل سے شہزادیوں کے آنے کی خبر آئی تو والدہ حضرت میری بڑی پھوپھی اور اپنی بڑی بہن اور عزیز ترین خاتون (خانزادہ بیگم) کے شایان شان استقبال کے لئے نئے حمام تک خود پیشوائی کرنے گئیں۔ انہی کے خیمے میں دوسری آنے والی بیگمات پادشاہ کا آداب بجالانے حاضر ہوئیں۔ سب نہایت مسرور و شاد تھیں۔ شکر کے سجدے ادا کئے اور پھر سب مل کر آگرے روانہ ہوئے۔ پادشاہ نے ہر ایک کو حویلیاں عنایت کیں“ مگر خانزادہ آگرے کے نئے ترک و احتشام میں زیادہ دن نہیں رہی بلکہ اپنے محرور المزاج شوہر مہدی خواجہ، حاکم اثادہ کے پاس چلی گئی۔ تاہم بابر نے اسے بھی دوسری بیگمات سمیت خود ساتھ جا کر اپنی زیر تعمیر عمارتیں اور آگرے کا وہ حصہ دکھایا جسے ”کابل“ کا نام دیا گیا تھا۔ گلبدن کے ذہن میں تو یہ آیا کہ اس کا باپ جسے پہلی دفعہ ہوش میں دیکھا، عجیب سے عجیب کام کر سکتا ہے :-

”آگرے میں دریا کے دوسری جانب اس نے حکم دیا کہ محل سرا اور باغ کے درمیان ایک سنگین محل خود اس کے لئے تعمیر کیا جائے..... ایک دن وہ ماہم بیگم اور اس حقیر کنیز دھول پور لے گئے جہاں پہاڑ کی چٹانوں میں انہوں نے کوئی سات قدم عرض کا حوض ترشویا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا تھا کہ بن جائے تو اسے شراب سے بھرواؤں گا۔ لیکن چونکہ رانا سانگا کی جنگ سے پہلے شراب پینی ترک کی، لہذا عرق لیمو سے اسے بھروایا تھا۔

سکری میں (آخری میدان جنگ کے قریب) اعلیٰ حضرت نے ایک بڑا تالاب بنوایا، اس کے بیچ میں چبوترہ تھا۔ یہ تیار ہو گئے تو وہ جا کر چبوترے پر بیٹھتے یا اس کے گرد کشتی رانی لطف اٹھاتے تھے..... سکری کے باغ میں ایک شاندار (دو منزلہ) بارہ دری بنوائی جہاں بیٹہ کر وہ اپنی کتاب لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نیچے کی منزل میں اپنی افغانی دایہ کے ساتھ میر بیٹھی تھی کہ میری والدہ (ماہم بیگم) نماز کے لئے گزریں میں نے دایہ سے کہا مجھے اٹھا، اس نے جو ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو جوڑ جگہ سے اتر گیا۔ مجھ میں طاقت نہ رہی اور بے اختیار روئے گئی۔ فوراً استخوان بند بلایا گیا اور جب تک اس نے جوڑ نہیں بٹھا دیا بادشاہ وہاں سے نہیں گئے۔

باپ کی اس رحم دلی کی کہ جب تک اس کی پٹی نہیں بندھی، وہ وہاں سے نہیں گیا، یا کے ساتھ گلبدن اس کی ماندگی کو یاد کرتی ہے :-

”چند روز بعد وہ (شاہی معافی کے) باغ زر افشاں کی سیر کرنے گئے۔ اس میں وضہ کرنے کا حوض بنا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے ”میرا دل حکومت اور فرماں روائی سے بھر گیا ہے۔ میں تو گوشہ نشین ہو کر اس باغ میں آ رہوں گا۔ رہے نوکر تو ایک طاہر طشت بردار میرے لئے بالکل کافی ہو گا۔“

یہ سن کر ماہم اور ہم سب بچوں کا بہت دل دکھا اور سب نے آب دیدہ ہو کر کہا خدا آپ کو زانہ دراز تک صحیح سلامت رکھے۔ اور بیگم نے کہا خدا آپ کے بچوں کو آپ کے بعد عمر دراز عطا کرے۔“

اس واقعے سے کچھ پہلے ہمایوں یکایک والدین کے پاس آ گیا تھا۔ کس طرح اور کس تاریخ آیا، یہ بات پادشاہ کی تزک یا اس کی بیٹی کی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ عجب نمیر بابر نے بیٹے کی وارفتہ مزاجی سے حسب معمول اغماض برتا ہو۔ دور کاشغر میں میرزا حیدر نے سنا (ممکن ہے خود ہمایوں سے) کہ ہمایوں کو باپ نے آگرے کا حکم دیا تھا۔ ایک اور

مصنف بابر کی طرف سے اس ملاقات کا واقعی یا خیالی حال اس طرح لکھ گیا ہے:-
 ”میں اس کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ وہ آگیا۔ اس کو دیکھ کر ہمارے دل بھر آئے، آنکھیں چپکنے لگیں۔ میرا دستور تھا کہ روزانہ دسترخوان پر لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتا۔ لیکن اس روز ہمایوں کے آنے کی خوشی میں اور اس کی عزت افزائی کی غرض سے میں نے بڑی ضیافت کی۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے باتیں کرنا اور اس کو جوان رعنا دیکھنا، حقیقت میں عجیب مسرت کا باعث ہے۔“

یہ بابر کے الفاظ نہ ہوں تو بھی ابتدا میں حیران رہ جانے کے بعد اس نے ہمایوں سے کمال عنایت کا برتاؤ کیا۔ وہ اپنی ولایت چھوڑ کر بلا اجازت آگرے چلا آیا تھا۔ یہاں بابر نے دو آبے کا نہایت زرخیز پرگنہ سنبھل اسے دیا جہاں سے ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں نظر آتی تھیں اور ادھر آگرے سے گھوڑے پر دریا دریا دو دن کی مسافت پر تھا اسی کے ساتھ ہمایوں کے حسب مذاق الگ تھلگ بھی تھا جہاں اس نے اپنے مصاحبوں کا علیحدہ حلقہ بنا لیا۔

لیکن میرزا حیدر لکھتا ہے کہ دس سالہ ہندال کو بابر نے بدخشاں سے واپس بلا لیا اور یہ ولایت سمرقند نژاد کے امیر لاغری کے فرزند سلیمان کے تفویض کر دی۔ ایک زمانہ پہلے جسے لوگ بھول چکے تھے۔ اس نے میرزا حیدر سے کہا تھا کہ ”سلیمان کو میں اپنے بیٹے کی مثل خیال کرتا ہوں۔“ حیدر نے جو اس موقع پر یہ درینہ قول نقل کیا تو شبہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اصل بیٹے کی نافرمانی کا خیال تھا۔ بہر حال ماہم کی خاطر یقیناً جمع ہو گئی کہ ہمایوں ہندوستان میں اس کے اتنے قریب آگیا تھا جہاں سے ہر طرح کی خیر خبر ملنی آسان تھی۔ بایں ہمہ خاندان پر جس مصیبت کا ماہم کو خطرہ تھا وہ نہیں ملا۔ سرد کوستانی علاقے سے ہندوستان کے گرم و مرطوب میدانوں میں آنے والوں میں بیماری پھیلی ناگزیر تھی۔ بابر کو بار بار بخار اور پیچش ہوتی تھی۔ گلبدن کی ماں دلدار بیگم کا بچہ جسے ماہم نے لے لیا تھا، موت کا پہلا شکار ہوا۔ یہ زرافشاں باغ میں بابر کی مایوسانہ گفتگو پر اہل محل کے رنج و غم کرنے کے چند روز بعد کا واقعہ ہے۔ گلبدن بیگم بیان کرتی ہے: ”تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ شہزادہ انور بیمار پڑا۔ اس کے امعاء میں خرابی آگئی تھی اور حکیموں کی سعی و تدبیر کے باوجود بیماری بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ وہ دنیا سے عالم بقا کو سدھارا۔ والدہ حضرت (ماہم) کو نہایت رنج ہوا۔ اور دلدار بیگم جس کا وہ اکلوتا فرزند تھا، غم و ماتم سے بے خود ہو گئی۔

اس کی نالہ و زاری کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے والدہ اور دوسری بیگمات سے کہا کہ ”چلو ہم لوگ دھول پور کی سیر کر آئیں۔ وہ تفریحاً کشتی سے روانہ ہوئے۔ بیگمات نے بھی درخواست کی کہ انہیں بھی کشتیوں میں لے جایا جائے۔“

دلدار کے کئی بچے تقدیر نے چھٹوا دیئے تھے۔ یہ اکیلا جو رہ گیا، اسے اجل نے چھین لیا۔ ادھر اسی زمانے میں خبر آئی کہ ماہم کا بھی اکیلا سلامت ماندہ فرزند ہمایوں شدت گرما سے بیمار پڑ گیا۔

بابر کی دعا

ملک میں گرمی بلائے بد کی طرح چڑھتی چلی آتی تھی۔ محلات میں بیگمات دریا کنارے سایہ دار احاطہ بند باغوں میں سرچھپائے پڑی رہتی تھی۔ لیکن باہر بادشاہ حسب معمول گشت میں مصروف تھا۔ کبھی وہ سلیمان کو ولایت بدخشاں جانے کی ضروری ہدایتیں دیتا اور کبھی سرحد چین کے مغل نژاد خوانین کے پاس ضروری مراسلات بھیجتا اور انہیں گرد و پیش کے خطرات سے خبردار کرتا تھا تاکہ وہ سلیمان میرزا کی مدد کرے اور کبھی لاہور کے پتے میدانوں میں مڑ جاتا یا کسی فساد کے فرو کرنے پر متوجہ ہو جاتا تھا۔ کامران کے قدھاری سیاہلوں کو باریاب کرتا اور پھر سرہند کے پار، جہاں گذشتہ سلاطین کا بڑا قلعہ تھا، کسی قدر ٹھنڈی بلندیوں پر جا کر شکار کھیلتا تھا۔ یہیں سے کشمیر کی مہم تیار کرتا اور پھر آگرے پلٹ کر اپنی کتاب کی نظر ثانی یا سیکری کے باغ کے تالاب میں کشتی رانی سے دل بہلاتا تھا۔

گوشہ گزریں اوٹھتی بیگمات کو دہلی کے ایک خط نے چونکا دیا۔ (گلبند لکھتی ہے کہ) ”اسی وقت مولانا کا خط آیا جس میں تحریر تھا کہ شہزادہ ہمایوں سخت علیل ہو گئے ہیں۔ بیگم حضرت فوراً دہلی تشریف لے آئیں۔ شہزادے کو بڑی نقاہت ہو گئی ہے۔“

رقعہ لانے والے نے بتایا کہ مشیر و ندیم مولانا علیل شہزادے کو دریا کے راستے دہلی لا رہے ہیں والدہ حضرت کو یہ خبر سن کر نہایت تشویش ہوئی اور بے قرار ہو کر فوراً دہلی روانہ ہوئیں۔ جیسے پیاسا کنوئیں کی تلاش میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ لیکن راستے ہی میں تھیں کہ متھرا پر شہزادے سے ملائی ہوئیں۔ ان کی تجربہ کار نگاہ میں وہ اس سے زیادہ بیمار و کمزور تھا، جتنا بتایا گیا تھا۔ متھرا سے ماں بیٹے، بی بی مریم و مسیح کی طرح آگرے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچنے پر یہ حقیر کنیز اپنی بہنوں سمیت حاضر ہوئی اور اس سراپا کوئی شہزادے کے بستر عیال

کے سامنے لائی گئی۔ وہ روز بروز زیادہ زیادہ کمزور ہو رہے تھے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی زبان محبت آگئیں سے فرمایا: ”بہنو، جیتی رہو، آؤ مجھ سے گلے ملو۔ مدت لمبے میں تم سے نہیں ملا۔“ دو تین دفعہ انہوں نے سراٹھا کر یہی الفاظ کہے۔

جب اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور بیماری دیکھی تو ان کا گفتگو چہرہ افسردہ ہو گیا اور معلوم ہوتا تھا ان پر خوف طاری ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر والدہ حضرت کئے لگیں ”آپ میرے بیٹے کی فکر نہ کریں۔ آپ بادشاہ ہیں، بادشاہوں کو غم نہیں ہوتا۔ خدا نے آپ کو اور بیٹے دیئے ہیں۔ ہاں میں غمگین ہوں کہ میرا یہی ایک بیٹا ہے۔“

اعلیٰ حضرت نے جواب دیا، ”ہاں ماہم میرے اور بیٹے ہیں مگر وہ ہمایوں نہیں ہیں۔ جو میرا بھی ایسا ہی فرزند ہے جیسا تمہارا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اور خدا اس کی خوشیاں بر لائے اور زمانہ دراز تک اسے سلامت رکھے، کیا میں نے سلطنت دوسروں کو چھوڑ کر اسی کے نام نہیں کر دی۔ دوسرے اس کی برابری نہیں کر سکتے۔“

اطبا اپنی جی کوششیں کرتے رہے لیکن ہمایوں کو افاتہ نہیں ہوا۔ ماہم اور دیکھ بھال کرنے والی خواتین کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ مرض دوا دارو سے نہیں جائے گا۔ اب اس کی مرگ و زیست کا سوال تھا اور اس کا فیصلہ صرف خدائے عزوجل ہی کر سکتا تھا۔ بیمار کے نیم تاریک کمرے میں یہ خواتین چپ چاپ بیٹھ کر دعائیں کرتی تھیں کہ شہزادے کو تکلیف نہ ہو۔

ایک دن، شنبہ تھا جب کہ باہر نے میسوں کو رخصت کیا اور اس علاج کی تیاری کی جس کا دوا کی بجائے صرف خدائے قادر سے واسطہ تھا۔ اس کی قوم میں ایک عقیدہ چلا آتا تھا اور اتنا قدیم تھا، بلکہ اس سے بھی قدیم تر جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی جناب میں بیٹا قربان کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ یہ خدا سے رحم کی التجا میں شفاعت پیش کرنے کا طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی سب سے عزیز چیز، حتیٰ کہ فرزند اکبر کی قربانی دے تو رحمت الہی کا امیدوار ہو سکتا تھا۔

بیرونی دیوان خانے میں اہل عقل و فراست بادشاہ سے حجت کرتے تھے کہ یہ بہت پرانا عقیدہ ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی نذر یا قربانی کا فائدہ کیا ہو گا؟ اس کی بجائے ان بزرگانِ مشائخ نے خاص طور پر وکالت کی کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے (۹۹) اسے جتنی کامل کر دیا جائے تو ضرور موثر ہو گا بعض مشیروں نے عرض کیا کہ بادشاہ اگر ایسا عمل کرنا

ہی چاہتے ہیں تو جواہرات میں سب سے بیش بہا ہیرا ”کوہ نور“ صدقہ کر دیں۔ بابر نے کہا۔
 ”میں خدا کی جناب میں پھر نذر نہیں کروں گا۔“

(گلبند بیگم تصدیق کرتی ہے کہ) ”اس سہ شنبہ کو اور آئندہ دنوں میں پادشاہ نے
 ہمایوں کے گرد طواف کیا اور دعا مانگتا رہا۔ بار بار سر اٹھاتا اور (بہ تصحیح مترجم) خدا کی رحمت
 و کرم کے واسطے ریتا تھا۔ کمال خضوع اور خشوع قلب سے دعائیں کرتا تھا۔ موسم شدید
 گرم اور پادشاہ کے قلب و جگر میں حدت تھی۔ چھپر کھٹ کے گرد طواف کرنے میں وہ اس
 قسم کے الفاظ کہتا جاتا تھا: ”بار اللہ! اگر جان کے بدلے جان قبول ہو، تو میں ظہیر الدین بابر
 اپنی جان اور زندگی اپنے فرزند ہمایوں کی جان کے عوض پیش کرتا ہوں۔“

کمرے میں دوسرے لوگوں نے بابر کو یہ کلمہ با آواز بلند کہتے سنا کہ ”میں نے (بیماری)
 لے لی، لے لی، لے لی۔“ گلبند کا بیان ہے کہ اسی شام سے پادشاہ کمزور اور بیمار ہو گیا اور
 اس کے برعکس ہمایوں کے سر پر پانی رکھا تو وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ گرمی کی
 عقوبت اور بیمار کے کمرے کی تاریکی میں عورتیں خاموش بیٹھی دعا کر رہی تھیں اور کچھ ان
 کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بابر کی قربانی پیش کرنے کا کیا انجام اور کونسا زیادہ الم ناک انجام
 برداشت کرنا ہو گا؟

ہمایوں شفا یاب ہو گیا اور چند روز بعد باپ کے حکم سے اپنی جاگیر پر سنبھل واپس گیا۔
 لیکن بابر کو پھر آگرے سے باہر جانا نصیب نہ ہوا۔ جن درباریوں کی آنکھیں ادھر لگی ہوئی
 تھیں، انہوں نے مشاہدہ کیا کہ اس کا بخار عود کر آیا اور اس نے علاج معالجے کی کوئی تدبیر
 نہیں کی۔

تاہم لوگوں کو یاد تھا کہ بارہا پادشاہ بخار کے حملے، امعا کی خرابیاں جھیل چکا ہے۔ کتنی
 ہی دفعہ بستر علالت سے اٹھ کر سوار ہوا۔ گنگا کو تیر کر پار کیا، یا کسی نئے باغ کو دیکھنے نکل
 گیا ہے۔

ادھر کبوتروں کی طرح جنہیں وجدانی حس اپنی کالکوں کی طرف کھینچ لاتی ہے، سلطنت
 کے بڑے بڑے امرا، سپہ سالار و سردار اطراف و اکناف سے کوئی نہ کوئی عذر نکال کر اپنا
 مقام چھوڑ کر آگرے چلے آ رہے تھے۔ چین تیور، بوڑھا تروی بیگ، ہندو بیگ اور کئی
 دوسرے، دیوان عام کے ایک جلسے میں جمع ہوئے، جہاں بابر شریک نہ تھا۔ ہمایوں کے غیر
 مستقل حکمران ہونے کی باتیں ہوئیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ باپ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی

ہے۔ لیکن بابر کی اس دعا کے بعد کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہمایوں کو ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ پھر وہ پرانا قضیہ زیر بحث آیا کہ خواجہ کلاں کی طرح ایک جماعت کی رائے میں مرکز حکومت کا بل رہنا چاہئے تھا اور دوسرا گروہ بادشاہ کے اس فیصلے کا پابند تھا کہ دارالسلطنت آگرہ ہی بنایا جائے گا۔ سخت پریشانی میں خلیفہ نے بعض امرا کو بتایا کہ ہمایوں ناعاقبت اندیش، قوت ارادی کا ضعیف اور صرف بابر کے بل بوتے پر چلتا رہا ہے۔ کیا اس کے احکام کی دوسرے تعمیل کریں گے؟ پھر خود ہی تجویز کیا کہ اس شہزادے کو قدیم ولایات میں بھیج دینا اور کسی صاحب عزم و ہمت کو ہندوستان کا فرماں روا بنانا مناسب ہو گا اور ایسا کوئی شخص ہے تو وہ شہزادی خانزادہ بیگم کا شوہر مہدی خواجہ ہے۔ لیکن جب مہدی کو بزم شوریٰ میں بلایا گیا تو اس نادان جنگ جو نے ثابت کیا کہ وہ شیر کی کھال میں گدھا تھا۔ بہ طریق راز امیروں سے کہنے لگا کہ ”میں بادشاہ ہوا تو پہلا کام یہ کروں گا کہ اس بڑھے سر ملتے خلیفہ کو جو سلطنت کا ستون بنا بیٹھا ہے، نکال باہر کیا جائے گا۔“ اس پر خلیفہ کو اس کی حمایت سے کانوں پر ہاتھ دھرنے پڑے۔

امراء انتظار میں تھے کہ شاید بابر کے افاقے کی خبر سنیں۔ لیکن (گلبدن لکھتی ہے) ”جب اس کی حالت رومی ہوتی گئی تو ہمایوں کو بلانے کے لئے قاصد بھیجا گیا۔ یہ شہزادہ کالنجر چلا گیا تھا۔ پیام ملتے ہی بہ سرعت آگرے آیا اور پادشاہ کی خدمت میں آداب بجا لایا۔ اسے بھی نظر آگیا کہ باپ کس قدر کمزور و ناطاقت ہو گیا ہے۔ تیمارداری کرنے والوں سے بار بار پوچھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی اتنی جلدی یہ کیا حالت ہو گئی، اتنے کمزور کس طرح ہو گئے؟ ٹیبوں کو ہلا کر بھی اس نے یہی سوال کیا کہ ”میں بادشاہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟“

”ادھر میرے والد حضرت برابر دریافت کر رہے تھے کہ ہندال کہاں ہے؟ چند روز میں کسی نے آکر عرض کیا کہ شہزادے کا اتالیق بردی بیگ حاضر ہے۔ میرے باپ نے مضطربانہ اسے بلوایا اور پوچھا ”ہندال کہاں ہے، وہ کب آئے گا؟“ بردی بیگ نے عرض کیا حضور کے فرزند دل بند دہلی پہنچ گئے ہیں، آج ہی یا کل باریابی کا شرف حاصل کریں گے۔ پادشاہ نے خفگی سے فرمایا ”ارے نامراد، مجھے معلوم ہے تو نے لاہور میں اپنی شادی رچائی اور اسی کے راگ رنگ میں میرے بیٹے کے آنے میں اتنی دیر ہوئی اور میں برابر اتنے دن انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا۔ اچھا یہ تو بتا ہندال کا قد اب کتنا نکل آیا ہے، وہ کیسا معلوم ہونے لگا

ہے؟“۔ وہ شیخ نے کہا: ”اگرچہ میں نے اس کو دیکھا ہے، مگر میں نے اس کو نہیں پہچان لیا۔“

اس اتفاق سے بروی بیگ شہزادے کا دیا ہوا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دکھا کر اعلیٰ حضرت نے عرض کیا کہ یہ جامہ شہزادہ سلامت نے اپنے خادم کو عطا کیا ہے۔ تب بادشاہ نے اسے اور نزدیک بلایا اور برابر کتے رہے ”دیکھو تو سہی وہ کتنا بڑا اور کتنے قدر قامت کا ہوا گیا ہے؟“ اور یہ بھی کہے جاتے تھے کہ وہ کب آئے گا؟“

غیر حاضر شہزادے کی فکر کرتے باز کا دھیان نگین اور اس کی بڑی بہنوں کی طرف گیا۔ اس نے دو سپہ سالاران سے شادی کے لئے نامزد کئے اور خانزادہ بیگم کو بلوایا کہ وہ بھی ان رشتوں کی تائید کرے۔

آخر ایک دن اس نے اپنے تمام بڑے امراء کو طلب کیا اور ان سے اس قسم کے کلمات کہے:

”میرے دل میں تھا کہ سلطنت ہمایوں میرزا کے حوالے کر کے خود باغ زر افشاں میں گوشہ نشین رہوں خدائے کریم کے فضل سے میرے دل کی بہت مرادیں پوری ہوئیں، ہوائے اس خواہش کے۔ لیکن اب مجھے مرض نے دیا لیا ہے۔ میں تم سب کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد ہمایوں کو بادشاہ تسلیم کرو، اس کے وفادار آپس میں متحد رہو۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ ہمایوں بھی حسب دلخواہ کام کرے گا۔“

پھر اس نے علیحدہ ہمایوں سے یہ بات کہی: ”تمہارے بھائیوں کو میں تمہاری حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ ان سے اخلاص و محبت اور ہماری رعایا کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا۔“

ہم خاندان والوں اور حرم سرا میں جب یہ خبر آئی تو سب کے حواس جاتے رہے۔ رونا بیٹھا مچ گیا۔

اس کے تیسرے دن اس نے ملک بٹا کی راہ لی۔ انتقال اتوار (۲۵)۔ دسمبر ۱۵۳۰ء مطابق ۳ جمادی الاول ۹۳۷ھ کو ہوا۔ مردوں نے خانزادہ بیگم اور میری ماؤں کو یہ کہہ کر اطباء آئیں گے باہر بلوایا اور پھر ہم سب کو بڑے محل میں واپس پہنچا دیا۔ اس یاس و غم کے دن ہر ایک کو نے میں منہ چھپائے پڑا رہا۔“

وقائع مابعد

جیسا کہ گلبدن بیگم نے آخری دن کی کیفیت میں اشارہ کیا ہے، کچھ دیر کے لئے باہر کی وفات کو مخفی رکھا گیا۔ خاندان کے لوگ اور بڑے امراء کو اندیشہ تھا کہ اس خبر کو سن کر عوام فساد برپا نہ کر دیں۔ پھر گلبدن لکھتی ہے: ”آرائش خاں نے جو ہندوستان کا امیر تھا سب سے کہا کہ انتقال کو چھپانا مناسب نہیں ہے۔ ورنہ یہاں کے بازاری شیعہ کہیں گے کہ بادشاہ پر کوئی آفت آگئی اور جیسی یہاں والوں کی عادت ہے چوری، لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ خدا خواست بے خبر مغلوں کے مکان انہوں نے لوٹے تو بہت برا ہو گا۔ بہتر ہے کہ ہم کسی کو سرخ لباس پہنا کر ہاتھی پر سے اعلان کرائیں کہ بادشاہ نے ترک دنیا کر کے خلوت اختیار کی اور بادشاہی ہمایوں بادشاہ کے حوالے کر دی۔“

اس رائے پر عمل کیا گیا۔ بظاہر باپ کی وفات کے وقت ہمایوں اگرے میں نہ تھا لیکن تیسرے دن زرافشان باغ میں اس نے دربار عام کیا اور بے شمار سکے لوگوں میں پھجھوڑ کئے۔ ان حالات میں وراثت کا کوئی قضیہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ بڑے امرا شاہی وراثت کی روایت پر قائم رہے، جیسے خود باہر کے معاملے میں اندجان میں عمل کیا گیا تھا اور مغلوں کی پسند کو اہل ہند نے بھی تسلیم کر لیا۔ ہندال جس کا باہر کو اتنا سخت انتظار اور فکر تھی، آخر اگرے پہنچ گیا۔ قدحار کو کامران اور کابل کو خواجہ کلاں نے پوری طرح قابو میں رکھا۔ خواجہ نے اپنے آقا کی وفات پر ایک غم ناک قطعہ بھی لکھا تھا۔ خازنہ بیگم کے زیر اثر اہل حرم بھی شروع میں نہایت متحدر رہے اور ہمایوں نے باپ کی خواہش پر کہ بھائیوں پر اعتماد اور ان کی شایان شان کفالت کی جائے، حرف بہ حرف، عمل کیا۔ وزیر سلطنت خلیفہ کی وفاداری آخری مہینے میں مشکوک ہو گئی تھی۔ اس کا ہم آئندہ نام نہیں سنئے اگرچہ اس کے بیٹے سرکاری عہدوں پر مامور رہے۔

غرض سارے خاندان اور طاقتور امراء میں جس قسم کی ہم آہنگی اور یکت جتنی اس موقع پر دیکھی گئی ایسی سو لوہیں صدی کے اوائل میں ایشیا اور ایشیائی دنیا یورپ کے وقائع میں

بھی شاذ و نادر مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ یہ چند سال بعد کا واقعہ ہے جب کامران کا ہمایوں سے تنازع ہوا اور لائق اور خطرناک شیرشاہ نے ہندوستان میں بغاوت کر کے ہمایوں کو نکال باہر کیا اور اسے پہلے کابل، پھر ایران جا کے شاہ طہماسپ صفوی کی پناہ لینی پڑی۔ گلبدن جو اپنی اصلی ماں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مارے مارے پھرنے میں ہمایوں کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی دوبارہ ہندوستان آئی جہاں واپس آکر ہمایوں کا انتقال ہوا اور گلبدن بیگم نے اس کا اور اپنے باپ کا تذکرہ ”ہمایوں نامہ“ تحریر کیا۔ لیکن ہمایوں کے سوانح کتاب کے موضوع سے خارج اور ہندوستان کے مغل سلاطین کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

شیر کی قبر کچھ عجیب طرح محفوظ رہی۔ پہلے وہ آگرہ کے ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ شہر آفاق روضہ ممتاز محل کے عین مقابل میں تھا۔ نو سال تک قبر وہیں رہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بابر نے خواجہ کلاں یا دوسروں کو اس بارے میں ضروری ہدایتیں کر دی تھیں اور جب ہمایوں اور مغل دربار ہندوستان سے دھکیل دیئے گئے تھے، بی بی مبارکہ آگرے آئی اور اپنے شوہر کی باقیات کو بہ حفاظت دروں کے راستے کابل منتقل کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ وہاں بابر کی پسندیدہ تفریح گاہ میں قبر بنا دی گئی۔ یہاں چنار کے جھنڈ سے بالا حصار اور دوسری طرف میدانوں کے پار بنمان کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں قبر کے چٹپے تعویذ کے قریب ایک چشمہ بہتا ہوا کابل ندی تک گیا ہے۔ اوپر بغیر دیوار کے پتلے ستونوں پر چھت ڈال دی ہے۔ مگر پہلے چھت نہ تھی۔ ٹیکرے کے نیچے شاہجہاں نے چھوٹی سی مسجد بنوائی تھی۔ قبر پر سنگ مرمر کی لوح اور کتبہ جہانگیر نے لگایا۔ ٹیکرے کی ڈھلانون پر خاکی چٹانوں، کالی یا خودرو پھول کی جھاڑیوں کے سوا کوئی آرائش نہیں نظر آتی۔ موجودہ کابل شہر سے درختوں اور بالا حصار کی پھاڑی نے اس مقام کو اوجھل میں کر دیا ہے۔ قبر کے باغ کو رحلت گاہ بابر کے سادہ نام سے پکارتے ہیں۔

بابر نے ۳۸ برس کی عمر پائی، جس میں ۳۶ برس حکومت کی۔ سرقند کی بادشاہی بیس برس تک جدوجہد کرنے کا باوجود ہاتھ سے نکل گئی تو اس نے ہندوستان میں نئی سلطنت کی بنا ڈالی مگر اس کی شان و شوکت دیکھنے کو زندہ نہیں رہا۔ مغل سلاطین اعظم کی یہ سلطنت نوجوان اکبر کی ۱۵۵۶ء میں تخت نشینی کے بعد ہی منظم و استوار ہو سکی۔ تاہم عہد اکبری میں وہ اسی راستے پر چلی جس کی داغ بیل بابر نے ڈالی تھی۔

شیر نے کابل و کشمیر کو کوہستانی فصیلوں کے پار پنجاب کی ندیوں اور گنگا کی وادیوں سے

ملا کر ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور اسی ضمن میں لودھی سلاطین اور راجپوت راجاؤں کی جاگیرداری جتھوں کے ساتھ مذہبی تفریق و منازعت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس نے ممالک ہند میں فرماں روا کے واحد کا اقتدار جو بہت مدت سے تابو ہو چکا تھا، ازسرنو بحال کیا اور اپنی سلطنت کو ماضی کی بجائے مستقبل کا سوچنے کی فکر و نظر عطا کی۔ مقامی روایات اور مالی نظام بحال رہنے دیئے لیکن نظم و نسق کی باگ بادشاہ کے وزیروں کے ہاتھ آگئی۔ خود بادشاہ کی ذات ان سے ماورائی رہی تاکہ عمال کی بے لاگ نگرانی اور انصاف کر سکے۔ بادشاہ پر قلندری کی جو چھاپ لگی تھی، وہ بابر سے اکبر کو متواتر ہوئی۔

بابر کا طرز عمل کہ جنگ و فتح کے وقت کمال سفاکی اور اس کے بعد غیر معمولی عفو و رواداری، بڑے بڑے منگول خوانین کی روایات کی جھلک دکھاتا ہے۔ غازان، منگو، قبلائی نے بھی اسی طرح حکومت کی تھی۔ اکثر کہا گیا ہے کہ ممالک یورپ کے بادشاہوں نے ”کریم النفس جاہلوں“ کا جو کردار پیش کیا، بابر ان سے ایک صدی پیشتر اس کا نمونہ بنا تھا۔ بابر ہمہ اس کے افعال عموماً اس کی شخصی صفات کے منظر تھے۔

وہ اپنے ساتھ تیموریوں کا نغمہ و شعر۔۔۔۔ اور شراب کا ذوق ہندوستان میں لایا۔ ایسے ایسے مقامات پر جہاں کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا، بابر نے بیسیوں باغ تیار کرائے اور اسی شیفٹگی کی بدولت ”شاہ باغ ساز“ کے خطاب کا مستحق ہوا۔ سایہ دار و شمرور درختوں کے علاوہ اور عمارات بھی اس کے پیچھے پیچھے اُگرے تک آئیں جہاں جہاں سے مغلوں کے قدم گزرے وہاں سنگ سرخ و مرمر کے محلات۔ بڑی بڑی مسجدیں اور مقبرے نمودار ہونے لگے۔ بابر تو یہ منظر دیکھنے کے لئے زیادہ نہ جیا، لیکن اس کا گمشدہ وطن سمرقند، ہندوستان میں اٹھا لایا گیا۔

اسی دور میں دوسری سرزمینوں میں نئی نئی سلطنتوں کی بنا پڑ رہی تھی، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ہمہی طاقت اور زبردستی کی بجائے تہذیب و تمدن کا گھر تھیں۔ ازبک خوانین سولہویں صدی کے آخر تک سمرقند پر قابض تو تھے لیکن وہ اپنے منگول اسلاف کی فطرت پر چھائیں رہ گئے تھے۔ اصلی خانہ بدوش صحرائی میدانوں میں ہٹے چلے جا رہے تھے۔ سولہویں صدی کے چھٹے عشرے میں جب اکبر کی امن رواداری کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، صفوی شاہوں اور عثمانی سلاطین کے مابین بھی صلح ہو گئی۔ ادھر شمال میں کنار والگا کے شہر تازان سے آخری تاتاری خوانین کو ماسکو کے آئی ون المعروف بہ ”دہشت ناک“ کی توپوں

سے نکال باہر کیا۔

وسط ایشیا کے شہ سوار تیر اندازوں کی ہزار سالہ برتری کا خاتمہ ہوا اور نہ صرف پہلی مرتبہ بلکہ ہمیشہ کے لئے تہذیب کے آلات جسمانی بدوی قوت پر غالب آ گئے۔

وسط صدی کے عبوری دور ہی میں جب تو کا قدم ایشیا کے محفوظ گوشوں تک آیا۔ فرنگی آنکھوں نے تبت کی پہاڑی، فصیلیں مشاہدہ کیں۔ پھر نورد پادری چین کے دروازوں میں داخل ہوئے۔ تاکہ یقین سے معلوم کریں کہ منچو سلطنت میں تو اس ”کیتھے“ (خطا) کا کوئی اثر آثار باقی نہیں، جس کی کیفیت مارکو پولو نے تحریر کی تھی۔ ایک صاحب عزم انگریز انتھونی بکنن موسکو سے مشرق میں چلتے چلتے سرقد کی کاروانی شاہراہ تک پہنچ گیا۔ عثمانی ترکوں نے جو شہر سو سال پہلے نصاریٰ سے چھینا تھا اب وہاں لندن و پیرس کے سفارت خانے قائم ہوئے اور انہوں نے اسے ”سلیمان عالی شان“ کا دربار کہنا شروع کیا۔

۱۶۰۰ء کے آتے آتے انگریزوں کی نئی بحری سلطنت کے مجلس تاجر ہرنگیزوں اور ولندیزیوں کے پیچھے لگے ہوئے مغلوں کے دربار تک پہنچنے والے تھے اور بابر کی ساختہ سلطنت میں ان کی پذیرائی ہونے والی تھی۔ صدی کے اسی آخری سال میں معزز (ایسٹ) انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے بنی تھی جس نے آگے چل کر سارے ملک ہی کو اپنا مقبوضہ بنا لیا۔ تاہم یہ آرمیبل کمپنی اس مشرقی مقبوضہ کی روایات اور گوناگوں معاشیات بدلنے کی کوشش میں اتنی کامیاب ہونے والی نہ تھی جتنی شیر سرقد کو اس حکمت عملی کی بدولت نصیب ہوئی کہ رعایا کو اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔

بابر کا اپنی قلم کا لکھا ہوا ترک کا نسخہ معدوم ہو گیا۔ تاہم اس کی زندگی میں اور کچھ بعد اس کی نقول اور اکثر فارسی میں کر لی گئی تھیں۔ بظاہر ایک خواجہ کلاں کے پاس تھی اور میرزا حیدر دوغلات یقیناً ایک نسخے کا مالک تھا۔ ہمایوں نے اپنے ہاتھ سے ایک نقل کی تھی اور شہرچی حواشی بھی بڑھا دیئے تھے۔ باپ نے خود اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی، حتیٰ کہ دہلی کے خزانے تروانے کے ذکر میں بھی کوئی کی بیشی نہیں کی تھی۔ گلبدن بیگم نے بھی صریحاً باہر ناپے کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا۔ شاہ جہان کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا جس کی بہت عمدہ تہذیب و تزئین کی گئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان ان سوانح کی بڑی قدر کرتے تھے اور دوسرے کتاب میں بھی ترک نہایت محترم تھی۔ نتیجہ یہ کہ یہ مخطوطے بغیر کسی تدوین و تبویب کے اور یقیناً بلا تصرف ہم تک پہنچے۔

ان دور دور پھیلے ہوئے فارسی اور ترکی کے لفظوں میں لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں مگر معنی و مطالب میں فرق نہیں اور جو غلامیاب نے چھوڑ دیئے تھے وہ بھی سلامت ماندہ لفظوں میں قریب قریب اسی طرح چھپے ہوئے ہیں۔ ہم پورا یقین دکھ سکتے ہیں کہ جو ترک بابری ہم آج پڑھ رہے ہیں وہی ہے جسے سناڑھے چار سو برس پہلے اس نے لکھا تھا (بجز چند مشکوک جزئیات کے)۔ ہندوستان کے اس پہلے بادشاہ کی ساری زندگی کے ایام جس طرح چین لئے بغیر گزرے اس کے باعث وہ پوری کتاب کی نظر ثانی کرنے کی فرصت نہ پاسکا اور غالباً تمام اجزا کو اچھی طرح مرتب بھی نہیں کر سکا۔ اس نے کتاب کا کوئی نام بھی تجویز نہیں کیا تھا۔ وہ از خود بابر نامہ کہلانے لگی۔ اس کا آغاز بلا کسی تمہید کے ایک دم (۵۹) ان کلمات سے شروع ہوتا ہے کہ: ”در سنہ ہشت صدو نو دونہ“ ذر ولایت فرغانہ“ سنہ دوازدہ ساگی بادشاہ شدم۔“ اور فوراً ہی وہ بے تکلف اس مملکت کا جغرافیہ، وہاں کے مشاہیر کا حال لکھنے لگتا ہے جن سے اسے سابقہ پڑا اور جن میں خود اس کا باپ شامل ہے۔ بعد میں جب اسے کابل میں کچھ سکون حاصل ہوا تو ادھر ادھر بعض جملے بڑھائے۔ جیسے یہ جملہ کہ ”ہندوستان کو زیر نگین لانے کا میں ہمیشہ سے قصد کرتا تھا۔“ (فارسی ترک میں: ”در تاریخ..... کہ ولایت کابل مسخر شد“ ازاں تاریخ تا حال ہمیشہ ہوس ہندوستان کردہ می شد۔“ مترجم) یہ لاف زنی بھی اس کی فطرت کا ایک پہلو دکھاتی ہے: یعنی جب داؤ پیچ سے یا لڑ جھگڑ کے اتفاقاً کوئی کام بن گیا تو فرط شادمانی میں کہتا ہے کہ میں ہمیشہ سے اسے کرنے کی فکر میں تھا۔ کبھی کبھی کسی بدنامی کی بات کو وہ گول بھی کر جاتا ہے جیسے سمرقند میں خانزادہ بیگم کو شیبانی کے حوالہ کرنے کا واقعہ۔ لیکن آج تک کسی نے جو شاہ کے لقب سے لقب ہوا، اپنی کوتاہیاں، ناکامیاں، فراریاں، نشہ بازیاں اتنی وضاحت اور قوت سے بیان نہیں کیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو بالکل ایک غیر آدمی کی طرح دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔

ترک کے بعض اجزاء جن کے ملنے کی افسوس ہے کوئی امید نہیں پائی جاتی، یقیناً اس نے تحریر کئے تھے۔ کیونکہ ایسی بیاضوں کے بعد آئندہ اوراق کے سلسلہ بیان میں وہ اکثر ان واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو گم شدہ پچھلے صفحات میں درج کئے تھے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایسے واقعات کا ذکر کئے بغیر ہرگز نہ رہ سکتا تھا جیسے اس کے بیٹے کامران اور عسکری کی ولادت۔ یا آخری سال میں ہمایوں کا یکایک آگرے آجانا۔ علیٰ ہذا۔ پھر کے پل پر ازبکوں کو بلا امداد غیرے اس کا اچھی طرح رگڑنا، جس کا میرزا حیدر نے تذکرہ کیا ہے اور یا پہلی مرتبہ

لذت مے کشی سے آشنا ہونا، یقین ہے کہ ان پر اس نے حسب عادت خوب لکھا ہو گا۔ مگر وہ تزک میں محفوظ نہیں رہا۔ ابتدائی عمر میں اپنی بیویوں کے مختصر مگر بڑی باریکی سے نقشے اتارے ہیں۔ لیکن کابل کی بیگمات کا تذکرہ مبہم ہے، حتیٰ کہ دلدار بیگم اور ماہم کے حالات آئے ہیں لیکن ان کے خاندان و نسب یا ذاتی اوصاف و مزاج کا ذکر نہیں جیسا کہ بابر معمولاً تحریر کیا کرتا ہے۔ ۱۵۲۵ء (۹۳۱ھ) خاص ہندوستان پر حملے کے سال سے تزک غیر مربوط اور وقتاً فوقتاً سلسلہ بیان منقطع ہو گیا ہے اس زمانے میں بیماری بار بار اسے تنگ کرنے لگی تھی۔ حسن اتفاق سے گلبدن بیگم نے اہل حرم کے آگرے میں ورود سے اپنی سرگزشت کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ خاندان کے خانوادہ شاہی بن جانے کے بعد اس نے ہمایوں کی تصویر بہتر سے بہتر رنگ میں کھینچی ہے۔

اعتراف اور شکریہ

بابر اپنی ترک میں عموماً ہر نام کے ساتھ پورے القاب و خطاب تحریر کرتا ہے۔ مگر ہم نے اپنی کتاب میں اس سے اقتباسات کرتے وقت انہیں چھوڑ دیا یا مختصر کر دیا ہے۔ جیسے طان علی میرزا کو صرف ”پرنس علی“ لکھا ہے۔ پھر کوئی جشن ہو یا جنگ یا معمولی حادثہ، ان س اپنے رفیقوں کا وہ نام بنام ذکر کرتا ہے اور اس کا غیر معمولی حافظہ بیسیوں نام کی نعمت ار کر دیتا ہے۔ یہ سب اس کے لئے مانوس تھے مگر ہمارے آج کے ناظرین کے لئے نہیں سکتے۔ لہذا میں نے صرف مشہور یا پیش نظر احوال کے لئے ضروری ناموں کو رہنے دیا، حذف کر دیئے ہیں۔ پھر اس کا اچھٹتا ہوا بیان، خصوصاً ترکی میں، کہیں کہیں مطلب کو م بنا دیتا ہے۔ واقعہ ”گھوڑے پر ملک ملک کی منزلیں مارتے ہوئے اس نے کتاب لکھی۔ واقعات ذہن میں تازہ اور مقصد اختصار سے لکھتا تھا۔ پھر قدرتی طور پر بہت سے مات جو اس کے وقت میں معروف تھے ان کا پتہ دیئے بغیر وہ نام لکھ دیتا کافی سمجھتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمیں کچھ تشریحی کلمات اضافہ کرنے ضروری معلوم ہوئے۔

ترکی متن کے اس فاضلانہ ترجمے (بابر نامہ ان انگلش) کا میں نہایت مہربان ہوں جسے ٹ ایس بیورج نے کیا (لندن، ۱۹۲۱ء) اور فارسی سے جسے لیڈن اور ارسکن کے لاجواب جسے ”میمواریز اوف ظہیر الدین بابر۔ لندن ۱۸۲۶ء) کا جس سے میں نے زیادہ تر افادہ کیا نکہ فارسی سے واقف ہوں اور چغتائی ترکی سے واقفیت نہیں رکھتا۔ ان تینوں لائق انی مترجموں نے جغرافی حواشی دیئے ہیں جو ان کے زمانے میں بہت مفید تھے۔ ال منسکی روسی ترجمہ (قازان ۱۸۵۷ء) جس کا کورٹیل نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا (۱۸۷۷ء) لفظی اور حواشی کے ہے۔

دوسرے بیش بہا ہم عصر ماخذ یہ ہیں: گلبدن بیگم کا ”ہمایوں نامہ“ (ترجمہ بیورج، ڈی ی اوف ہمایوں“ لندن، ۱۹۰۲ء) میرزا حیدر کی ”تاریخ رشیدی“ (خلاصہ از ڈینی سن۔ لندن، ۱۸۹۵ء) ”شیبانی نامہ“ محمد صالح (ویمبری، ۱۸۸۵ء) اور خواند میر کی ”حبیب

الیز (فارسی۔ طہران ۱۷۱۷ء) عام ادبی کتب جن سے استفادہ کیا گیا : براؤن کی ”تاریخ ادبیات فارسی۔“ بودے کی ”ل انپار منگول۔“ یار ٹولڈ اور منور سکی کی ”فور اسٹڈیز اون دی ہسٹری آف سینٹرل ایشیا۔“ اولاف کاروکی ”دی پٹھانز“ اور الیشوری پرشاد کی ”دی لائف اینڈ ٹائمز آف ہمایوں ہیں۔“

ڈاکٹر عزیز احمد جو اس وقت ناظم اطلاعات عامہ تھے اور حکومت پاکستان کا میں خاص طور پر زیر بار احسان ہوں کہ مجھے کابل سے لاہور تک باہر کی آمد کے راستوں کی تحقیق کرنے کے زمانے میں اپنا مہمان بنایا اسی طرح بریگیڈیر گلزار احمد کا جنہوں نے خاص خاص قلعوں کی کیفیت بتائی جو باہر کے زمانے میں دریائے سندھ کے کنارے پر موجود تھے۔ جامہ استبول کے پروفیسر ذکی ولدی توپکن نے اس عہد کی کم معروف جواز زمی تہذیب کی نمایاں مفید حقیقت بیان کی۔

۱۹۶۰ء کی گریون میں سویت روس کی اکادمی کے ادارہ مشرقیہ کے ارکان نے ازبکوا کے دوسری قوموں سے تعلقات کے بارے میں 'شیبانی کی سیرت و خصائل کی وضاحت میں اور تیموری عہدے شہر سمرقند کا خاکہ کھینچنے میں مدد دی۔ تاشقند کے درس گاہ کی نانہ ڈاکا اعظم جانو نے کمال عنایت سے بابر کی عائلی زندگی کے متعلق اپنے مطالعے سے مستفید فر اور کتاب "بین" کے اقصادی حصے کے بارے میں بھی میں نے انہی کی تحقیقات سے کتاب میں کام لیا۔

[illegible]

1. 1945-1946: "The first year of the war" (1945-1946)
 2. 1946-1947: "The second year of the war" (1946-1947)
 3. 1947-1948: "The third year of the war" (1947-1948)
 4. 1948-1949: "The fourth year of the war" (1948-1949)
 5. 1949-1950: "The fifth year of the war" (1949-1950)

۱۔ ”شش محرم“

۲۔ ”چنگیز خاں“

۳۔ ”ذی ارشد“

۴۔ ”حوالہ جات“

۵۔ ”شش محرم“

۶۔ ”شش محرم“ بہ حساب جبل ہجری سال ولادت ۸۸۸ اور روز ولادت بھی ہے۔ (مترجم)

۷۔ مصنف نے اپنی دوسری کتابوں: ”چنگیز خاں“ اور ”ذی ارشد“ میں مغول کے

ظہور کی کیفیت لکھی ہے۔

۸۔ متن میں یہ نام ”ابوسید“ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ (مترجم)

۹۔ یہ مصنف کی ناواقفیت کی بات ہے۔ قرآن مجید سے تفاعل کر سکتے ہیں لیکن وہ یا

بہ نامہ پیش گوئیوں کی کتاب نہیں ہے۔ (مترجم)

۱۰۔ جو شخص کلام حافظ سے بہرہ اندوز ہو اس کا صاف نام ادا نہ کر سکتا بالکل خلاف

اس بات ہے۔ (مترجم)

۱۱۔ اس کا املا اسن (دولت بیگم) بھی کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

۱۲۔ مغلوں میں رسم تھی کہ نئی دہلی کا گھونگٹ کوئی بچہ اٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ شاید

مصنف نے ٹھیک بات نہیں سمجھی۔ (مترجم)

۱۳۔ اصل ترکی تلفظ آخشی۔ (مترجم)

۱۴۔ فارسی ترک میں: ”وہ کجا و درختان کجا“ (مترجم)

۱۵۔ فارسی میں: ”خرپڑ میر تیموری“ (مترجم)

۱۶۔ مراد شیخ عبید اللہ احرار قدس سرہ سے ہے۔ (مترجم)

۱۷۔ اصل نام قبر علی (مترجم)

۱۸۔ بہ تصحیح مترجم۔

۱۹۔ بہ تصحیح مترجم۔

۲۰۔ بہ تصحیح مترجم۔

۲۱۔ فارسی ترک میں معاجین یا منشیات لکھا ہے۔ (مترجم)

- ۷۷۔ اصل لفظ ”رتق“۔ مترجم۔
- ۷۸۔ یہ صحیح مترجم۔
- ۷۹۔ مصنف نے یہاں نافی سے ”حرام گوشت“ تحریر کئے ہیں۔ مترجم۔
- ۸۰۔ صحیح پورا نام: ویس لاغری۔ مترجم۔
- ۸۱۔ فارسی ترک میں ”خواجہ کلاں“ بڑا بھائی، ملا صدر۔ مترجم۔
- ۸۲۔ فارسی ترک میں: اذہر لعل ابراہیم القواعد۔ مترجم۔
- ۸۳۔ یہ صحیح مترجم۔
- ۸۴۔ مطلب ہے: ویس بیک لاغری۔ مترجم۔
- ۸۵۔ فارسی ترک میں ہے کہ اسے جانے کی آخر اجازت دی۔ مترجم۔
- ۸۶۔ اصل فارسی شعر: شوم شرمندہ ہر گہ یار خود را در نظر بینم۔ رفیقان سوئے م بیند ومن سوئے دگر بینم۔ مترجم۔
- ۸۷۔ مصنف نے اسے بابر کے طبع زاد چولوہ تحریر کیا ہے۔ میں نے ترک فارسی صحیح مناسب سمجھا۔ مترجم۔
- ۸۸۔ کوہ ”سرہ تاق“ مترجم۔
- ۸۹۔ یہ صحیح مترجم۔
- ۹۰۔ فارسی ترک میں یہ الفاظ نہیں ہیں اگرچہ مراد لئے جاسکتے ہیں۔ مترجم۔
- ۹۱۔ یہ وہی درویش ہیں جو مرغیاں کی دعوت ملنے سے پہلے بابر کو ملے تھے۔ مصنف نے وہاں نام نہیں دیا اور یہاں غلطی سے عبدالکام لکھا ہے۔ ہم نے صحت کر دی۔ مترجم۔
- ۹۲۔ مراد: سلطان حسین میرزا۔ مترجم۔
- ۹۳۔ مصنف نے اس کا ترجمہ TEN TOPS لکھ دیا ہے اصل ترک سے صحیح: یہاں لکھا گیا۔ مترجم۔
- ۹۴۔ ترک فارسی میں ”تاجیک“ لکھا ہے۔ مترجم۔
- ۹۵۔ یہ صحیح مترجم۔
- ۹۶۔ ترک میں نام مومن، لیکن مصنف کا قول کہ وہ مفعول بلا سند اور غلط ہے یا: کلکاش کے غم میں کئی دن روتا رہا۔ مترجم۔

- ۳۷۔ انگریزی متن میں ALASHA لکھا ہے۔ اصل ترک میں الچہ (الاجی بہ معنی قال) ہے اور یہ عرف ہے۔ اصل نام احمد خاں تھا۔ مترجم۔
- ۳۸۔ مصنف نے اس کا نام بھی صرف انگریزی ترجمہ لکھ دینا پسند کیا تھا۔ یہاں اصل نام ترک سے نقل کیا گیا ہے۔ مترجم۔
- ۳۹۔ ایضاً” مترجم۔
- ۴۰۔ مصنف نے ”گل خانہ“ لکھا ہے۔ مترجم۔
- ۴۱۔ مصنف نے اوپر کا شعر بابر کے کسی ندیم سے منسوب کیا اور یہ مصرع (شعر لکھ کر) بابر کا بتایا ہے اور یہ دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ مترجم۔
- ۴۲۔ فارسی ترک میں یہ قصہ مسجد کی بجائے ایک مزار سے منسوب ہے۔ مترجم۔
- ۴۳۔ فارسی ترک کی رو سے یہ واقعہ دریائے سندھ کے پار پیش آیا۔ مترجم۔
- ۴۴۔ انگریزی میں : HAPPY PRINCESS فارسی ترک میں فیروزہ بیگم نام لکھا ہے۔ مترجم۔
- ۴۵۔ ترک میں بابر نے لکھا ہے کہ شرم کی وجہ سے مجھے اجازت نہ دی۔ مترجم۔
- ۴۶۔ مصنف نے مولانا رومیؒ کے ان مشہور افکار کو (قصہ شبان و موسیٰؑ جہاد کا ارتقا) اپنی سمجھ کے موافق بیان کیا ہے۔ ہم نے خفیف تبدیلی کے ساتھ بخسنہ ترجمہ کر دیا۔ مترجم۔
- ۴۷۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بابر کا شیبانی کو ان پڑھ کہنا غلط ہے۔ لیکن فارسی ترک میں لکھا ہے کہ ”وہ ان پڑھ نہ تھا“ علمائے ہرات کو بھی صرف جھڑکنا لکھا ہے تفسیر کا ذکر نہیں نظر آیا۔ مترجم۔
- ۴۸۔ مصنف نے دو ارغون بھائی اور تیسرا مقیم لکھا ہے حالانکہ مقیم ہی (شاہ بیگ) ارغون کا بھائی تھا ہم نے صحت کر دی۔ مترجم۔
- ۴۹۔ اس فصل میں فاضل مصنف نے روحانیات اور مسلمانوں کے تصوف کی نسبت اپنے افکار عالیہ پیش کئے ہیں بابر کے تذکرے یا تاریخ سے ان کا کچھ تعلق نہیں نظر آتا اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو محض دخل در معقولات معلوم ہوں گے۔ مگر ہم نے حقیقت تصرف در ضروری تصحیح کے ساتھ بخسنہ ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مترجم۔
- ۵۰۔ مصنف نے جتنے شاعروں کا اوپر نام لیا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا۔ مترجم۔

- ۵۱۔ مصنف کا مطلب ”وحدت الوجود“ سے ہے۔ لیکن واقعیت کی کمی کے اس کا یہ سارا بیان نا درست خیال کیا جائے گا۔ شیعہ عقائد میں یہ اعتقاد شامل نہیں ہے اور انہ سینوں کو اس سے مطلق انکار ہے۔ (مترجم)
- ۵۲۔ مصنف نے یہاں ”ACROBAT“ لکھا ہے۔ لیکن نئے قدیم ہندی زبانوں میں رقص کو کہتے ہیں۔ اسی طرح متن میں ”خشیش“ لکھا ہے۔ جس کا ہم نے انعام ترجمہ کیا ہے۔ مترجم۔
- ۵۳۔ فارسی ترک نے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ مترجم۔
- ۵۴۔ یہ نام مشکوک ہے۔ فارسی ترک میں ”ہل ہل یکتہ“ لکھا ہے۔ مترجم۔
- ۵۵۔ ترک فارسی میں ”جنگ جنگ“ مترجم۔
- ۵۶۔ ترک فارسی میں بہار لکھا ہے اور ”بارہ“ کوئی معروف نام نہیں ہے۔ مترجم۔
- ۵۷۔ مصنف نے اسے ”VICTORY“ لکھا ہے۔ ترک میں غازی نام آتا ہے۔ مترجم۔
- ۵۸۔ مصنف نے اردو کے متعلق وہی عام اور فرسودہ نظریہ دہرایا ہے مگر یہ پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ مترجم۔
- ۵۹۔ شہزاد میں مختصر حمد و نعت، اپنا نام اور ولادت تحریر کرادی ہے۔ یا کم جسے کہ فارسی ترک میں درج ہے۔ مترجم۔